طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

نام کتاب :- ---------------- خدا اور سرمایہ دار

شائع کردہ :- ---------------- طلوع اسلام ٹرسٹ

:- ---------------- 25-B، گلبرگ 2، لاہور- 54660

طابع :- ---------------- خالد منصور نسیم

مطبع :- ---------------- النور پرنٹرز و پبلشرز

:- ---------------- 3/2 فیصل نگر- ملتان روڈ، لاہور- 54500

ایڈیشن :- ---------------- دوم 1996ء (بلا ترمیم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

خدا اور سرمایہ دار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

یوں تو معاشی مسئلہ تاریخ انسانیت کے جزو لازم کی حیثیت سے ساتھ کے ساتھ چلا آرہا ہے لیکن ہمارے زمانے میں اس نے ایسی اہمیت اختیار کر لی ہے کہ اسے کہتے ہی عصر معیشت ہیں۔ اس وقت دنیا جن دو بلاکوں میں بٹ رہی ہے ان کی بنیاد بھی معاشی نظام کا اختلاف ہی ہے۔ یہ تصادم ہے نظام سرمایہ داری اور کمیونزم کے اشتراکی نظام کا۔ نظام سرمایہ داری کے متعلق اقبال نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ

گیا دور سرمایہ داری گیا تماشا دکھا کر مداری گیا

لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ یہ جاتے جاتے بھی ہزار تباہیاں ڈھا جائے گا۔ چنانچہ اس وقت اس کی حرکتِ مذبوحی جو خون کے چھینٹے اڑا رہی ہے اس سے زمین لالہ زار ہو رہی ہے۔ اس کے مدمقابل اشتراکی نظام ہے جس کی ابتدا روس سے ہوئی اور وہاں سے آگے بڑھ کر وہ چین میں پہنچا۔ لیکن اس وقت اس نظام کے فلسفہ کے متعلق خود روس اور چین میں جس قدر اختلافات رونما ہو چکے ہیں وہ اپنی شدت میں اس سے کم نہیں جو نظام سرمایہ داری اور اشتراکی نظام میں وجہ نزاع بنا تھا اور جس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے تمام بنیادی مسائل کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس کے اس دعوے کے پیش نظر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اسلام انسانی زندگی کے اس اہم ترین مسئلہ کا حل کیا پیش کرتا ہے؟ اسلامی شریعت کے علمبردار — یعنی ہماری مذہبی پیشوائیت — جس معاشی نظام کو اسلامی کہہ کر پیش کرتے ہیں، وہ اس قسم کا سرمایہ دارانہ نظام ہے جسے خود نظام سرمایہ داری کے حامل تو کبھی بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں اور جو اب زمانے کے تقاضوں سے حالتِ نزع میں ہے۔ اگر اسلام نے اس مسئلہ کا

یہی حل پیش کیا تھا تو اس کا نوع انسان کی نجات کا ضامن ہونے کا دعویٰ محل نظر قرار پا جاتا ہے۔

اور اگر نظام سرمایہ داری کے برعکس، اشتراکی نظام اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے تو پھر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس نظام کے متعلق اسلام کا ردعمل کیا ہے؟

اور اگر اسلام ان دونوں سے الگ کوئی اور نظام پیش کرتا ہے تو اس نظام کی تفصیل کیا ہے اور اس کے اطمینان بخش ہونے کی ضمانت کیا؟

طلوع اسلام اس دعوے کا حامی ہے کہ قرآن کریم نوع انسان کے تمام بنیادی مسائل کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے اس بنا پر اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ معاشی نظام جیسے اہم ترین مسئلہ کو اپنی خصوصی توجہ کا مرکز بناتا۔ چنانچہ اس نے گذشتہ بیس سال میں اس موضوع پر ہزارہا صفحات شائع کئے ہیں۔ ان میں نظام سرمایہ داری کی اصل و بنیاد اور اشتراکی نظام کے فلسفہ اور معاشی نظم و نسق کا تجزیہ کر کے ان کا تقابلی مطالعہ کیا اور اس کے بعد شرح و بسط سے بتایا کہ قرآن کریم کونسا فلسفہ زندگی اور اس پر متفرع کس قسم کا معاشی نظام پیش کرتا ہے اور ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے جو کچھ اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا ہے اس کی اصل و حقیقت کیا ہے؟

ان مقالات کی اہمیت کے پیش نظر ہمیں مسلسل تقاضے موصول ہو رہے تھے کہ انہیں مرتب کر کے اس طرح یکجا شائع کیا جائے کہ اس مسئلہ کے تمام پہلو سامنے آجائیں۔ چنانچہ یہ مجموعہ (ضروری نظر ثانی کے بعد) پیش خدمت ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ اس اہم مسئلہ کے سمجھنے اور اس گتھی کے سلجھانے میں مدد و معاون ثابت ہوگا۔

(۲) اس سے پہلے، اس موضوع پر پرویز صاحب کی ایک خود مکتفی تصنیف، نظام ربوبیت کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ جو احباب قرآنی نقطۂ نگاہ کو زیادہ وضاحت سے سمجھنا چاہیں، اس کتاب کا مطالعہ ان کے لئے مفید رہے گا۔

(۳) اس کتاب کے اعلیٰ ایڈیشن کے ساتھ، عام اشاعت کی غرض سے چیپ ایڈیشن بھی شائع کیا جا رہا ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

۲۵/بی — گلبرگ ۲ — لاہور

اکتوبر ۱۹۶۷ء

اسلام کے معاشی نظام کا خاکہ

(پرویز صاحب کی ایک تقریر)

انسانی بچہ جب دنیا کی فضا میں پہلا سانس لیتا ہے تو بھوک سے چلاتا ہے۔ اور اپنے رزق کے سرچشموں کی طرف لپک کر جاتا ہے۔ اور جب انسان اس دنیا میں آخری سانس لیتا ہے تو بھی اس کے حلق میں کچھ ٹپکایا جاتا ہے تاکہ اسے کچھ نہ کچھ توانائی مل سکے۔ جب وہ دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو کہنے والے یہی کہتے ہیں کہ اس کے حصے کا رزق ختم ہو گیا تھا۔ لہذا رزق کا معاملہ ایسا ہے جس سے انسان اپنی زندگی کے کسی سانس میں بھی بے تعلق نہیں رہ سکتا۔ انسانی زیست کے لئے اس سے زیادہ اہم مسئلہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جس شخص کو آرام سے بافراط کھانے پینے کو مل جاتا ہے اس کی زندگی کو بڑی کامیاب زندگی تصور کیا جاتا ہے۔ اور وہ خود بھی ایک ایک سانس میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے اسے روٹی کے لئے کسی کا محتاج نہیں ہونے دیا۔

انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر انسان کی اجتماعی زندگی پر غور کیجئے تو اس میں بھی یہی نظر آئے گا کہ قوموں کی تگ و تاز اور جدوجہد کے لئے سب سے زیادہ جذبۂ محرکہ رزق کا سوال ہوتا ہے۔ رزق کی یہی اہمیت تھی جس کے پیش نظر مارکس اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ تاریخ انسانیت کی تعبیر ہی معاشی نقطۂ نگاہ سے

معاشیات کی اہمیت

کی جا سکتی ہے۔ جہاں تک سابقہ اقوام کی تاریخ کا تعلق ہے مارکس کا نظریہ صحیح ہو یا غلط (اس کے متعلق تفصیلی گفتگو ذرا آگے چل کر کی جائے گی) لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے دور میں اس مسئلہ نے ایسی اہمیت اختیار کر رکھی ہے کہ آنے والا مورخ جب اس پر نگاہ ڈالے گا تو وہ اسے عصر معاشیات (AGE OF ECONOMICS) کے سوا کسی اور کے نام سے نہیں پکار سکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج تہذیب، تمدن، معاشرت، سیاست، قومی مسائل اور بین الاقوامی معاملات سب کی باگ ڈور معاشیات کے ہاتھ میں ہے۔ اس وقت دنیا عملاً جن دو بلاکس (BLOCKS) میں بٹی ہوئی ہے، ان میں کہنے کو تو خط امتیاز نظام حکومت ہے ــــ یعنی ڈکٹیٹرشپ اور جمہوریت ــــ لیکن درحقیقت ان میں بنیادی اختلاف نظام معیشت (ECONOMIC ORDERS) ہی کا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ افراد ہوں یا اقوام، روٹی کے مسئلہ نے دونوں کی ناک میں نکیل ڈالی ہوئی ہے اور وہ انہیں جدھر جی چاہے کشاں کشاں لئے پھر رہا ہے۔

انسان نے اس اہم مسئلہ کے حل کے لئے جب مذہب کے دروازے پر دستک دی ــــ مذہب سے میری مراد ہے انسانوں کا خود ساختہ مذہب ــــ تو اس نے یہ کہہ کر اپنا پیچھا چھڑا لیا کہ ہمارا مقصد انسان

مذہب اور روٹی

کو مرنے کے بعد کی زندگی میں عذاب سے نجات دلانا ہے۔ اس دنیا کے مسائل سے ہمارا کوئی سروکار نہیں۔ یہ مادی دنیا، کثافت اور غلاظت سے بھری ہوئی ہے۔ اس لئے خدا کے نیک بندوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسے قابل نفرت سمجھیں اور جہاں تک ہو سکے اس سے دور بھاگیں لیکن یہ محض فریب نفس تھا یا فرار کی راہ۔ اس لئے کہ انسان دنیا سے کتنی ہی دور کیوں نہ بھاگے اور کس طرح کتنا ہی بڑا ایشور کا بھگت کیوں نہ بن جائے، جب تک وہ زندہ ہے کھانے پینے کا محتاج ہے۔ وہ شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں بسیرا کر سکتا ہے لیکن خوراک کے مسئلہ سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ وہ خواہ چوبیس گھنٹے میں ایک مرتبہ ہی کیوں نہ کھائے۔ کھائے بغیر گذارہ ہو نہیں سکتا۔ بھوک رشیوں منیوں کو بھی لگتی ہے اور پیروں فقیروں کو بھی۔ کھائے بغیر نہ "ایشور کے اوتار" زندہ رہ سکتے ہیں نہ اللہ کے مقرب۔ اس لئے (انسانوں کے خود ساختہ) "مذہب" کا یہ کہنا کہ اسے روٹی کے مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں، حقیقت کو جھٹلانا اور لوگوں کو فریب دینا ہے۔ ایسے مذہب کے علمبرداروں کو روٹی کے مسئلہ سے اس لئے دلچسپی نہیں ہوتی کہ ان کی روٹی کا انتظام دوسرے لوگ کرتے ہیں۔

اسلام مذہب نہیں بلکہ الدّین ہے جس کے معنی ہیں نظام زندگی یا ضابطۂ حیات۔ ظاہر ہے کہ جس نظام کا دعویٰ ہو کہ وہ انسان کی ساری زندگی کو اپنی آغوش میں لیتا ہے۔ اور جو ضابطۂ حیات انسانی زندگی کے ہر گوشے کے لئے راہ نمائی دینے کا مدعی ہو، وہ انسان کے معاشی مسئلہ سے کس طرح چشم پوشی کر سکتا ہے۔ وہ روٹی کے سوال سے کس طرح آنکھیں بند کر سکتا ہے؟ چنانچہ قرآن نے اس مسئلہ کو پوری پوری اہمیت دی ہے اور اس کا ایسا حل بتایا ہے جو ان پریشانیوں کو نہایت آسانی سے دور کر دیتا ہے۔ جو انسان کو جہنم کی آگ کے شعلوں کی طرح چاروں طرف سے گھیرے رہتی ہیں۔

قرآن اور روٹی کا مسئلہ

قرآن کریم نے معاشی مسئلہ کو کس قدر اہمیت دی ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے کہا ہے کہ جس قوم کو رزق کی فراوانی حاصل ہو، یہ سمجھو کہ اس پر خدا کا انعام ہے اور جو بھوک کے عذاب میں مبتلا ہو، اس پر خدا کا غضب ہے۔ سورۂ نحل میں ہے۔ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا (16/112) خدا تمہیں مثال دے کر ایک بات سمجھاتا ہے (مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ۔ ایک بستی تھی جو نہایت امن و اطمینان کی حالت میں تھی۔ اس کے کھانے پینے کا سامان (رزق) ہر جگہ سے بافراغت اس کے پاس چلا آتا تھا۔ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ۔ اس نے اللہ کی ان نعمتوں کی ناشکرگذاری کی۔ تو ان کے اس جرم کی پاداش میں فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ○ (16/112) اللہ نے اسے بھوک اور خوف کے عذاب کا مزہ چکھایا۔ یہ سب ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھا۔

آپ نے مذہبی حلقوں میں اس قسم کے فقرے سنے ہوں گے کہ انسان کو ہمیشہ احکام خداوندی کی اطاعت کرنی چاہیے جو شخص خدا کی نافرمانی کرے اس پر اس کا عذاب نازل ہوتا ہے۔ لیکن اگر ان سے پوچھئے کہ وہ عذاب کیا ہوتا ہے تو وہ کہہ دیں گے کہ اس قسم کے انسان کو مرنے کے بعد جہنم میں بھیجدیا جاتا ہے اور وہ وہاں خدا کے عذاب کا مزا چکھتا ہے۔ مرنے کے بعد جہنم اور جنت سے کسی مسلمان کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن قرآن کریم قانونِ خداوندی سے اعراض برتنے (روگردانی کرنے) کا جو عذاب بتاتا ہے وہ اسی دنیا میں سامنے آجاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (20/124) ۔ (یاد رکھو) جو کوئی میرے قانون سے روگردانی

معیشت کی تنگی

کرے گا تو اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔" اس سے ظاہر ہے کہ قوانین خداوندی سے اعراض اور روگردانی کا نتیجہ رزق کی تنگی (یعنی بھوک کا عذاب) ہے۔

آپ نے بعض لوگوں کو کہتے سنا ہوگا کہ خدا اپنے بندوں کو عذاب میں ڈالتا ہے اور انہیں طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ انہیں کھانے کو روٹی نہیں ملتی۔ پہننے کو کپڑا نہیں ملتا۔ مفلسی، تنگ دستی، بے کسی، بے چارگی انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے۔ وہ اس دنیا میں بڑی عسرت اور افلاس کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن ان کی عاقبت اتنی ہی زیادہ تابناک اور خوشگوار ہوتی ہے۔ لیکن قرآن کریم اس کے خلاف کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ قوموں کی زندگی میں ایسے حوادث رونما ہوتے ہیں جن میں انہیں سخت مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے (مثلاً جنگ کے زمانے کی تکالیف اور مصیبتوں سے کون واقف نہیں جن میں بڑی بڑی خوش حال اور دولتمند قومیں بھی مبتلا ہو جاتی ہیں؟) لیکن یہ صرف ہنگامی حادثات ہوتے ہیں جو آتے ہیں اور گذر جاتے ہیں۔ لیکن عسرت اور زبوں حالی

دنیا اور آخرت میں عذاب

کسی فرد یا قوم کی زندگی کا معمول ہو جائے تو انہیں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے کہ یہ خدا کے مقبول بندوں کی علامتیں ہیں۔ یہ چند روزہ (دنیاوی زندگی) کے مصائب ہیں۔ اس کے بعد (آخرت کی زندگی میں) تمام خوشگواریاں اور سرفرازیاں انہی کے حصے میں آئیں گی۔ اس لئے کہ قرآن نے جہاں کہا ہے کہ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا۔ (جو ہمارے قانون سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی) تو اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا ہے کہ وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۲۴)۔" اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے۔" اس سے ظاہر ہے کہ قوانین خداوندی سے اعراض کا لازمی نتیجہ اس دنیا میں رزق کی تنگی اور آخرت میں ذلت و رسوائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی رو سے زندگی ایک جوئے رواں ہے جو

عاقبت کا اندھا

اس دنیا سے اُس دنیا تک مسلسل چلی جاتی ہے اس لئے جن اعمال کے نتائج اس زندگی میں رسوا کن اور ذلت انگیز ہوں، عاقبت میں ان کے نتائج عزت بخش اور مسرت آمیز نہیں ہو سکتے اس باب میں قرآن کا واضح فیصلہ ہے کہ

مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِيْلًا (۱۷/۷۲)

جو اس دنیا میں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔

اقبالؒ کے الفاظ ہیں۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا | جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا | جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

لہٰذا یہ دیکھنے کے لئے کہ کسی قوم کی عاقبت کی زندگی کیسی ہو گی، یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس کی اس دنیا کی زندگی کیسی ہے۔ اگر اسے سامانِ زیست کی فراوانی نصیب نہیں۔ اگر وہ رزق کی تنگی کے عذاب میں ماخوذ ہے۔ اگر وہ اپنی روٹی کے لئے بھی دوسروں کے دروازے پر جھولی پھیلانے کے لئے مجبور ہے تو اس قوم کو عاقبت کی سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب نہیں ہو سکتیں۔ یاد رکھئے! قرآن کی رُو سے جنت اور جہنم کی زندگی یہیں سے شروع ہو جاتی ہے اور آخرت تک مسلسل چلی جاتی ہے۔ قرآن نے انسان کی سرگزشت کو "قصۂ آدم" کے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے وہ اس میں بتاتا ہے کہ جب آدم جنت میں تھا تو اس سے کہہ دیا گیا تھا کہ اِنَّ لَكَ

جنت کی زندگی

اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى ۝ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (۲۰/۱۱۸-۱۱۹)۔ "تجھے یہاں یہ میسر ہے کہ تو اس میں نہ بھوکا رہے نہ ننگا۔ نہ پیاسا رہے اور نہ ہی دھوپ میں"۔ یعنی اس جنت کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی (روٹی۔ پانی۔ لباس۔ مکان) سے محروم نہیں تھا۔ وہیں آدم اور اس کی بیوی سے کہہ دیا گیا تھا کہ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵)۔ تم اس میں سے جہاں سے جی چاہے بافراغت کھاؤ پیو، یعنی اس میں ہر ایک کے لئے ہر جگہ بافراط سامانِ رزق موجود تھا۔ یہ تھی وہ جنت ارضی جو انسان کی مفاد پرستیوں کی وجہ سے اس سے چھن گئی اور جسے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے اسے خدا کی طرف سے راہ نمائی ملی اور اس سے کہدیا گیا کہ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى ۚ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَاىَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۝ (۲۰/۱۲۳) سو جب تمہارے پاس میری طرف سے راہ نمائی آئے۔ سو جو میری راہ نمائی کا اتباع کرے گا، تو نہ اس کی کوششیں رائگاں جائیں گی اور نہ ہی وہ (سامانِ زندگی سے) محروم رہے گا۔ (اور نہ ہی اسے ان کے حصول کیلئے جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی)۔

فرزندانِ آدم کے لئے اس زمین پر اسی جنت کی دوبارہ تشکیل قرآن کا مقصود و منتہیٰ ہے۔ اسے قرآنی نظامِ ربوبیت یا (QURANIC SOCIAL ORDER) کہتے ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم یہ دیکھیں کہ قرآنی نظامِ ربوبیت قائم کس طرح ہوتا ہے اور اس میں انسان کو کیا کچھ حاصل ہوتا ہے،

قرآن کا مقصود

یہ دیکھنا ضروری ہے کہ قرآن کی رُو سے روٹی کے مسئلہ کا حل مقصود بالذات ہے یا یہ کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے؟ یہ سوال بہت اہم ہے اس لئے کہ اسی بنیاد پر انسانی ہیئت اجتماعیہ کی پوری کی پوری عمارت استوار ہوتی ہے اس کا اچھی طرح سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

زندگی کا ایک نظریہ یہ ہے کہ انسانی بچہ پیدا ہوتا ہے کھا پی کر بڑا ہوتا ہے۔ کام کاج کرتا ہے۔ تاکہ کھانے پینے کا سامان حاصل کر سکے۔ شادی کرتا ہے۔ صاحبِ اولاد ہوتا ہے۔ اولاد کو کمانے کے قابل

حیوانی سطح کی زندگی

بنا دیتا ہے اور مرجاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر زندگی کا مقصد اتنا ہی ہے تو پھر ایک حیوان اور انسان میں کچھ فرق نہیں۔ یہ کچھ ہر حیوان کرتا ہے۔ پیدا ہوتا ہے۔ کھاتا پیتا ہے۔ کام کاج کرتا ہے۔ اپنی نسل بڑھاتا ہے اور مرجاتا ہے۔ قرآن اس زندگی کو کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یَتَمَتَّعُوۡنَ وَ یَاۡکُلُوۡنَ کَمَا تَاۡکُلُ الۡاَنۡعَامُ وَ النَّارُ مَثۡوًی لَّہُمۡ۔ (47/12)۔ "اور جو لوگ کفر کرتے ہیں وہ (متاعِ زندگی سے) فائدہ اٹھاتے ہیں اور حیوانات کی طرح کھا پی کر مرجاتے ہیں) ان کا ٹھکانہ آگ ہے۔" اس کے برعکس، دوسرا تصورِ حیات یہ ہے کہ انسان صرف اس کے طبیعی جسم کا نام نہیں۔ انسان میں جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے اس کی ذات (HUMAN PERSONALITY) کہتے ہیں۔ انسان کی زندگی کا مقصد اس کی ذات کی نشوونما ہے جس سے ایک فرد اس دنیا میں بھی سرفرازی و سربلندی کی زندگی بسر کرتا ہے اور اس کے بعد کی زندگی میں ارتقائے ذات کے مزید مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جو تمام نوعِ انسانی کو بھوک، خوف اور ظلم سے محفوظ رکھنے کی ضمانت دے سکے۔

انسانی سطح کی زندگی

اس کا نام انسانی سطح کی زندگی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر افراد روٹی کی فکر سے آزاد نہ ہوں تو وہ انسانی سطح کی زندگی تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔ اس لئے وہ کہتا ہے کہ ایسا معاشرہ قائم ہونا چاہیئے جو افراد کو روٹی کی فکر سے آزاد کر دے تاکہ ان کی توانائیاں اور صلاحیتیں، حیوانی سطح سے بلند ہو کر، زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے فارغ ہو جائیں۔ قرآنی نظامِ ربوبیت افراد کو روٹی کی فکر سے آزاد کر کے انہیں انسانیت کی سطح پر لے آتا ہے۔ اسلامی معاشرہ اس خدا کی ذمہ داریاں اپنے سر پر لیتا ہوا، جس کے قوانین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے وہ وجود میں

رزق کی ذمہ داری

آتاہے تمام افرادِ معاشرہ سے، پورے حتم و یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)

ہم تمہارے اور تمہاری اولاد کے رزق کی ذمہ داری لیتے ہیں۔

یہ ذمہ داری صرف انسانوں تک ہی محدود نہیں ہوتی۔ بلکہ اس مملکت کی حدود میں بسنے والے تمام ذی حیات کو محیط ہوتی ہے اس لئے کہ جس خدا کے نام پر یہ مملکت قائم ہوتی ہے اس کا اعلان ہے کہ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶)۔ "روئے زمین پر بسنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو"۔ اللہ کی یہ ذمہ داری اسلامی مملکت کے ہاتھوں کس طرح پوری ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے اس اعلان سے فرمایئے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ

اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مرگیا تو خدا کی قسم عمر سے اس کی باز پرس ہوگی۔

اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افرادِ مملکت (بلکہ اس حدود میں بسنے والے تمام جانوروں تک) کے رزق کی ذمہ داری اپنے سر پر لے۔ جو مملکت اس ذمہ داری کو اپنے سر نہیں لیتی وہ اسلامی مملکت نہیں کہلا سکتی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مملکت ایسی عظیم ذمہ داری کو پورا کس طرح کر سکتی ہے؟ قرآن اس کا بھی جواب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس مملکت نے خدا کی ذمہ داری کو پورا کرنے کا فریضہ اپنے سر

رزق کے سرچشمے مملکت کی تحویل میں

لیا ہے۔ رزق کے سرچشمے اور وسائلِ پیداوار جو خدا کی ملک ہیں، اس مملکت کی تحویل میں چلے جائیں گے تاکہ وہ ان کا ایسا انتظام کرے جس سے تمام افراد کی پرورش ہوتی چلی جائے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنی نظامِ ربوبیت میں، رزق کے سرچشموں پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا — نہ افراد کی اور نہ مملکت کی — مملکت بھی صرف ان کا انتظام کرتی ہے۔ رزق کے سرچشموں میں بنیادی حیثیت ارض (زمین) کو حاصل ہے جس سے نہ صرف اناج پیدا ہوتا ہے بلکہ تمام مصنوعات کے لئے خام مسالہ بھی وہیں سے برآمد ہوتا ہے۔ ارض کے لئے قرآن نے کہہ دیا ہے کہ اسے خدا نے مخلوق کی پرورش کے لئے

پیدا کیا ہے وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (۵۵: ۱۰)۔ اس لئے اس کا انتظام ایسا ہونا چاہیئے کہ اس کا پیدا کردہ رزق تمام ضرورتمندوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلا رہے۔ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (۴۱: ۱۰)۔ اس لئے کہ یہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ (۵۶: ۷۳) ہے۔ یعنی بھوکوں کے لئے سامانِ زندگی۔ اسے اسی مصرف میں لانا چاہیئے۔ اگر یہ افراد کی ملکیت میں چلی جائے تو اس سے یہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس لئے اسے معاشرہ کی اجتماعی تحویل میں رہنا چاہیئے تاکہ جس مقصد کے لئے اسے پیدا کیا گیا ہے وہ مقصد پورا ہوتا رہے۔
اس حقیقت کو قرآن نے سورۃ الواقعہ میں بڑے دلنشین پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ کیا تم نے اس پر کبھی غور کیا جسے تم بوتے ہو؟ تم اتنا ہی کرتے ہو کہ زمین میں ہل چلاتے ہو۔ اسے کاشت کے قابل بناتے ہو۔ پھر اس میں بیج ڈال دیتے ہو۔ اس کے بعد سوچو کہ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝ کیا اس بیج میں سے پودا تم پیدا کرتے ہو یا ہمارا قانون پیدا کرتا ہے؟ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ۝ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝ اگر ہمارا قانون اس کے خلاف چاہتا تو ہم اس کھیتی کو خشک سالی سے چورا چورا کر دیتے اور تم حیرت میں گم ہو جاتے کہ یہ کیا ہو گیا! ہم پر مفت میں چٹی پڑ گئی۔ فصل تو ایک طرف، ہم بیج سے بھی محروم ہو گئے۔

پھر آگے بڑھو اَفَرَءَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ۝ کیا تم نے اس پانی پر کبھی غور کیا جو تمہارے لئے زندگی کا سامان اور تمہاری کھیتی کے اگنے کا ذریعہ بنتا ہے؟ ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۝ کیا اسے بادل سے تم برساتے ہو یا ہم برساتے ہیں؟ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ۝ اگر ہمارا قانون دوسری طرح چاہتا تو ہم اسے (ایسا) کھاری بنا دیتے جسے نہ تم پی سکتے نہ اس سے تمہاری کھیتیاں اگ سکتیں۔ سو تم اس کے قدر دان کیوں نہیں ہوتے؟

اور آگے بڑھو اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ ۝ کیا تم نے اس آگ پر کبھی غور کیا جسے تم جلاتے ہو۔ ءَ اَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ ۝ کیا اس درخت کو جس سے آگ کا سامان ملتا ہے تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں؟)۔
ذرا سوچو کہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس میں تمہارے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں

پوشیدہ ہیں نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً اس سے سبق حاصل کرو۔ یہ سبق کہ یہ سب کچھ تمہارا پیدا کردہ نہیں۔ ہمارا پیدا کردہ ہے۔ تم اس میں صرف محنت کرتے ہو۔ اس لئے اس کھیتی میں تمہارا حصہ تمہاری محنت کے بقدر ہے۔ باقی سب کچھ ہمارا ہے۔ اسے ہم نے مَتَاعًا لِّلْمُقْوِينَ ۝ (۵۶/۷۳)۔ بھوکوں کے لئے سامانِ زیست بنایا ہے۔ اس لئے اس فالتو رزق کو ان کی ضروریات کے لئے کھلا رکھو۔ سارے کا سارا اپنی ملکیت نہ سمجھ لو۔

اقبال کے الفاظ میں غور کرو کہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون — کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار — خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب — موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

دِہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں (بالِ جبریل)

جو کچھ قرآن نے یہاں زمین اور اس کی پیداوار کے متعلق کہا ہے۔ وہی کچھ دوسرے مقامات پر عام دولت کے متعلق بھی کہا ہے۔ قارون کو قرآن نے نظامِ سرمایہ داری کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قارون کی ذہنیت یہی کہ وہ کہتا تھا کہ۔ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِیْ (۲۸/۷۸) میری تمام دولت میری اپنی ہنرمندی کی وجہ سے ملی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ بَلْ هِیَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۳۹/۴۹) یہ ذہنیت بڑی غلط نگہی اور گمراہی پر مبنی ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے اور یہی کہے جاتے ہیں کہ جو کچھ انسان کماتا ہے وہ اس کی اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ حالانکہ اس میں کتنے ایسے بھی عنصر شامل ہوتے ہیں جن میں انفرادی طور پر اسے کچھ دخل نہیں ہوتا۔ مثلاً اس کی پیدائشی صلاحیتیں، تعلیم و تربیت۔ ماحول کے اثرات۔ معاشرہ کا نظم و نسق۔ مناسب مواقع OPPORTUNITIES کا ملنا وغیرہ۔

یہ تو رہا اس مسئلہ کا اصولی پہلو۔ جہاں تک اس کے عملی پہلو کا تعلق ہے قرآن اسے نہایت عمدگی سے حل کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب افراد کی تمام ضروریاتِ زندگی اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کیلئے سامان و ذرائع کی فراہمی کی ذمہ داری مملکت اپنے سر لے لے تو دولت کا افراد کی ملکیت میں رہنا بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں افراد

فرد اور مملکت کا معاہدہ

اور مملکت میں ایک معاہدہ ہوتا ہے جسے قرآن نے نہایت مختصر لیکن جامع انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ (۹/۱۱۱) افرادِ معاشرہ اپنی جان اور مال اللہ (یعنی اس مملکت) کے سپرد کر دیتے ہیں (جو خدا کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے قائم ہوتی ہے) اور مملکت انہیں الجنّۃ کی ضمانت دے دیتی ہے۔ الجنّۃ کے متعلق ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جہاں تک اس دنیا میں جنتی زندگی کا تعلق ہے، اس میں تمام سامانِ زیست اور ضروریاتِ زندگی بافراغت ملتی چلی جاتی ہیں۔ افراد اور مملکت کا یہ معاہدہ یونہی ذہنی طور پر نہیں ہوتا بلکہ اس سوسائٹی کا ممبر وہی بن سکتا ہے (بالفاظ دیگر مسلمان وہی ہو سکتا ہے) جو برضا و رغبت بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے، اس معاہدہ پر دستخط کرے۔ اس معاہدہ کی رو سے، ہر فرد اپنی محنت کے ماحصل سے اپنے پاس صرف اتنا رکھ سکتا ہے جتنے میں اس کی ضروریات پوری ہو جائیں۔ باقی سب نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے کھلا رکھتا ہے۔ اور مملکت کے فیصلے کے مطابق صرف کرتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹)۔ یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم (اپنی محنت کی کمائی میں سے) کس قدر دوسروں کے لئے دیدیں۔ ان سے کہو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد ہے سب کا سب۔ اس طرح قرآن، فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کسی کے پاس نہیں رہنے دیتا۔ اور نظامِ سرمایہ داری کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ کیونکہ اس نظام کی بنیاد ہی فاضلہ دولت پر ہے۔

اس نظام پر وہ سوال سامنے آتا ہے جس کا (بظاہر) کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملتا اور جسے نظامِ سرمایہ داری (CAPITALISTIC SYSTEM) کی تائید میں بطورِ دلیلِ محکم پیش کیا جاتا ہے۔ یہی وہ بھنور ہے جس میں روس کے معاشی نظام کی کشتی بری طرح پھنس رہی ہے اور اسے اس میں سے نکالنے کی کوئی تدبیر وہاں کے اربابِ حل و عقد کے ذہن میں نہیں آتی۔ سوال یہ ہے کہ جب افرادِ معاشرہ کو یقین ہو جائے کہ وہ کام کریں یا نہ کریں ان کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی رہیں گی، اور انہیں اس کا بھی پتہ ہو کہ وہ کتنا ہی کام کیوں نہ کریں، ان کی ضروریات سے زائد دولت ان کے پاس رہ نہیں سکتی۔ تو، اوّل تو وہ کام ہی کیوں کریں۔ اور اگر ان سے کسی طرح کام لیا بھی جائے تو وہ پوری محنت سے کام کیوں کریں؟ جس دولت کے متعلق وہ جانتے ہوں کہ ان کے پاس نہیں رہ سکتی وہ اس کے حصول کے لئے جان کیوں کھپائیں؟ لہٰذا اس قسم کے نظام کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ محنت سے

جذبۂ محرکہ

جی چرائیں گے اور ملک کی پیداوار اور قومی دولت روز بروز کم ہوتی جائے گی۔ روس اس وقت اسی مصیبت میں مبتلا ہے۔ کمیونزم نے غریبوں اور مزدوروں کو یہ کہہ کر انقلاب کے لئے ابھارا کہ تم اٹھو اور دولتمندوں سے ان کی دولت چھین لو۔ لیکن جب یہ مرحلہ گذر گیا اور جن دولتمندوں کے خلاف عوام کے دل میں نفرت اور انتقام کی آگ بھڑکائی گئی تھی وہ باقی نہ رہے تو عوام کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے۔ اب وہاں کوئی جذبۂ محرکہ ایسا نہیں ملتا جو عوام کو جانفروشانہ طور پر محنت پر آمادہ کر سکے۔ کمیونزم کی یہی بنیادی کمزوری ہے جس کی وجہ سے نظامِ سرمایہ داری کے حامل یہ کہتے ہیں کہ جب تک افراد کو اس کا یقین نہ ہو کہ وہ جو کچھ کمائیں گے ان کی ملکیت میں رہے گا' وہ کبھی پوری محنت سے کام نہیں کریں گے۔ لہٰذا نظامِ سرمایہ داری ہی قابلِ عمل نظام ہے۔ کیونکہ اس میں (PRIVATE ENTERPRISE) کی عام اجازت اور حدود فراموش وسعت ہوتی ہے۔ حالانکہ اگر بغور دیکھا جائے تو نظامِ سرمایہ داری کا یہ کہنا کہ اس میں افراد کی ساری دولت افراد کی ملکیت میں رہتی ہے' فریب اور سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔ کمیونزم محنت کشوں سے زائد دولت براہِ راست چھینتی ہے۔ کیپٹل ازم کا نظام زائد دولت مختلف قسم کے (TAXES) کے ذریعہ کھینچ لیتا ہے۔ استبداد دونوں جگہ کارفرما ہوتا ہے۔ کیونکہ نہ اشتراکی نظام میں محنت کش اپنی تمام کمائی برضا و رغبت اسٹیٹ کے حوالے کرتے ہیں۔ نہ نظامِ سرمایہ داری میں لوگ بطیب خاطر ٹیکس ادا کرتے ہیں۔

لہٰذا سوال یہ ہے کہ وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جس کی رو سے افراد زیادہ سے زیادہ محنت کریں اور اپنی فاضلہ کمائی برضا و رغبت نظام کے حوالے کر دیں۔ پروفیسر (HWTREY) نے کہا ہے کہ

> جو چیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے متمیز کرتی ہے یہ ہے کہ اس نظام میں وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جو لوگوں کو کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے[1]۔

یہ جذبۂ محرکہ صرف قرآن سے مل سکتا ہے۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کی رو سے زندگی کا مقصد انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ انسانی

---

[1] QUOTED BY E.H. CARR IN "THE NEW SOCIETY" P. 60)

جسم کی پرورش کے لئے قانون یہ ہے کہ جسم کی پرورش ان چیزوں سے ہوتی ہے جنہیں ایک فرد خود کھاتا یا استعمال کرتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ دوسروں کو کھلاتے جائیں اور جسم آپ کا تنومند و توانا ہوتا جائے۔ لیکن اس کے

انسانی ذات کی نشوونما کا قانون

برعکس، انسانی ذات کی نشوونما کے لئے قانون یہ ہے کہ ایک فرد کی ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے جسے وہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے۔ لہٰذا جس قدر کوئی فرد دوسروں کی پرورش کے لئے دیتا جائیگا اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس شخص کی زندگی کا مقصود اپنی ذات (PERSONALITY) کی نشوونما (DEVELOPMENT) ہو وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرکے کمائیگا۔ اس میں سے صرف اپنی ضروریات کے لئے رکھے گا اور باقی سب کچھ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے گا۔ ایسے شخص سے محنت کرانے کے لئے ڈنڈا یا ہنٹر تو ایک طرف کسی وعظ و نصیحت کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ نیز وہ جو کچھ دوسروں کو دے گا، اس کے لئے بدلہ یا معاوضہ تو کجا شکریہ تک کا بھی خواہاں نہیں ہوگا، کیونکہ انہیں جو کچھ دیتا ہے خود اپنی ذات کی منفعت کے لئے دیتا ہے۔ ان پر احسان نہیں کرتا۔ ایسے لوگوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جب دوسروں کی پرورش کا انتظام کرتے ہیں تو ان سے کہہ دیتے ہیں اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا ○ (۷۶/۹)۔ ہم تمہاری پرورش کے لئے جو انتظام کرتے ہیں تو یہ صرف قانون خداوندی کے اتباع میں کرتے ہیں (کہ ایسا کرنے سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے) اس لئے ہم تم سے معاوضہ تو ایک طرف، شکریہ تک کے بھی خواہاں نہیں۔ یہ لوگ اپنی ذات کی نشوونما کے لئے اس قدر بے تاب ہوتے ہیں کہ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹)، وہ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ انہیں تنگی ہی میں گذارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (۵۹/۹)۔ کھیتیاں انہی کی پروان چڑھتی ہیں جو مفاد پرستانہ جذبات سے محفوظ رہیں۔

یہ ہے وہ جماعت جو دنیا میں نظامِ ربوبیت قائم کرنے کی ذمہ داری سنبھالتی ہے۔ انہی کو جماعت مومنین یا حقیقی معنوں میں مسلمان کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ پوری پوری محنت کرتے ہیں، اس لئے کہ یہ جانتے ہیں کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ○ (۵۳/۳۹)۔ انسان کو وہی کچھ مل سکتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔ کوشش کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس طرح پیہم محنت اور مسلسل سعی و کاوش سے انہیں جو کچھ

ملتا ہے، وہ اس میں سے بقدر ضرورت اپنے لئے رکھتے ہیں اور باقی سب مملکت کی تحویل میں دے دیتے ہیں تاکہ وہ اس سے خدا کی عالمگیر ربوبیت کی عظیم ذمہ داری کو پورا کرے۔ اپنی ضروریات کے تعین میں بھی وہ نہ اسراف

ضروریات کا تعین

سے کام لیتے ہیں۔ نہ تبذیر سے۔ یعنی نہ ضرورت سے زائد خرچ کرتے ہیں، نہ بلا ضرورت دولت ضائع کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ○ (۶/۱۴۲) "خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔ اور اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ (۱۷/۲۷)۔ "دولت ضائع کرنے والے شیاطین کے بھائی بند ہیں"۔

یہ ہے وہ معاشی نظام جسے قرآن قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس نظام میں آپ دیکھئے کہ نہ صرف انسان کا معاشی مسئلہ ہی نہایت اطمینان بخش طریق سے حل ہو جاتا ہے بلکہ انفرادی مفاد پرستی کی وجہ سے جس قدر خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا بھی خود بخود استیصال ہو جاتا ہے۔ جب انسان کی ضروریاتِ زندگی خود بخود پوری ہوتی جائیں گی تو کوئی شخص ان ناپسندیدہ کاموں کے لئے تیار نہیں ہوگا جو اسے موجودہ غلط معاشرے میں محض روٹی کی خاطر کرنے پڑتے ہیں اور جب وہ فاضلہ دولت اپنے پاس نہیں رکھ سکے گا۔ تو اسے بددیانتی۔ چور بازاری۔ نفع خوری۔ سمگلنگ۔ فریب دہی کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ اس وقت نہ زمیندار اور کاشتکار کے جھگڑے ہوں گے، نہ مزدور اور کارخانہ دار کے تنازعے۔ نہ صاحب جائیداد اور کرایہ دار کے مناقشات ہوں گے نہ گاہک اور دوکاندار کے قضیئے۔ اس وقت نہ تقسیم وراثت کی مقدمہ بازی ہوگی۔ نہ لین دین کی کھینچا تانی۔ اس وقت ہر شخص ضروریاتِ زندگی سے بے نیاز ہوگا اور اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف۔

کہہ دیا جائے گا کہ صاحب! یہ حسین خواب (UTOPIA) اور شاعرانہ تخیل ہے۔ اس قسم کا

حسین خواب

معاشرہ کبھی قائم نہیں ہو سکتا۔ خود غرضی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ آپ اس جذبہ کو دل سے نکال نہیں سکتے۔ انسان کبھی ایسے نیک نہیں بن سکتے جیسی ان کی تصویر کھینچی جا رہی ہے۔ انسان شروع سے ایسا ہی رہا ہے اور ایسا ہی رہے گا۔

لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ انسان بد فطرت نہیں ہے۔ اس کی درحقیقت کوئی فطرت ہی نہیں۔ فطرت، جمادات، نباتات وحیوانات کی ہوتی ہے جسے وہ بدل نہیں سکتے۔ انسان کو کچھ بننے کی صلاحیتیں دی گئی ہیں۔ اگر ان صلاحیتوں کی صحیح تربیت کر دو تو وہ اچھا انسان

بن جائے گا۔ ان کی غلط تربیت کرو تو وہ بُرا انسان بن جائے گا۔ ہم غلط معاشرہ قائم کرتے ہیں۔ اس میں انسانی بچوں کی تعلیم و تربیت غلط خطوط پر کرتے ہیں۔ جب اس قسم کے معاشرے پر دو چار صدیاں گذر جائیں تو ظاہر ہے کہ وراثت اور ماحول کے اثرات سے اس میں اُسی قسم کے انسان پیدا ہونے لگ جائیں گے۔ ہم اس قسم کے خود غرض اور بدنیت انسان پیدا تو خود کرتے ہیں لیکن (خود بری الذمہ ہونے کے لئے) کہہ دیتے

خواب نہیں حقیقت

ہیں کہ انسان کی فطرت ہی ایسی ہے۔ اگر ہم اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت صحیح تصوراتِ زندگی کے مطابق کریں اور اس طرح دو چار نسلوں تک کرتے جائیں تو پھر نظر آئے گا کہ ہمارے معاشرے میں کس قسم کے انسان پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے

عملی طریق

کہ قرآن نظام ربوبیت کے قیام کے لئے، ان افراد کی تعلیم و تربیت نہایت ضروری (بلکہ لاینفک) قرار دیتا ہے جن کے ہاتھوں اس نظام کا قیام عمل میں آتا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ تم اس نظام کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے کر اس کے لئے ذہنی فضا کو سازگار بناؤ۔ اس کے ساتھ ہی تم اپنی آنے والی نسلوں کی صحیح تعلیم و تربیت شروع کر دو۔ جوں جوں ان آنے والی نسلوں کا قلب و دماغ صحیح (قرآنی) قالب میں ڈھلتا چلا جائے، اس نظام کو بتدریج آگے بڑھاتے جاؤ۔ تا آنکہ یہ اپنی آخری منزل تک پہنچ جائے۔

قرآن چونکہ انسانی زندگی کے ہر دور کے لئے راہ نمائی دیتا ہے۔ اس لئے اس نے جہاں اُس منزل کا پورا پورا تعارف کرا دیا ہے۔ جہاں پہنچ کر نظامِ ربوبیت اپنی مکمل شکل میں قائم ہوتا ہے، وہاں اُس نے اُس عبوری دور (TRANSITORY PERIOD) سے متعلق بھی احکامات و ضوابط دیدیئے ہیں جس

عبوری دور کے احکام

سے گذر کر یہ بتدریج آخری منزل تک پہنچتا ہے۔ اس (عبوری) دور کے احکام و قوانین بھی ایسے ہیں جو معاشرہ کو رفتہ رفتہ آخری منزل تک پہنچنے کے لئے تیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں خیرات و صدقات کی ترغیب۔ بخل اور حرص کی مذمت۔ ربٰو کی ممانعت۔ زر اندوزی کی مخالفت۔ وراثت کے احکام، سب اس عبوری دور سے متعلق ہیں۔ کہیں اس کا ارشاد ہے کہ وَ الَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (۹/۳۴)۔ "جو لوگ چاندی اور سونا جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں کھلا نہیں رکھتے، تو انہیں دردناک عذاب سے آگاہ کر دے۔" اور کہیں وہ کہتا ہے کہ تمہاری

تباہی کی وجہ یہ ہے کہ تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۝ وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝ (۸۹-۱۹)
تم وراثت کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور دولت سے اس قدر محبت رکھتے ہو کہ چاہتے ہو کہ سب کا مال تمہارے ہی پاس آجائے۔ کہیں وہ کہتا ہے کہ تباہی ان لوگوں کے لئے ہے جن کی ذہنیت یہ ہے کہ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَ اِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ (۸۳-۳) - جب وہ دوسروں سے ماپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب انہیں ماپ یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔ کہیں وہ مالیات کے مشیروں سے کہتا ہے کہ دولت کی تقسیم اس طرح نہ کرو کہ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۝ (۵۹) کہ وہ تم میں سے دولتمندوں کے طبقہ ہی میں گردش کرتی رہے۔ اور کہیں قارونی صفتوں سے کہتا ہے کہ تم یہ نہ سمجھ لو کہ جس قدر مال و دولت تمہارے پاس جمع ہو رہا ہے اِنَّمَا اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (۲۸) - یہ سب ہماری ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اس پر ہمیں کامل تصرف حاصل ہے کہ جس طرح جی چاہے اسے صرف کریں۔ قرآن کے یہ احکام و ضوابط اپنی اپنی جگہ مستقل راہ نمائی کا کام دیتے ہیں۔ لیکن جب نظامِ ربوبیت اپنی مکمل شکل میں قائم ہوتا ہے تو اس میں چونکہ ضروریات ہر ایک کی پوری ہو جاتی ہیں اور فاضلہ دولت کسی کے پاس رہتی نہیں، اس لئے اس وقت اس جماعت یا معاشرہ کے لئے عبوری دور سے متعلق احکام کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس طرح قرآن بتدریج اُس نظام کو ان افراد کے ہاتھوں قائم کرا دیتا ہے جو صحیح تعلیم و تربیت سے اسے چلانے کی صلاحیتیں اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر ایسی جماعت پیدا نہ ہو جو اس نظام کے قیام کی کوشش کرے تو قدرت چپکے بیٹھی منہ دیکھتی رہتی ہے۔ دنیا میں غلط نظامہائے زندگی کی تخریب اور ان کی جگہ صحیح نظام کے قیام کے لئے خدا کا کائناتی قانون اپنے طور پر مصروفِ عمل رہتا ہے۔ اسی کو کشمکش حق و باطل کہا جاتا ہے

کائناتی قانون

جو کائنات میں مسلسل جاری و ساری رہتی ہے۔ اس میں باطل کی شکست اور حق کا غلبہ لازمی ہوتا ہے۔ لیکن اس کی رفتار اس قدر سست ہوتی ہے کہ قرآن کے الفاظ میں، اس کا ایک ایک دن ہمارے حساب و شمار سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ یہ اسی کائناتی قانون کی کارفرمائی ہوتی ہے جس کی رُو سے (مثلاً) قرآن کہتا ہے کہ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي

الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا وَ اللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ وَ هُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ○ (۱۳/۴۱)۔ "کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم کس طرح زمین کو اس کے بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے لے کر کم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ان معاملات کے فیصلے خدا (کا قانون) کرتا ہے۔ اس کے فیصلے (کو رد کرنا تو ایک طرف رہا) پر نظرِ ثانی کرنے کا بھی کسی کو اختیار حاصل نہیں۔ وہ بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔" لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے اس کا "بہت جلد حساب کرنا" بھی ہمارے حساب و شمار سے سینکڑوں برس لے لیتا ہے۔ لیکن اگر انسان چاہے کہ خدا کا یہ قانون، ہمارے حساب و شمار کے مطابق نتائج مرتب کرے، تو اس کا طریق یہ ہے کہ انسان اس قانون کے ساتھ تعاون کرے اور اسے آگے بڑھانے کے لئے اس کا دست و بازو بن جائے۔ انسان اگر اس طرح خدا کے قانون کی مدد کریگا تو اس کا قانون خود انسان کا ممد و معاون بن جائے گا۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ (۴۷/۷) کے یہی معنی ہیں۔ اس طرح غلط نظام کی صفیں دنوں میں الٹ جائیں گی۔ اور اس کی جگہ صحیح نظام کی بساط بچھتی چلی جائے گی۔ نبی اکرمؐ اور حضورؐ کے رفقاء (رض) کی جماعت نے یہی کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ چند دنوں کے اندر ایک ایسا محیر العقول انقلاب برپا ہو گیا جس کی مثال چشمِ فلک نے کبھی نہ دیکھی تھی اور جس کے اسباب و علل معلوم اور متعین کرنے کے سلسلہ میں دنیا بھر کے مؤرخ آج تک انگشت بدنداں ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں نے اس قانون کا ساتھ چھوڑ دیا اور اسی نظامِ زندگی کو اختیار کر لیا جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا تو خدا کا کائناتی قانون پھر اپنی رفتار سے چلنے لگ گیا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

دنیا از خود ادھر آ رہی ہے

آپ اس ہزار سال کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ کس طرح انسان اپنے ناکام تجارب کے بعد رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر قرآنی نظامِ زندگی کے مختلف اجزاء کو اپنائے چلا آ رہا ہے۔ لیکن اس تبدیلی کی رفتار بہرحال سست ہے۔ میری کوشش یہ ہے کہ ہم اس خطۂ زمین میں، جسے ہم نے حاصل ہی اس مقصد کے لئے کیا تھا کہ ہم یہاں اسلام کا صحیح نظام قائم کریں۔ خدا کے کائناتی قانون کی رفاقت کا فریضہ سر انجام دیں تاکہ اس کے نتائج

میری کوشش

ہمارے حساب و شمار سے برآمد ہونے شروع ہو جائیں۔ اس کا پہلا قدم یہ تھا کہ اس فکر کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے تاکہ قرآن کا جو تصورِ زندگی اتنے عرصے سے نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے وہ پھر ہمارے سامنے آ جائے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد میں نے

اپنی تمام مساعی کو اسی نقطہ پر مرکوز کر رکھا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اس کے نتائج بڑے حوصلہ افزا ہیں۔ اب اگلا مرحلہ یہ ہے کہ پاکستان کا مجوزہ آئین انہی خطوط کے مطابق مرتب ہو جائے اور اس طرح کاروانِ ملت اس صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائے جو اسے قدم بقدم، قرآنی نظام ربوبیت کی آخری منزل تک لیجائے اگر ایسا ہو گیا تو آپ دیکھئے گا کہ غلط نظامہائے زندگی کا ستایا ہوا انسان کس طرح کشاں کشاں اس نظام کے حیات پرور سایۂ عاطفت میں پناہ لینے کے لئے آتا ہے اور کس طرح یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (۱۱۰/۲)۔ کا کیف آور منظر وجہ بالیدگیٔ قلب و نظر ہو جاتا ہے۔ وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (۳۹/۶۹)۔ (زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی) کی بشارت کس طرح ایک زندہ شہادت بن کر سامنے آجاتی ہے۔

جو لوگ قرآن کے نظام ربوبیت کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں؛ کیا ان کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کوشش کریں کہ آئینِ پاکستان اس نظام کا مظہر ہو اور مملکتِ پاکستان تمام افرادِ معاشرہ کو اس کی ضمانت دے کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)۔

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

استفسارات

تقریر کے بعد سامعین کی طرف سے کچھ سوالات کئے گئے جن کے وہیں جواب دیئے گئے۔ ان میں سے اہم سوالات اور ان کے جوابات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

۱۔ **سوال** ہم بھوک کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں تو پھر ہم بلا قصور عذاب خداوندی میں مبتلا کیوں کر دیئے گئے ہیں:

جواب اجتماعی جرائم اور ان کے نتائج کا سلسلہ انفرادی غلطیوں کی پاداش سے مختلف ہے۔ ایک قوم غلط نظام قائم کرتی ہے یا غلط روش اختیار کرتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ذلت اور پستی۔ بھوک اور افلاس کے عذاب میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ اس کا یہ عذاب آیندہ نسلوں تک برابر جاری

رہتا ہے۔ یعنی اس قوم کی ہر نئی نسل شروع ہی سے بھوک اور افلاس کے عذاب میں مبتلا ہوتی ہے۔ یہ اس نسل کی پیش رو نسلوں کے اجتماعی اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے جسے اس نسل کو بھگتنا پڑے گا۔ بعینہٖ جس طرح اگر کسی قوم کی ایک نسل اچھے کام کرتی ہے تو وہ قوم خوش حال ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بعد اس کی آنے والی نسلیں، خوشحال پیدا ہوتی ہیں۔ انفرادی طور پر سمجھنا ہو تو یوں سمجھئے کہ تندرست ماں باپ کا بچہ پیدائشی طور پر تندرست ہوتا ہے اور جس بچے کے والدین کسی متعدی مرض میں مبتلا ہوں اُسے وہ مرض پیدائش کے ساتھ وراثت میں مل جاتا ہے اور عمر بھر اس کا دُکھ سہتا رہتا ہے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے اس کے لئے تو یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہوگا کہ ہماری سابقہ نسلوں نے غلطی کی اور اس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں۔ ہم نے تشکیل پاکستان کے بعد، خود غلط نظام قائم کیا اور ہم سے ملی جرائم بھی مسلسل سرزد ہوتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم بھوک اور افلاس کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ لہٰذا ہمارے قصّے میں تو یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ہم بلا قصور عذاب خداوندی میں مبتلا ہیں۔ البتہ اگر ہم نے اپنی سابقہ غلطیوں کی تلافی نہ کی تو ہماری آنے والی نسلیں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گی کہ ہم اپنے اسلاف کے جرائم کی سزا بھگت رہے ہیں۔

یہ ہے اجتماعی جرائم کا فلسفہ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی رُو سے "قومیں" جہنم میں داخل ہوتی ہیں۔ (دیکھئے سورۂ اعراف۔ آیت ۳۸)۔

۴۔ سوال یہ ٹھیک ہے کہ ہم اپنی سابقہ نسلوں کے جرائم کی پاداش میں بھوک کے عذاب میں گرفتار ہیں لیکن اس سے ہماری عاقبت کیوں خراب ہو؟

جواب اگر ہم اپنی موجودہ حالت پر مطمئن رہے اور اس عذاب سے نکلنے کی کوشش نہ کی تو ہمارے اس جرم کی پاداش میں ہماری عاقبت خراب ہو گی۔ لیکن اگر ہم نے یہاں صحیح نظام قائم کرنے کی کوشش کی تو پھر ہماری عاقبت خراب نہیں ہو گی، خواہ یہ نظام ہماری زندگی میں قائم ہو جائے یا اس کے بعد۔ اگر یہ نظام ہماری زندگی میں قائم ہو گیا تو ہماری یہ زندگی بھی خوش حال ہو جائے گی اور اگلی زندگی بھی سرسبز و شاداب۔ لیکن اگر یہ نظام ہمارے بعد قائم ہوا تو ہم بے شک عسرت کی زندگی بسر کرتے ہوئے مر جائیں گے لیکن ہماری اگلی زندگی شاداب ہو گی۔ اور ہماری آنے والی نسل کی زندگی خوش حال۔ اگر انھوں نے اس نظام کے استحکام کے لئے کوشش کی تو اس دنیا کی خوش حالی کے ساتھ، اُن کی اُخروی زندگی بھی شادکام ہو گی۔ لیکن اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کی موجودہ زندگی تو آسانی سے گذر جائے گی لیکن آخرت تباہ ہو جائے گی۔

۳۔ سوال آپ نے کہا ہے کہ جس قوم کی دنیاوی زندگی عسرت اور بدحالی کی ہوتی ہے۔ اس کی آخرت بھی تباہ و برباد ہوتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس قوم کی اس دنیا کی زندگی خوش حالی میں گزرتی ہے اس کی آخرت بھی سنور جاتی ہے۔ اقوامِ مغرب کی موجودہ زندگی بڑے عیش و آرام میں گزرتی ہے کیا وہ آخرت میں بھی اسی طرح عیش کریں گے؟

جواب آپ نے مندرجہ بالا نتیجہ اخذ کرنے میں عجلت کی ہے۔ صورت یہ ہے کہ اس دنیا میں رزق کی کشادِ خدا کے طبعی قوانین سے وابستہ ہے۔ جو قوم ان قوانین کے مطابق تسخیرِ فطرت کرے گی اس کی زندگی خوش حالی میں گزرے گی ـــــ وہ قوم مسلم ہو یا غیر مسلم ـــــ قرآن کہتا ہے کہ اس باب میں خدا کسی میں تفریق نہیں کرتا کُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ؁ (۱۷/۲۰)۔ جو چیزیں خدا نے نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے مفت عطا کی ہیں۔ یعنی سامانِ رزق ـــــ وہ زمین کے دسترخوان پر کھلی پڑی ہیں جس کا جی چاہے ہاتھ بڑھا کر اٹھا لے۔ جو قوم ان کے حاصل کرنے میں جس قدر محنت کرے گی۔ اسے اسی قدر مل جائے گا۔ یہ نہیں کہ خدا نے غیر مسلموں کے راستے میں بند لگا دیئے ہوں کہ وہ آگے بڑھ کر انہیں حاصل نہیں کر سکتے۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس دنیا کی متاع، ہر قوم کو باندازۂ سعی و عمل مل جاتی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی غیر مسلم قوم اس کے لئے محنت کرتی ہے تو اسے دنیا میں خوش حالی نصیب ہو جاتی ہے۔ جماعتِ مومنین، زندگی کے ہر شعبہ میں قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتی ہے اس لئے اس کی دنیاوی زندگی یقیناً سرفرازی اور سربلندی کی زندگی ہوتی ہے اور چونکہ اس کے نزدیک زندگی اسی دنیا کی نہیں بلکہ وہ موت کے بعد بھی مسلسل آگے بڑھتی ہے اس لئے اس کی اُخروی زندگی بھی تابناک ہوتی ہے۔

جو غیر مسلم قوم دنیاوی متاعِ زیست کے لئے کوشش کرتی ہے اس کی دنیاوی زندگی خوش حال ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ وہ زندگی کو اس دنیا تک محدود سمجھتی ہے اور انسانی ذات کی نشو و نما سے متعلق قوانینِ خداوندی پر یقین نہیں رکھتی اس لئے اس کی اُخروی زندگی ناکام رہتی ہے۔ اقوامِ مغرب کی یہی حالت ہے۔ لیکن جو قوم بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہو اور اس سے نکلنے کی کوشش نہ کرے، اس کی دنیاوی زندگی بھی عذاب میں گزرتی ہے اور اُخروی زندگی بھی عذاب میں۔ ہم (بدقسمتی سے) اسی شق میں آتے ہیں۔

۴۔ سوال کیا اسلامی مملکت کے نظامِ ربوبیت میں غیر مسلموں کا بھی حصہ ہوگا؟

جواب قرآنی نظامِ ربوبیت میں ہر فرزند آدم کا حصہ ہوگا خواہ اس کا مذہب و مشرب کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ جس ملک میں حالت یہ ہو کہ اگر ایک کتا بھی بھوک سے مرجائے تو اس کی ذمہ داری معاشرہ پر عاید ہو۔ اس میں کسی انسان کی بھوک کو کیسے برداشت کیا جاسکتا ہے ؛ خدا کی رب العالمینی (عالمگیر ربوبیت) انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرتی۔

۵۔ سوال جب نظام ربوبیت میں تمام انسانوں کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری ہوجائینگی تو پھر قرآنی نظام کے سامنے کیا پروگرام ہوگا ؟

جواب جیسا کہ دورانِ تقریر میں بتایا گیا ہے قرآن کی رُو سے انسانوں کو بنیادی ضروریات کی پریشانیوں سے اس لئے فارغ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی ذات کی نشوونما کامل اطمینان اور سکون سے کرسکیں انسانی ذات کی ممکنات، جن کی نشوونما مقصودِ حیات ہے، اتنی وسیع ہیں کہ ہم اس وقت جبکہ ہمیں شعور ذات تک بھی نصیب نہیں۔ اس کا اندازہ نہیں لگاسکتے۔ یہ بہت بڑا پروگرام ہے۔ معلوم جب افراد انسانیہ کی ذات میں نشوونما ہوگا تو یہ دنیا کیا سے کیا بن جائے گی۔

یہ تو رہا انسانی ذات کی نشوونما کا قصہ۔ ویسے اگر محض بنیادی ضروریات کے پورا کرنے کے پروگرام کو لیا جائے تو وہ بھی اتنی جلدی ختم نہیں ہوسکتا۔ قرآن نے اس نظام کو صرف انسانوں کی ضروریات تک محدود نہیں رکھا۔ اس نے " دابۃ " کہا ہے جس کے معنی ہر ذی حیات یا ہر چلنے والا ہے۔ نیز دابۃ کے متعلق اس نے کہا ہے کہ وہ اسی زمین میں نہیں، اجرام فلکی میں بھی موجود ہیں (وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ۲۹/۴۲)۔ یورپ کے سائنسدان کے سامنے صرف اجرامِ فلکی کا مسخر کرنا ہے اور وہاں کے سیاسی مدبروں کے پیش نظر ان جدید دنیاؤں تک اپنی استعماریت کی توسیع۔ لیکن قرآنی نظام ان حالات میں یہ سوچے گا کہ ان اجرام میں بسنے والے "دابۃ" کی پرورش کی ذمہ داری بھی اس کے فرائض میں شامل ہوجائے گی کیونکہ اس کے خدا نے اپنے آپ کو ربّ العالمین کہا ہے۔ اور عالمین میں پوری کائنات آجاتی ہے۔ بہرحال۔ آپ گھبرائیے نہیں۔ قرآنی نظام کا پروگرام اتنی آسانی سے ختم نہیں ہوجائے گا کہ آپ کے کرنے کے لئے کوئی کام ہی نہ رہے۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

۴۔ سوال   پاکستان میں قرآنی نظام ربوبیت کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟

جواب   سب سے پہلے اس فکر کو عام کرنا چاہیئے کہ دین کا مقصود اس نظام کا قیام ہے اور اسلامی مملکت اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اس فکر کے عام کرنے سے مقصد یہ ہے کہ پاکستان کے نئے آئین میں یہ بات درج ہو جائے کہ تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریات اور ان کی ذات کی نشوونما کے لئے اسباب و ذرائع فراہم کرنا مملکت کی ذمہ داری ہے۔ جب مملکت اس فریضہ کو اپنے ذمہ لے لے گی تو اس نظام کا قیام عمل میں آجائے گا۔ اس کے لئے وقت ضرور لگے گا۔ آئین میں اس شق کے شامل ہو جانے سے ہماری منزل کا تعین تو ہو جائے گا۔ آپ اس فکر کے عام کرنے میں جس قدر کوشش کریں گے، اُسی قدر اس نظام کے قیام کے امکانات روشن ہوتے جائیں گے۔

(اکتوبر ۱۹۵۹ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ملکیت زمین

قرآن کریم کی رو سے زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں (بلکہ تمام ذی حیات) کو پیدا کیا تو اس کے ساتھ ہی (بلکہ ان کی پیدائش سے بھی پہلے) ان اسباب و ذرائع کو بھی پیدا کر دیا جن پر ان کی زندگی کا دار و مدار تھا ــــ پانی، ہوا، روشنی، حرارت۔ اور زمین جس سے خوراک حاصل ہوتی ہے۔

(۲) حیوانات (یا یوں کہئے کہ انسان کے علاوہ دیگر ذی حیات) چونکہ تمدنی زندگی بسر نہیں کرتے اس لئے ان کے لئے کسی ایسے خارجی نظام کی ضرورت نہ تھی جو ان اسباب و ذرائع زیست (یعنی رزق کے سرچشموں) کا انتظام اس انداز سے کرے کہ ان سے ان سب کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ لیکن انسان کو تمدنی زندگی بسر کرنا تھی اس لئے اس کی صورت میں ایسے نظام کی ضرورت تھی۔ اس نظام کو مملکت کہتے ہیں۔ چنانچہ اس مملکت کا بنیادی فریضہ یہ قرار دیا گیا کہ وہ زمین کا انتظام اس انداز سے کرے کہ اس سے تمام افراد انسانیہ کی بنیادی ضروریات زندگی اطمینان اور سکون سے پوری ہوتی رہیں۔ اس مقصد کیلئے زمین، اسلامی مملکت کے کنٹرول میں رہتی ہے۔ اب یہ اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ (اپنے زمانے کے حالات کے مطابق) ایسا انتظام کرے جس سے زمین سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل ہو اور اس پیداوار کی تقسیم اس انداز سے ہو کہ کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہ ہونے پائے۔ یہ ہے قرآن کریم کی رُو سے زمین کی پوزیشن۔ ظاہر ہے کہ اس میں زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال پیدا نہیں

تفصیل ان امور کی آگے چل کر ملے گی)۔ اسی سلسلہ میں اکثر یہ پوچھا جاتا ہے کہ عہد رسالتمآبؐ اور خلافت راشدہ میں زمین کے انتظام کی شکل کیا تھی۔ اسی سلسلہ میں چند ایک بنیادی حقائق کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

(۱) یہ ہمارا ایمان ہے کہ محمد رسول اللہ والذین معہٗ کی زندگی قرآن کریم کے مطابق بسر ہوتی تھی اس لئے جو نظام انہوں نے قائم کیا تھا وہ لامحالہ قرآن کی تعلیم کے مطابق ہوگا۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ قرآن کی منشاء کے خلاف اپنا نظام قائم کرتے۔

(۲) اُس عہد کی تاریخ اُس زمانے میں مرتب نہیں ہوئی۔ یہ تاریخ اُس زمانے سے دو تین سو سال بعد اس طرح مرتب ہوئی کہ اس کے لئے کوئی تحریری مواد موجود نہیں تھا۔ اس کا تمام انحصار صرف زبانی روایات پر تھا جو لوگوں میں عام طور پر چلی آرہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح سے مرتب شدہ تاریخ میں صحیح اور غلط ہر قسم کی باتیں درج ہو سکتی ہیں۔ جہاں تک عہد محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ کا تعلق ہے، یہ پرکھنے کے لئے کہ اس (تاریخ) میں کون سی بات صحیح اور کونسی غلط ہے، ایک ہی معیار قابل اعتماد ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اس میں جو بات قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہو، اس کے متعلق سمجھ لیا جائے کہ وہ صحیح نہیں۔

(۳) اسلام کی اولیں مملکت جس سرزمین میں قائم ہوئی تھی (یعنی عرب کا ملک) وہ عام طور پر "غیر ذی زرع" تھا۔ یعنی اس کی معیشت زرعی نہیں تھی۔ اس لئے اس مملکت نے زرعی معیشت کے متعلق کوئی ایسا جامع و مانع نظام متعین نہیں کیا تھا جو دنیا کے موجودہ حالات پر من و عن منطبق ہو سکے۔ اس میں زرعی نظام کے سرسری اور ابتدائی خط و خال ہی مل سکتے ہیں۔

(۴) اسلامی مملکت کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے نظام کے مختلف شعبوں کی ابتداء اس ماحول کے تقاضوں کے مطابق کرتی ہے جس میں وہ جنم لیتی ہے اور پھر اس کے بعد بتدریج اس نظام کو منتہیٰ تک پہنچاتی ہے۔ یہی انداز ہمارے قرن اول کی اسلامی مملکت نے اختیار کیا تھا۔ لیکن ہماری تاریخ میں (جیسی کچھ بھی وہ ہے) واقعات کے ریکارڈ کرنے میں، اس امر کا التزام نہیں کیا گیا کہ جس ترتیب سے وہ رونما ہوئے تھے، اسی ترتیب سے وہ درج کئے گئے ہوں۔ یہ واقعات گڈمڈ شدہ شکل میں سامنے آتے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ ایک ہی موضوع پر اکثر اوقات متضاد باتیں تاریخ میں لکھی ملتی ہیں اور انسان شش و پنج میں پڑ جاتا ہے کہ ان میں سے کسے قبول اور کسے مسترد کرے۔ انہی سے ایک ہی مسئلہ کے موافق اور مخالف سندات پیش کر دی جاتی ہیں۔ اگر یہ واقعات اسی ترتیب سے مذکور ہوتے جن کے مطابق یہ رونما ہوئے تھے تو واضح ہو جاتا کہ اس

اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ وہ مملکت، ہر شعبۂ زندگی میں اپنے نظام کو بتدریج آگے لے جا رہی تھی۔ اس تدریج میں اس کا قدم، قرآن کے مقرر کردہ اصولوں سے تو اِدھر اُدھر نہیں ہٹتا تھا لیکن ان اصولوں کو بروئے کار لانے کے لئے جو طریق کار اختیار کیا جاتا تھا اس کی مختلف کڑیوں میں جزئی فرق ناگزیر تھا۔ ہمارے لئے غیر متبدل وہ اصول ہیں جو قرآن کریم میں محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ ہم ان اصولوں کو اپنے زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں اپنے طریقوں کے مطابق بروئے کار لائیں گے۔ یاد رکھئے۔ کاروانِ انسانیت کے لئے وہ منزل غیر متبدل ہے جسے قرآن نے متعین کیا ہے۔ ذرائع و طریقِ سفر غیر متبدل نہیں۔ لہٰذا اگر تاریخ سے یہ معلوم بھی ہو جائے کہ کسی زمانے میں، قرآن کے اصولوں پر عمل کس طریق سے ہوا تھا، تو یہ چیز ہمیں صرف تاریخی فائدہ دے گی۔

(۵) زمین کے انتظام کے سلسلہ میں، قرنِ اوّل کی اسلامی مملکت نے کیا طریق کار اختیار کیا تھا، تاریخ میں اس کے متعلق جو کچھ ملتا ہے اسے آیندہ دو عنوانات میں سامنے لایا گیا ہے۔ آپ ان کا مطالعہ اس تمہید کی روشنی میں کریں۔

زمینداری اور جاگیرداری

(شائع شدہ اپریل ۱۹۵۳ء)

قرآن کریم کی رو سے اگر دیکھا جائے تو یہ امر نہایت وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتا ہے کہ اسلام میں مروجہ زمینداری و جاگیرداری نظام کے لئے قطعاً کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اسلام میں انفرادی ملکیت کا تصور بھی موجود ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو اس کی حیثیت کیا ہے؟ نیز اس امر کو بھی دیکھنا ہوگا کہ اسلام انفرادی ملکیت کو جائز رکھتا ہے تو بلاتخصیص و تحدید ہر قسم کی چیزوں میں اس کو جائز رکھتا ہے یا اس ضمن میں کچھ حدود و قیود عائد کرتا ہے ـــــ اس میں کچھ مستثنیات تو نہیں ہیں ـــــ قرآن کی ہدایت اس باب میں کس قدر واضح ہیں سردست ہم اس سے بحث نہیں کریں گے کیونکہ قرآن کی رو سے اسلام کا نظام ربوبیت کیا ہے۔ اس موضوع پر ایک تفصیلی تصنیف محترم پرویز صاحب کے زیر ترتیب ہے جس سے اس کے تمام گوشے نکھر کر سامنے آجائیں گے[1] اس فرصت میں ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہم سے پہلے اور حضرات اس موضوع پر کیا کچھ لکھ چکے ہیں اور ان کے نتائج فکر اس باب میں کیا ہیں؟

اس موضوع پر ہم سب سے پہلے مصر کے مشہور مفکر علامہ سید قطب[2] کا خیال پیش کرتے ہیں جو انہوں نے اپنی کتاب العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام میں بیان کیا ہے۔ ان کی اس بحث کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

---

[1] یہ کتاب شائع ہو کر بہت مقبول ہو چکی ہے۔ [2] یہ اب مرحوم ہو چکے ہیں۔

"یہ صحیح ہے کہ اسلام نے بعض اموال میں انفرادی ملکیت کے حقوق کو تسلیم کیا ہے مگر اس کے لئے کچھ حدود اور قیود عاید کی ہیں ساتھ ہی کچھ ایسے اموال بھی ہیں جن کے لئے اسلام انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کرتا ہے ان کی حیثیت بھی عینی ملکیت کی ہرگز نہیں ہے بلکہ اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو فرد کی حیثیت ان اموال میں بھی جماعت کی طرف سے یک گونہ وکیل کی سی ہے۔ ورنہ مال علی العموم جماعت ہی کی ملکیت میں داخل ہے اور جماعت بھی دراصل حقیقی مالک نہیں ہے بلکہ وہ خدا کی طرف سے نیابتہً اس میں تصرفات کرنے کا حق رکھتی ہے ورنہ ہر چیز کا مالک حقیقی سوائے خدا کے اور کوئی نہیں ہے۔

قرآن کریم وضاحت کے ساتھ اس اصل عظیم کو واضح کر دیتا ہے۔ چنانچہ سورۂ حدید میں ہے۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ (۵۷/۷)

اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور جن اموال میں اس نے تمہیں خلیفہ بنایا ہے ان کو مصالح عامہ کے لئے کھلا چھوڑ دو۔

اس آیت میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔ جو معنی ہم نے اس سے سمجھے ہیں اس کے لئے یہ نص صریح ہے کہ انسان کے ہاتھ میں جو اموال ہیں وہ دراصل خدا کے اموال ہیں اور انسان ان اموال میں وکیل ہے، اصیل نہیں ہے ایسے ہی سورۂ نور میں جہاں مکاتبین (وہ غلام جو مکاتبت کر کے آزادی حاصل کرنا چاہیں) کی امداد و اعانت کا حکم دیا گیا ہے وہاں حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَّ اٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْۤ اٰتٰىكُمْ (۲۴/۳۳)

اور ان مکاتبین کو خدا کے اس مال میں سے دو جو اس نے تمہیں دیا ہے۔

یہاں دیکھئے کہ مالدار لوگ ان مکاتبین کو اپنا مال نہیں دیتے ہیں بلکہ اللہ کا مال دیتے ہیں۔ دینے والے محض درمیان کا واسطہ بنتے ہیں۔ تیسری آیت جو سورۂ نحل کی ہے وہ ان سے بھی زیادہ صریح ہے۔

وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَهُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ ○ (۱۶/۷۱)

خدا نے تحصیل رزق کے ضمن میں بعض کو بعض سے زیادہ صلاحیتیں دی ہیں۔ لہٰذا جو لوگ زیادہ مال کما سکتے ہیں وہ زائد مال کو اپنے زیر دستوں کی طرف کیوں نہیں لوٹا دیتے کیونکہ یہ مال انہی کا

ہے۔ یہ لوگ ایسا اس خیال سے نہیں کرتے کہ اس طرح برابر ہوجائیں گے ایسا خیال کرنے میں وہ خدا کی نعمت سے انکار کرنا چاہتے ہیں؟

یہاں قرآن کریم نے یہ چیز ثابت کر دی ہے۔ کہ دولت مند لوگ اپنے ہاتھ کے نیچے کے لوگوں کو جو کچھ دیتے ہیں وہ دراصل ان مالداروں کے مال کا کوئی حصّہ نہیں ہوتا جو وہ ان ضرورتمندوں کو دیتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ دراصل خود ان کا اصلی حق ہوتا ہے جسے یہ لوگ پورا کرتے ہیں کیونکہ اس مال میں وہ اور یہ سب برابر ہیں۔ ان میں سے ہر گروہ دوسرے کے مثل حقدار ہے کیونکہ مال کا سرچشمہ ایک ہی ہے جو کچھ یہ لوگ لیتے ہیں ان کا حق ایسا ہی ہے جیسے ان لوگوں کا جو دیتے ہیں، اس کے بعد سوال انکاری ہے کہ کیا یہ لوگ خدا کی نعمت سے انکار کرنا چاہتے ہیں کیونکہ یہ مال جو ان کے قبضہ میں ہے درحقیقت ان کی اپنی ملکیت تو نہیں ہے بلکہ خدا کا تفضل وانعام ہی تو ہے۔

اس سے بھی زیادہ صریح قرآن کا وہ حکم ہے جو سورۂ نسا میں موجود ہے جس سے انفرادی ملکیت کی حقیقت بالکل ہی واضح ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ملکیت کہتے کسے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سے مراد تصرّف اور انتفاع کی ملکیت ہی ہے۔ اگر کسی کو کسی مال میں تصرّف اور انتفاع کا حق نہیں تو وہ اس کا مالک نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے بعد دیکھئے کہ قرآن کریم ہر فرد کو اپنے اموال میں تصرّف کا حق نہیں دیتا بلکہ اس کے لئے صحت تصرّف کی شرط عائد کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص تصرفات میں حماقت وسفاہت کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے تو ولی یا جماعت اس کے حق تصرّف کو واپس لے سکتی ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ[1] الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّ ارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۝ (۴/۵)

اور سفیہ لوگوں کو تم اپنے اموال نہ دو جنہیں خدا نے تمہارے لئے قیام کا باعث بنایا ہے بلکہ اس میں انہیں کھانے پہننے کے بقدر ہی دو۔

اس آیت میں یہ امر واضح کر دیا گیا ہے کہ تصرّف کا حق انسان کو اسی وقت مل سکتا ہے جبکہ وہ ہوش وخرد کے

---

[1] یہاں اَمْوَالَكُمْ کا لفظ مزید دعوتِ فکر دے رہا ہے۔ سفہا کے اموال کو قرآن ان کے اموال قرار نہیں دیتا بلکہ (اموالکم) جماعت کے اموال قرار دیتا ہے۔

ساتھ اس فرض کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اگر کسی مالک میں یہ صلاحیت نہیں ہے تو ملکیت کے طبعی ثمرات یعنی حقوق تصرف موقوف ہو جاتے ہیں۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جس شخص کا کوئی بھی وارث نہ ہو تو امام ہی اس کا وارث ہوتا ہے یعنی وہ جماعت کا مال ہے جس پر فرد کو قبضہ حاصل تھا۔ جب اس کے بعد وہ منقطع ہو جاتا ہے تو مال اپنے اصلی سرچشمہ کی طرف لوٹ آتا ہے۔

یہ چیز واضح طور پر سمجھ لینی چاہیئے کہ فرد کے اندر یہ شعور ہی کہ وہ اس مال میں جو دراصل جماعت کی ملکیت ہے محض جماعت کی طرف سے نائب یا وکیل ہے۔ ان فرائض کو قبول کرنے پر مجبور کر سکتا ہے جو ایک نظام اس کے ذمے عائد کرتا ہے اور ان قیود کو منوا سکتا ہے جس سے وہ اس کے تصرفات میں حد بندیاں لگاتا ہے۔ ساتھ ہی جماعت کا یہ شعور کہ وہی اس مال کی اصلی مالک ہے، جماعت کو فرائض عائد کرنے اور حدود قائم کرنے کی جرأت دلا سکتا ہے۔ کیونکہ اسلام میں عینی ملکیت کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں بلکہ بعض اموال میں تو درحقیقت اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر زمین کو لے لیجئے۔ عقل اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی کہ کوئی انسان خود زمین کا مالک ہو سکتا ہے۔ انسان دراصل اس کی پیداوار اور غلہ کا مالک ہوتا ہے نہ کہ خود زمین کا۔ تو اعتبار محض انتفاع کا ہے۔ نہ کہ عینی ملکیت کا۔

اس کے بعد ایک اور بنیادی مسئلہ پر بھی غور فرمایئے کہ اسلام مال سے انتفاع کے لئے بھی اس کا روادار نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے ایک خاص گروہ میں قید ہو کر رہ جائے کہ ہر پھر کر انہیں میں گھومتا رہے اور دوسرے لوگ اس کو نہ پا سکیں۔ سورۂ حشر کی اس آیت پر غور فرمایئے۔

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ (۵۹)

تاکہ مال تم میں سے صرف دولتمندوں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔

اس نص کے ساتھ ایک واقعہ متعلق ہے جسے سمجھ لینے سے آیت کو سمجھ لینے میں ہمیں سہولت ہو گی۔

آپ کو معلوم ہے کہ مکۂ مکرمہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مہاجرین نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی، جو تنگدست تھے وہ اپنے ساتھ کیا مال لے کر آتے لیکن جو دولتمند تھے وہ بھی اپنا مال ساتھ نہیں لا سکے۔ لہٰذا دوسرے تنگدستوں کی طرح یہ بھی تنگدست ہی تھے۔ انصار نے انتہائی سخاوت کا مظاہرہ کیا اور اس بخل سے اپنے آپ کو بلند کر کے دکھا دیا جو انسانی نفس میں پوشیدہ ہے۔ انہوں نے ان مہاجرین کے ساتھ برادرانہ تعلقات قائم کئے اور ہر اس چیز میں جو ان کی ملکیت میں تھی ان کو برابر کا شریک کر لیا، حتیٰ کہ

مخصوص ترین اشیا تک میں بھی۔ یہ سب کچھ انہوں نے کسی جبر و اکراہ سے نہیں بلکہ نہایت خوش دلی اور فراخ حوصلگی کے ساتھ کیا۔ سورہ حشر میں ہے۔

یُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَیْهِمْ وَ لَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ

جو لوگ ان کی طرف ہجرت کرکے آئے ہیں انصار ان سے محبت کرتے ہیں اور جو اموال ان کو دیئے گئے ہیں ان کو مہاجرین کے حوالہ کر دینے سے اپنے سینوں میں تنگی محسوس نہیں کرتے بلکہ اپنی غرضوں پر ان کی ضرورتوں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ درحقیقت وہ خود ان چیزوں کے انتہائی محتاج ہیں۔

صحیح اعتقاد انسان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے حضرات انصار رضی اللہ عنہم اجمعین اس کا ایک کامیاب نمونہ تھے۔

مگر مدینہ منورہ کے مالداروں اور فقراء مہاجرین میں پھر بھی عدم توازن کی ایک خلیج حائل تھی۔ نبی صلعم انصار کی سخاوت اور دریا دلی کو دیکھ رہے تھے لہذا آپ اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے کہ جو کچھ وہ خود ہی کر رہے ہیں اس سے زیادہ کا ان سے مطالبہ کریں۔ تا آنکہ واقعہ بنی نضیر پیش آیا جس میں جنگ نہیں ہوئی۔ اس کا تمام فئے اللہ اور رسول (مرکز ملت) کی ملکیت قرار پایا۔ اس وقت حضور کی رائے ہوئی کہ مسلمانوں کی جماعت میں مالی اعتبار سے کسی قدر توازن قائم کر دیں چنانچہ بنی نضیر کا تمام فئے خصوصیت کے ساتھ مہاجرین ہی کو عطا کیا گیا۔ انصار میں سے فقط دو آدمی تھے جنہیں اس میں حصہ دیا گیا تھا کیونکہ وہ دونوں واقعی ضرورتمند تھے۔ اس واقعہ کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے:

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ ۙ كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْكُمْ ؕ وَ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۘ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا وَّ یَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۚ (۵۹/۸-۷)۔

مختلف آبادیوں کے جو اموال بطور فئے کے حاصل ہوں وہ صرف اللہ اور رسول (مرکز ملت) اور قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہیں۔ یہ حکم اس لئے ہے تاکہ دولت تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتی رہے (بلکہ معاشرہ میں مالی توازن قائم رہے) لہٰذا رسول جو کچھ تمہیں دیدے وہ لے لو، جو نہ دے اس سے باز رہو اور تقویٰ شعار بنو۔ (یاد رکھو خدا کا عذاب (نافرمانوں کے لئے) بڑا ہی سخت ہے۔ یہ اموال فئے صرف ان ضرورت مند مہاجرین کے لئے ہیں جن کو اپنے شہروں اور اموال و دولت سے بے دخل کرکے نکال دیا گیا ہے۔ وہ خدا کے فضل و رضا کے طالب اور خدا کے دین اور رسول کے (مشن کے) مددگار ہیں۔ یہی لوگ (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔

رسول اللہ صلعم کا اموال بنی نضیر میں یہ تصرف کہ انہیں صرف مہاجرین ہی میں تقسیم کرنا۔ قرآن کی طرف سے اس تصرف کی تصدیق و تائید اور پھر اس کی علت بیان کرنا کہ ایسا اس لئے ہے تاکہ دولت صرف چند دولتمندوں ہی میں سمٹ کر نہ رہ جائے کہ صرف ان کے درمیان ہی گردش کرتی رہے۔ مسئلہ کی حقیقت کو بالکل واضح کر دیتا ہے جس کے مزید بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں سے صراحتہً یہ اصول مستنبط ہو جاتا ہے کہ اسلام بنیادی طور پر اس کے خلاف ہے کہ دولت جماعت کے اندر چند ہاتھوں میں محبوس ہو کر رہ جائے اس کے برعکس اسلام کا منشا یہ ہے کہ جماعت کے مختلف اوضاع میں ایک قسم کا ایسا اعتدال پیدا کر دے کہ ملت میں مکمل توازن قائم رہے اور دولت صرف دولت مند لوگوں ہی میں گردش نہ کرتی رہے کیونکہ ایک جہت میں مال و دولت کے انبار جمع ہو جانا اور دوسری جہت سے بالکل سمٹ جانا بہت بڑے اجتماعی مفاسد کا باعث بن جاتا ہے جس سے جماعت کے مختلف طبقات میں حسد، کینہ، اور بغض و عناد کے جذبات پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ کچھ ایسے اموال بھی ہیں جن سے مفاد عام وابستہ ہوتا ہے اور افراد کے لئے ان کو کسی جہت سے بھی اپنے لئے مخصوص کر لینا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلعم نے اس قسم کی تین چیزوں کی تصریح فرما دی ہے۔ یعنی پانی۔ چارہ۔ اور آگ۔

الناس شرکاء فی ثلث، الماء والکلا والنار

تمام لوگ تین چیزوں میں شریک ہیں۔ پانی، چارہ، اور آگ۔

چونکہ عرب کے قدیم تمدن میں یہ تین چیزیں حیاتِ اجتماعی کی ضروریات میں شمار ہوتی تھیں لہذا ان تین چیزوں سے انتفاع حاصل کرنا پوری جماعت کا حق شمار کیا گیا ہے مگر ظاہر ہے کہ اجتماعی حیات کی ضروریات نہ ہر تمدن میں یکساں ہو سکتی ہیں نہ ہر زمانہ میں۔ قیاس، جو تشریع اسلامی کے اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے اس کی گنجائش رکھتا ہے کہ جو چیزیں بھی اس حکم میں داخل ہوں وہ تطبیق کے وقت اس میں شامل کر لی جائیں۔

لہذا اسلام میں انفرادی ملکیت کی طبیعی حقیقت کا خلاصہ یہ قانون ٹھہرا کہ مال عموماً جماعت کی ملکیت ہے اور انفرادی قبضہ مالکانہ نہیں بلکہ محض وکالۃً ہے جس کے لئے بہت سی شرطیں اور قیود ہیں۔ نیز بعض اموال کا شمار اموالِ عامہ میں ہو گا جن پر کسی شخص کی انفرادی تحویل بھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ ان انفرادی تحویلو کا بھی ایک حصہ ایسا ہے جو جماعت کا حق ہے اور جماعت اس حصہ کو افراد سے واپس لے کر ان طبقات پر خرچ کر دیتی ہے جنہیں اس کی ضرورت ہو تا کہ وہ اپنی حالت کو درست کر سکیں اور ان کی حالت کی درستگی سے جماعت کی مجموعی حالت درست ہو سکے۔"

(یہ ہے خلاصہ علامہ قطب کی بحث کا)

مذکورہ بالا بحث سے جو نتائج ہمارے سامنے آئے ہیں انھیں ایک مرتبہ پھر دہرا لیجئے تا کہ آگے بڑھنے میں آسانی ہو۔

(۱) اسلام نے اموال پر انفرادی ملکیت کے حق کو عینی ملکیت کی حیثیت سے قطعاً تسلیم نہیں کیا۔

(۲) جو اموال انفرادی تحویل میں ہوں ان پر افراد وکالتی حیثیت سے تصرف کا حق رکھتے ہیں ورنہ وہ سب جماعت کی ملکیت ہوتے ہیں۔

(۳) اموال کی دو قسمیں ہیں۔

(ا) جن پر وکالتی تحویل کا حق تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

(ب) جن پر یہ حق بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

(۴) جو اموال ایسے ہوں کہ ان سے مفادِ عام وابستہ ہو ان پر انفرادی تحویل کا حق تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

اب سے چودہ سو سال پہلے عرب کے قدیم تمدن میں حضور اکرم صلعم نے اس ضمن میں تین چیزیں۔ (پانی۔ چارہ۔ آگ) کی تعیین و تخصیص فرما دی تھی۔

(۵) اجتماعی حیات کی ضروریات تمام تمدنوں اور تمام زمانوں میں یکساں نہیں ہوسکتیں۔ ان تین چیزوں پر انفرادی تحویل کا حق تسلیم نہ کرنے کی علت چونکہ ان سے مفاد عام کا وابستہ ہونا ہے لہٰذا قیاس کو کام میں لاتے ہوئے اگر کسی دوسرے تمدن یا کسی دوسرے زمانے میں کچھ اور چیزیں ایسی ہوں جن سے جماعت عام کا مفاد وابستہ ہو تو ان کو بھی قیاساً اسی ذیل میں شامل کیا جائے گا۔

اس تمہید کے بعد آییے ہم دیکھیں کہ زمین کے متعلق عہدِ رسالت مآبؐ اور خلافتِ راشدہ میں کیفیت کیا تھی۔

عہدِ رسالت و خلفائے راشدین میں زمین کی حیثیت

جیسا کہ معلوم ہے اسلامی نظام کی پہلی تجربہ گاہ سرزمین عرب تھی۔ اگر ہم اس کو اور مختصر کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ مدینہ منورہ کی سرزمین تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ عرب کی سرزمین زیادہ تر سنگلاخوں اور ریگستانوں پر مشتمل ہے۔ پانی کی قلت۔ بلکہ میلوں تک نایابی کی بنا پر سرسبزی کہیں دیکھنے کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔ پورے جزیرۂ عرب میں طائف کا ایک حصہ ایسا ہے جسے سرسبز کہا جا سکتا ہے۔ مدینہ منورہ میں کھجوروں کے کچھ باغات اور کہیں کہیں جو کے چند کھیت نظر آسکتے تھے۔ باغات اور کھیت کے لفظ سے آپ اپنے ذہن میں اپنے ہاں کے باغات اور کھیتوں کا تصور نہ لے آئیں۔ مدینہ منورہ کے باغات ایسے ہی تھے کہ کہیں کہیں کھجوروں کے چند درخت لگا دیے گئے اور اس کو باغ کہہ دیا گیا۔ مدینہ منورہ کی یہ سرزمین آج بھی زائرین کے لئے وجہ شادابیٔ قلب ونگاہ ہے اس کی زرعی حیثیت ایسی نہیں ہے جس کا آج اندازہ نہ کیا جا سکے۔ یا جو حیثیت اس کو عہد رسالت میں حاصل تھی وہ آج بدل گئی ہو۔ مدینہ منورہ کے دو طرف کالے پتھروں کا وسیع وعریض سنگستان ہے جو حرہ کہلاتا ہے۔ یہ تمام علاقہ زراعت کے ناقابل اور بنجر ہے۔ باقی حصہ ایسا ہے کہ اس میں درخت وغیرہ لگائے جاسکتے ہیں مگر یہ حصہ بھی مسلسل ایسا نہیں ہے۔ کہیں کہیں قابلِ زراعت ٹکڑے آجاتے ہیں۔ بہر حال یہ وہ سرزمین تھی جسے اسلامی نظام کی اولین تجربہ گاہ بننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس زمین کا تصور اپنے ذہن میں رکھئے اور سوچئے کہ کیا اس علاقہ اور اس سرزمین کو مثال بنا کر اپنے موجودہ عہد کے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام کے لئے وجہ جواز نکالی جا سکتی ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ اس امر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جن لوگوں کے پاس یہ زمینیں تھیں وہ بمشکل خود ان کی ضرورتوں کو پورا کر سکتی تھیں۔ یہ لوگ تو دہی اپنے ہاتھوں سے ان میں کام بھی کرتے تھے۔ زمین کے مالک بن کر کام کئے بغیر زمین سے استفادہ کا طریقہ ان میں عموماً مروج

نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مدینہ کو کھیتی باڑی کرنے والے کسان، کاشتکار وغیرہ کے الفاظ سے یاد کیا جاتا تھا۔ قریشِ مکہ جو خود کو ایک تاجر قوم کے افراد سمجھتے تھے مدینہ والوں کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتے تھے۔ عام لڑائیوں یا مبارزت کے وقت قریشی بہادروں نے انصار مدینہ سے دو دو ہاتھ کرنا بھی گوارہ نہیں کیا اور جواب میں یہی کہا کہ ہم ان کسانوں سے مقابلہ کرنے میں اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں ابو جہل کو مرتے دم اگر افسوس تھا تو یہی کہ وہ کسانوں کے لونڈوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ چنانچہ اہلِ مدینہ کے اس پیشہ کے متعلق صحاح ستہ میں ابو ہریرہؓ کا یہ قول موجود ہے۔

کان یشغلھم عمل اراضیھم

ہمارے انصاری بھائیوں کو اپنی زمینوں پر کام کرنے سے فرصت نہیں ملتی تھی۔

مدینہ منورہ کے دو اہم قبیلوں اوس و خزرج میں سے قبیلۂ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذؓ کے متعلق امام سرخسیؒ نے نقل کیا ہے کہ

کھیتوں اور نخلستانوں میں کدال اور پھاوڑے سے کام کرنے کی وجہ سے ان کی ہتھیلیوں میں گٹے پڑ گئے تھے۔ (کتاب الکسب للسرخسی ضمیمہ مبسوط جلد ۳۰ صفحہ ۲۴۵)

جس قوم کے سرداروں کا یہ حال تھا ان کے عوام کا حال معلوم۔ البتہ مدینہ منورہ میں بنو حارثہ کا ایک قبیلہ ضرور ایسا موجود تھا جن کے قبضہ میں اپنی ضرورت سے زیادہ زمینیں تھیں۔ چنانچہ خود اس قبیلہ کے ایک فرد حضرت رافع بن خدیجؓ کا یہ قول بخاری میں موجود ہے۔

کنا اکثر الانصار مزارعا (بخاری)

تمام انصار میں سب سے زیادہ زرعی زمینیں ہمارے پاس تھیں۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قبیلہ کے لوگ اپنی زمینوں کو بٹائی پر دینے کے بھی عادی تھے۔ بہرحال اگرچہ چھوٹے پیمانہ پر ہی سہی مگر زمینداری سسٹم ان کے اندر موجود تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس قبیلہ کے سربرآوردہ لوگوں کو طلب فرمایا۔ بخاری میں حضرت ظہیرؓ (رافع ابن خدیجؓ کے چچا) کا یہ قول موجود ہے۔

رسول اللہؐ نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ اپنی زرعی زمینوں کے ساتھ تم لوگ کیا کرتے ہو؟

وہاں سے واپس آکر ظہیر اور ان کے بھائی نے اپنے خاندان کے لوگوں کو جو حضورؐ کا حکم پہنچایا ہے اس کے

الفاظ یہ ہیں۔ رافع بن خدیجؓ کہتے ہیں۔

میں نے اپنے دونوں چچاؤں (ظہیر اور مہیر) سے سنا جبکہ وہ دونوں اپنے محلہ والوں سے کہہ رہے تھے کہ زمین کو کرایہ پر بندوبست کرنے کی رسول اللہ صلعم نے ممانعت فرما دی ہے۔ (صحاح ستہ)

رافع ابن خدیجؓ اپنے ماموں سے نقل کرتے ہیں۔

میرے ماموں ایک دن آئے اور کہا کہ رسول اللہ صلعم نے ایک ایسی بات سے منع فرما دیا ہے جو تم لوگوں کے لئے زیادہ نفع بخش تھی مگر اللہ اور رسول کی فرمانبرداری ہمارے اور تمہارے لئے کہیں زیادہ نفع بخش ہے۔ رسول اللہ صلعم نے تہائی اور چوتھائی پر اور کرایہ پر زمینیں دینے سے بالکل منع فرما دیا ہے۔

(کنز العمال۔ صفحہ ۲۳۵)

شمس الائمہ سرخسیؒ نے امام محمدؒ کے حوالے سے اسید بن حضیر صحابیؓ یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

اے بنو حارثہ والو! آج تم پر بڑی مصیبت ٹوٹ پڑی۔ کرایہ پر زمینوں کا بندوبست کرنے سے رسول اللہ صلعم نے ممانعت فرما دی ہے۔ (مبسوط جلد ۲۳ صفحہ ۱۷)

رافع ابن خدیجؓ کی یہ روایتیں تمام صحاح ستہ میں مختلف الفاظ کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں یہ الفاظ ہیں۔

رسول اللہ صلعم نے زرعی زمینوں کو کرایہ پر بندوبست کرنے سے منع کر دیا ہے۔ (بخاری)

کہیں ان الفاظ میں ہے

رسول اللہ صلعم نے منع فرما دیا ہے کہ زمین کو بندوبست کر کے زمین کے مقابلہ میں کوئی معاوضہ یا کسی قسم کا کوئی حصہ لیا جائے۔ (مسلم وغیرہ)

کہیں یہ تصریحات ہیں۔

رسول اللہ صلعم سے پوچھا گیا کہ کیا تھوڑا بہت اناج بھی کاشتکار سے زمین کا مالک نہیں لے سکتا؟ فرمایا نہیں، پھر سوال کیا گیا کہ اچھا غلہ نہ سہی بھوسا تو لے سکتا ہے؟ فرمایا نہیں۔ (نسائی)

کہیں یہ بھی تفصیلات دی گئی ہیں۔

زمین کو چوتھائی، تہائی، یا اناج کی مقررہ مقدار پر بھی بندوبست کرنا جائز نہیں ہے۔ (ابو داؤد۔ و مسند احمد۔ و کنز العمال)

رہ گئی یہ صورت کہ زمین کو نقد رقم کے مقابلہ میں بندوبست کیا جائے تو اس کے متعلق رافع بن خدیجؓ رسول اللہ صلعم سے کچھ نقل نہیں کرتے۔ وہ محض اپنی رائے بیان کرتے ہیں اور ان کی یہ رائے مختلف اوقات میں مختلف ہوتی ہے۔ کبھی وہ فرماتے ہیں:۔

دینار اور درہم کی شکل میں زمین کو کرایہ پر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (بخاری)

مگر ساتھ ہی جب ان کے پوتے عمران بن سہل ان سے آکر عرض کرتے ہیں۔

کہ دادا جان! میں نے دو سو درہم پر اپنی زمین کرایہ پر دیدی ہے۔

تو وہ بایں الفاظ ان کو منع فرمادیتے ہیں:۔

اس طریقہ کو چھوڑ دو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمینوں کو کرایہ پر دینے سے منع فرمایا ہے۔

اس اختلاف رائے کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں نقدی بندوبست کا رواج نہیں تھا اس لئے صراحتہً حضورؐ سے اس کی ممانعت مروی نہیں تھی۔ لہذا کبھی وہ یہ خیال کرتے تھے کہ جس چیز سے رسول اللہ صلعم نے صراحتہً منع نہیں فرمایا اس سے ہم کیوں منع کریں اور کبھی وہ اصولی ممانعت کو سامنے رکھتے ہوئے اس سے منع فرمادیتے تھے۔ بخاری میں موجود ہے کہ رافع بن خدیجؓ سے نقدی بندوبست کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ

سونے چاندی پر بندوبست کرنے کا اس زمانہ میں رواج نہیں تھا۔

بہرحال جہاں رافع ابن خدیجؓ سے اس کی اجازت نقل کی جاتی ہے وہ ان کا اپنا قول ہے رسول اللہ کا نہیں۔ رہی یہ بات کہ بعض روایتوں میں رافعؓ ابن خدیجؓ نے اس اجازت کو رسول اللہ صلعم کی طرف بھی منسوب کیا ہے تو اس کے متعلق حافظ ابن حجرؒ نے تصریح کی ہے۔

دراصل راوی کو سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہے ورنہ درحقیقت یہ سعید بن المسیب کا قول ہے جسے راوی نے کچھ اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ یہ براہ راست رسول اللہ صلعم کا حکم معلوم ہوتا ہے۔

(فتح الباری - جلد ۵ - صفحہ ۲۰)

رافع ابن خدیجؓ کے علاوہ اسی مضمون کی حدیثیں دوسرے صحابہ سے بھی مروی ہیں - چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے منقول ہے۔

کچھ صحابہؓ کے پاس زائد از ضرورت زمینیں تھیں۔ پس رسول اللہ صلعم نے فرمایا جس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ زمین ہو اسے وہ خود ہی کاشت کرے یا اپنے کسی بھائی کو بخش دے یا اپنی زمین کو روکے رکھے۔ (بخاری و مسلم)

دوسری جگہ یہ الفاظ ہیں۔

عطاءؒ جابرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ لوگ تہائی چوتھائی اور نصف بٹائی پر زمینیں کاشت کے لئے دیا کرتے تھے۔ اس پر نبی صلعم نے فرمایا جس کے پاس زمین ہو اسے وہ خود کاشت کرے یا کسی کو بخش دے اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اپنی زمین کو روک رکھے۔ (بخاری، مسلم)

بخاری اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی اسی قسم کے الفاظ منقول ہیں۔ اسی مضمون کی روایات حضرت زید بن ثابت اور ثابت ابن الضحاکؓ اور ابو سعید خدریؓ سے بھی نقل کی جاتی ہیں۔ (ملاحظہ ہو مسلم۔ ابو داؤد۔ طحاوی وغیرہ)

یہاں تک آپ نے دیکھ لیا کہ رسول اللہ صلعم کے زمانے میں صورت حالات کیا تھی۔ زمین سے ہی اس لئے کہ اس سے انسان اپنی غذا پیدا کریں غذا پیدا کرنے کے لئے یہ زمینیں لامحالہ کسی نہ کسی کی تحویل میں ضرور دیجائیں گی ورنہ وہ خود پڑی پڑی غذا اگلنے سے رہیں چنانچہ آپ مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو جن لوگوں کے قبضہ میں زمینیں چلی آرہی تھیں آپ نے ان کو انہی کی تحویل میں رہنے دیا کیونکہ عام طور سے لوگوں کے پاس اپنی ذاتی ضرورتوں سے زیادہ زمینیں نہیں ہوتی تھیں اور جن لوگوں کے پاس زمینیں ہوتی تھیں وہ اپنے ہاتھوں سے اس میں کام کاج کرتے تھے۔ مدینہ منورہ میں صرف بنو حارثہ کا ایک قبیلہ ایسا تھا جن کے قبضہ میں اپنی ضرورت سے زیادہ کچھ زمینیں تھیں اور وہ بٹائی پر لوگوں کو زمینیں دیا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلعم کو معلوم ہوتا ہے تو آپ اس کو فوراً بند فرما دیتے ہیں۔ بٹائی پر دینے سے بھی اور کسی دوسری صورت میں کرایہ پر دینے سے بھی۔ نقد بندوبست کا اس زمانہ میں رواج موجود نہیں تھا لہٰذا اس کی ممانعت صراحتہً آپ سے نقل نہیں کی گئی لیکن نہی عن کراء الارض۔ نہی عن المزارعۃ وغیرہ عمومی ارشادات سے اس صورت کا حکم بھی صاف طور پر معلوم ہو سکتا ہے۔ زمین کو غلہ کی مقدار پر کاشت کے لئے دیا جائے یا روپیہ پیسہ پر، روح دونوں جگہ ایک ہی ہے لہٰذا حکم میں کوئی فرق نہیں ہو سکتا۔ رافع بن خدیجؓ نقد بندوبست کے متعلق حضورؐ کی ممانعت کی نفی کرتے ہیں جس کی وجہ وہ خود ہی بتا دیتے ہیں کہ آپ کے زمانہ میں اس کا رواج ہی نہیں تھا لیکن جب عملی طور پر خود ان کا پوتا ایسا کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کو اس سے روک دیتے ہیں اور استدلال میں حضورؐ کا وہی

عمومی حکم نقل فرماتے ہیں۔

یہ تھا نقشہ حضورؐ کی زندگی میں مدینہ منورہ کی زمینوں کا جس سے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام کی بو بھی نہیں آتی۔

بے محل نہ ہوگا اگر اسی سلسلہ میں واقعۂ خیبر کا تذکرہ بھی کر دیا جائے جو بہت سی غلط فہمیوں کا موجب بنا اور آج تک بنا چلا آرہا ہے۔ چنانچہ اس واقعہ کا تذکرہ امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

(۲) ابن عمرؓ ہی کی روایت ہے اور عبداللہ بن عباسؓ اور انس بن مالکؓ کی روایات اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ نبی صلعم نے خیبر پر حملہ کیا اس کا کچھ حصہ صلحاً فتح ہوا اور کچھ بزور شمشیر مغلوب ہوا۔ آنحضرتؐ نے آدھے علاقہ کو حکومت کی ضروریات کے لئے مخصوص فرما دیا اور آدھے علاقہ کو ۱۸ قطعات میں تقسیم کر کے ان مجاہدین پر بانٹ دیا جو غزوۂ خیبر میں شریک تھے (یعنی بحساب ۱۰۰ آدمی فی قطعہ) پھر آپ نے ارادہ فرمایا کہ معاہدہ کے مطابق یہودیوں کو وہاں سے نکال دیں۔ مگر یہودیوں نے آکر عرض کیا کہ آپ ہمیں یہاں رہنے دیں۔ ہم آپ کی طرف سے یہاں کاشت کریں گے آدھی پیداوار آپ لے لیجئے گا اور آدھی ہم لے لیں گے۔ آنحضرتؐ نے یہ دیکھ کر کہ آپ کے پاس کام کرنے والے آدمیوں کی کمی ہے، ان کی بات مان لی، اور ان سے فرمایا کہ ہم جب تک چاہیں گے تم کو رکھیں گے اور جب چاہیں گے تمہیں یہاں سے نکال دیں گے۔ چنانچہ ان شرائط پر آپؐ نے ان سے معاملہ طے کر لیا۔ وہ کاشتکاروں کی حیثیت سے خیبر میں کام کرتے تھے۔ آدھی زمین کی مالک حکومت تھی اور بقیہ نصف کے مالک وہ ۱۵ سو حصہ دار تھے جن پر ۱۸ قطعات تقسیم کئے گئے تھے۔ بٹائی کے معاہدہ کی رو سے جو نصف پیداوار وہاں سے آتی تھی اس کو حکومت اور حصہ داران کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ نبی صلعم کا اپنا حصہ بھی عام حصہ داروں کے ساتھ تھا۔ چنانچہ آپ اس میں سے ہر سال ایک خاص مقدار میں غلہ اور کھجوریں اپنی ازواج مطہرات کو برابر برابر دیا کرتے تھے۔ یہ بندوبست حضورؐ کے آخر حیات تک جاری رہا۔ اسی پر حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں عمل کیا۔ اسی پر حضرت عمرؓ اپنے ابتدائی زمانہ میں کاربند رہے۔ پھر جب یہودیوں نے خیبر میں باہم شرارتیں کیں اور حضرت عمرؓ کی رائے یہ ہوئی کہ معاہدے کے مطابق

ان کو وہاں سے نکال دیا جائے تو آپ نے اعلان کیا کہ خیبر میں جس جس کا حصہ ہے وہ جا کر اپنی اپنی زمین سنبھال لے۔ ازواج مطہرات کے سامنے حضرت عمرؓ نے یہ تجویز پیش کی کہ آپ میں سے جو پسند کریں وہ اتنی زمین لے لیں جس کی پیداوار اسی قدر ہو جس قدر غلہ اور ثمرہ آپ کو نبی صلعم کے زمانہ سے ملتا آرہا ہے اور جو چاہیں اپنے حصہ کی زمین حکومت کے انتظام میں رہنے دیں اور اتنا ہی غلہ اور ثمرہ حکومت سے لیتی رہیں۔ اس تجویز کے مطابق بعض ازواج مطہرات نے غلہ اور ثمرہ پسند کیا اور حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ رضی اللہ عنہما نے زمین لیلی اس کے بعد حضرت عمرؓ نے یہودیوں کو خیبر سے منتقل کر کے تیمار اور اریحا میں بسا دیا۔

(بخاری، مسلم، احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

یہ عہد نبوت و خلافت کے مشہور ترین واقعات میں سے ہے اور اس کی صحت میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اس میں صریح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ نبی صلعم نے خود بٹائی پر زمین کاشت کے لئے دی ہے اپنی طرف سے بھی حکومت کی طرف سے بھی اور ان پندرہ سو افراد کی طرف سے جن کا حصہ خیبر میں تھا۔ اس طریقہ پر آپ اپنے آخری لمحۂ حیات تک عامل رہے اور آپ کے بعد شیخین کا عمل بھی اسی پر رہا۔ کیا اس کے بعد بھی کسی کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ اسلامی قانون میں بٹائی پر زمین کاشت کے لئے دینا ممنوع تھا؟ (مسئلہ ملکیت زمین)

امیر جماعت اسلامی کی اس جسارت پر ہم کیا کہیں؟ انہیں شاید معلوم ہو کہ یہی واقعۂ خیبر ہے جس سے لفظ مخابرہ بنایا گیا ہے۔ مخابرہ کے معنی ہوتے ہیں خیبر جیسا معاملہ کرنا۔ اس سے پہلے خود مودودی صاحب صحاح ستہ کے حوالوں سے حضرت زید بن ثابت، جابر ابن عبداللہ۔ رافع بن خدیجؓ کی روایتوں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک نقل کر چکے ہیں کہ " نھی رسول اللہ صلعم عن المخابرۃ" جس کا ترجمہ ہوا۔ " رسول اللہ صلعم نے خیبر جیسا معاملہ کرنے سے منع فرمایا ہے" ــــ یہ روایات متعدد صحیح سندوں سے متعدد صحابہؓ سے خود صحیحین تک میں موجود ہیں۔ ان روایات میں مخابرہ کا لفظ خود بتلا رہا ہے کہ خیبر کا یہ واقعہ اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا (اور اس معاملہ ہی کے پیش نظر عربی زبان اسی واقعہ سے ایک لفظ بھی وضع کیا جا چکا تھا جو عام طور سے مستعمل تھا)۔ اس کے ساتھ ہی یہ لفظ یہ بھی بتا رہا ہے کہ خیبر کے معاملہ کی حیثیت کچھ اور تھی۔ وہ بٹائی پر بندوبست کرنا نہیں تھا ورنہ مخابرہ کے اس نئے لفظ کو استعمال کرنے کی

کوئی ضرورت ہی نہیں تھی جبکہ عربی زبان میں محاقلہ - مزارعہ جیسے دوسرے بہت سے الفاظ پہلے سے موجود تھے۔

آنحضرت صلعم نے کھجوروں اور زمین کی پیداوار کے نصف کی جو شرط عائد کی تھی وہ جزیہ کے طور پر تھی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تاریخ میں یہ کہیں موجود نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے اس کے علاوہ کوئی جزیہ لیا ہو یہاں تک کہ آپ اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور ابوبکرؓ و عمرؓ نے بھی نہیں لیا حتیٰ کہ حضرت عمرؓ نے ان کو جلاوطن کر دیا - اگر یہ جزیہ نہ ہوتا تو آیت جزیہ کے نزول کے بعد ان سے جزیہ ضرور لیا جاتا۔ (بحوالہ عینی شرح بخاری صفحہ ۲۲۴)

آپ اس نکتہ کو پھر سمجھ لیجئے کہ مودودی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ جنگ خیبر کے بعد یہودیوں کی زمین مسلمانوں کی ملکیت میں آگئی تھی اور انہوں نے (مسلمانوں نے) اسے یہودی کاشتکاروں کو بٹائی پر دیدیا تھا۔ اس سے وہ زمین کو بٹائی پر دینے کی سند میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن (جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے) اس زمین کو مسلمانوں نے اپنی ملکیت میں نہیں لیا تھا- وہ یہودیوں ہی کی ملکیت میں رہی تھی - اسلامی حکومت نے ان سے ذمی ٹیکس (نقدی کے بجائے) پیداوار کی شکل میں وصول کیا تھا- یہ بات (کہ زمین یہودیوں کی ملکیت میں رہی تھی) خود مودودی صاحب کو بھی تسلیم ہے - چنانچہ وہ اپنی کتاب <u>الجہاد فی الاسلام</u> میں لکھتے ہیں-

یہودیوں کے اخراج کا فیصلہ ہوگیا- لیکن ان مجرموں کو اس طرح جلاوطن نہ کیا گیا کہ ان کے اموال و اراضی پر قبضہ کرکے انہیں بیک بینی و دوگوش نکال دیا گیا ہو- جو کچھ وہ چھوڑ گئے اس کا پورا پورا معاوضہ بیت المال سے دیا گیا۔ (طبع دوم- صفحہ ۲۶۳)

اس سے واضح ہے کہ جنگ خیبر کے بعد یہودیوں کی زمین ان کی ملکیت ہی میں رہی تھی اس لئے جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں انہیں خیبر سے نکالنا پڑا تو انہیں اس زمین کی قیمت ادا کی گئی- چنانچہ مشہور مصری مصنف محمد حسین ہیکل، اپنی کتاب عمر فاروق میں لکھتے ہیں کہ

یہی کچھ ان یہودیوں کے ساتھ کیا گیا جو خیبر اور فدک میں باقی رہ گئے تھے- انہیں وہاں سے جلاوطن کرکے شام بھیج دیا گیا- ان کی زمینوں کی قیمت انہیں دیدی گئی اور ان میں سے کسی کے ساتھ بدسلوکی نہیں کی گئی۔ (صفحہ ۵۷۰)

یہ حقائق اس کی شہادت دیتے ہیں کہ جنگ خیبر کے بعد، یہودی اپنی زمین کے بدستور مالک رہنے دیئے گئے تھے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب وہ اپنی زمین کے مالک تھے تو ان سے بٹائی کا معاملہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بٹائی کا معاملہ مزارع مالک زمین سے کرتا ہے۔

یہاں تک کی تفصیلات سے آپ نے دیکھ لیا کہ رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک میں لوگوں کے پاس دو قسم کی زمینیں تھیں۔

(۱) وہ زمینیں جو اسلام لانے سے پہلے لوگوں کے قبضہ میں چلی آ رہی تھیں۔

(۲) جو بعد میں ضرورت کے لحاظ سے مرکز ملت کی طرف سے ضرورتمند مسلمانوں کو عطا ہوئیں۔

(۳) پہلی قسم کی زمینیں زیادہ تر اتنی ہی تھیں جو بمشکل اپنے قابض لوگوں کی ضروریات کو کافی ہو سکتی تھیں۔

(۴) صرف بنو حارثہ کے پاس ضرورت سے زیادہ زمینیں موجود تھیں اور وہ اپنی زمینیں بٹائی پر دینے کے عادی تھے۔

(۵) بٹائی پر دینے کے سسٹم کو رسول اللہ صلعم نے قطعاً بند فرما دیا اور حکم دیا کہ جس کے پاس فاضل زمینیں ہوں وہ اپنے دوسرے بھائیوں کو بخش دیں۔

(۶) حضرات صحابہؓ کی اطاعت و فرمانبرداری کو دیکھتے ہوئے یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ صحابہؓ نے اس پر عمل نہیں فرمایا ہوگا۔ اس لئے ایسا یقین کر لینے میں کوئی مانع نہیں ہے کہ ضرورت سے زیادہ زمینیں ضرورتمندوں کو فوراً دیدی گئی ہوں گی۔

(۷) جن لوگوں کے پاس زمینیں تھیں وہ خود ہی ان میں کام کرتے تھے۔

(۸) مرکز ملت کی طرف سے جن لوگوں کو زمینیں دی گئی تھیں وہ بھی خود ہی ان میں کام کرتے تھے۔ ان کو بٹائی پر نہیں دے سکتے تھے۔

(۹) خیبر کی زمینیں مسلمانوں میں تقسیم کر دی گئی تھیں اور وہ اپنی مقدار کے لحاظ سے ضرورت سے زیادہ نہ تھیں۔

(۱۰) خیبر کی زمینیں وہاں کے یہودی باشندوں کو مرکز ملت کی طرف سے بٹائی پر دی گئی تھیں مگر

یہ معاملہ بٹائی کا معاملہ نہیں تھا بلکہ خراج یا جزیہ وغیرہ کا کوئی معاملہ تھا۔

(۱۱) چونکہ خیبر کے اس معاملہ سے شبہ ہو سکتا تھا اس لئے رسول اللہ صلعم نے صراحت کے ساتھ صحابہؓ کو خیبر جیسا معاملہ کرنے کی ممانعت فرما دی تھی۔

اب اس کے بعد آپ یہ دیکھئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جن لوگوں کے پاس یہ زمینیں تھیں ان کی حیثیت کیا تھی؟ وہ ان پر بحیثیت کاشتکار کے قابض تھے یا بحیثیت مالک کے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ یہ زمینیں افراد ملت کی ملکیت متصور ہوتی تھیں یا مرکز ملت کی؟

اصولی طور پر ہم یہ چیز پہلے وضاحت سے بیان کر چکے ہیں کہ زمین تو زمین اسلام کسی قسم کی چیز میں بھی انفرادی ملکیت کو عینی ملکیت کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا۔ وہ انتفاع اور استفادہ کے لئے افراد کی تحویل میں وکالتی حیثیت سے اموال دیدینے میں مضائقہ نہیں سمجھتا مگر ملکیت بہرحال جماعت ہی کی رہتی ہے زمین بھی اصولی طور پر اس سے خارج نہیں ہے لیکن خصوصی طور پر زمین کے متعلق بھی ہمیں اس قسم کے اشارات ملتے ہیں جن سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ یہ زمینیں جو ان افراد کی تحویل میں تھیں وہ مرکز ملت ہی کی ملکیت متصور ہوتی تھیں نہ کہ افراد کی۔

(۱) عہد نبویؐ میں قابل کاشت زمینوں کی خرید وفروخت کی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔

(۲) جن لوگوں کے پاس ضرورت سے زیادہ زمینیں تھیں ان کو رسول اللہ صلعم نے تین باتوں کا اختیار دیا تھا۔ رافع ابن خدیجؓ کی یہ روایت پہلے گذر چکی ہے جس میں رسول اللہ صلعم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے۔

جس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ زمین ہو اُسے وہ خود ہی کاشت کرے۔ یا اُسے اپنے کسی بھائی کو بخشدے۔ یا اپنی زمین کو یونہی پڑا رہنے دے۔

تیسرا اختیار تو محض تہدیدی نوعیت کا ہے اصل میں دو ہی اختیار تھے یا وہ خود کاشت کریں یا اپنے کسی بھائی کو بخش دیں۔ اگر زمینوں کی بیع وفروخت بھی مشروع ہوتی تو تیسرا تہدیدی پہلو اختیار کرنے کے بجائے سیدھی بات یہ تھی کہ یوں کہا جاتا کہ وہ دوسرے کسی بھائی کو قیمتاً فروخت کردے، یہ صورت زیادہ سہل، آسان اور قابل قبول ہو سکتی تھی مگر اس صورت کا اختیار نہیں دیا گیا۔

(۳) عہد رسول اللہ صلعم میں مملکت کا قانون یہ تھا کہ جو شخص تین سال تک اپنی زمین کو بیکار و معطل

چھوڑے رکھے، حکومت اس زمین کو واپس لیلے اور کسی دوسرے آدمی کے حوالہ کر دے۔ چنانچہ علامہ ابن عبید لکھتے ہیں۔

ایک صحابیؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین عطا کی تھی لیکن وہ اس کو آباد نہ رکھ سکے۔ اس وجہ سے حضرت عمرؓ نے یہ زمین ان سے واپس لے لی اور حاجتمندوں میں تقسیم کر دی۔
(کتاب الاموال لابن عبید صفحہ ۲۹۰)

قرنِ اوّل میں زرعی نظام

[ہماری تاریخ میں قرنِ اوّل کے زرعی نظام کا جو خاکہ ملتا ہے مولانا محمد تقی امینی صاحب کے اس مضمون میں اسے سامنے لایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس تمہید کو پیشِ نظر رکھئے جو سابقہ مضمون کے شروع میں لکھی گئی ہے]۔

اسلام ایک عالمگیر انقلاب کی شکل میں امانت و عدالت، افادیت و رحمت اخوت و مساوات اور ایثار و قربانی کا پیام لے کر وادئ "غیر ذی زرع" سے نمودار ہوا، اور کچھ ہی عرصہ کے بعد اس نے دنیا کی زہریلی ہواؤں کو نسیم سحر کے جھونکوں میں تبدیل کر دیا اور ایک فضا پیدا کر دی کہ نہ تو ملکیت کی آڑ میں جور و استبداد کی گنجائش باقی رہ گئی اور نہ روٹی کی خاطر انسان غیر اللہ کی غلامی پر مجبور رہا۔ اس نے ذرائع پیداوار کی تنظیم و تقسیم میں مذہب و ملت کا فرق کئے بغیر ضرورت و صلاحیت اور حسنِ عمل کو ملحوظ رکھا۔ اور اپنے زمانہ کے زمیندارانہ و جاگیردارانہ نظام کو ختم کر کے ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی جس میں زمین کی ملکیت کا تصور نہیں بلکہ اس کے امانت ہونے کا تصور غالب تھا۔

چنانچہ خلافت الٰہی میں ایک قسم ان اراضی کی ملتی ہے جو مفادِ عامہ کے پیش نظر خلافت کی جانب سے لوگوں کو دی جاتی تھیں جس کو عربی زبان میں "قطائع" کہتے ہیں۔ اس انتظام کی دو صورتیں رائج تھیں۔

(۱) کاشت کے لئے کسی کو زمین دی جاتی تھی اور وہ خود اس زمین پر کاشت کرتا تھا۔

(۲) اگر مفادِ عامہ کی کوئی خدمت سپرد ہونے کی بنا پر وہ خود کاشت نہ کر سکتا تو دوسرے کے ذریعہ

کاشت کراتا تھا اور آمدنی یا پیداوار میں دونوں شریک ہوتے تھے۔

خلافت کی جانب سے اس عطیہ کی کبھی تو یہ شکل ہوتی کہ اس کو صرف زمین کی منفعت کا مالک بنادیا جاتا اور ذاتِ زمین پر کسی قسم کے تصرف بیع ہبہ وغیرہ کا اختیار نہ ہوتا تھا۔ اور کبھی زمین اور اس کی منفعت دونوں کا مالک بنادیا جاتا تھا۔ اس آخری صورت میں ہر قسم کے تصرفات بیع، ہبہ وغیرہ کے اختیارات بھی اس کو حاصل ہوتے تھے۔

لیکن قطائع کی کوئی شکل بھی سرکاری قانون اور ٹیکس سے مستثنیٰ نہ تھی بلکہ اجتماعی مفاد کے لئے خلیفہ کے اختیارات بہ نسبت دوسری زمینوں کے "قطائع" پر زیادہ ہوتے تھے۔ چنانچہ انہی اختیارات کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیئے ہوئے بعض قطائع کو جلیل القدر صحابیوںؓ سے واپس لے لیا تھا، اور اس واپسی میں مفادِ عامہ کے علاوہ اور کوئی جذبہ کارفرما نہ تھا۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ نے مفادِ عامہ کی خاطر "قطیعہ" دیا تھا اسی طرح حضرت عمرؓ نے اسی کے پیشِ نظر واپس لے لیا تھا۔ دراصل قطائع دینے اور ان کے واپس لینے دونوں میں مفادِ عامہ کی روح کام کر رہی تھی۔

اس بحث کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت ہے تاکہ زمانۂ خلافت کے "قطائع" کی اصل حقیقت واضح ہوسکے اور یہ بھی معلوم ہوسکے کہ بعد میں اس کی اصل حقیقت کس قدر مسخ ہوئی اور اب اس لفظ کو موجودہ زمینداری و جاگیرداری کی حمایت میں کس بری طرح آلۂ کار بنایا جارہا ہے۔

زمانۂ خلافت کے قطائع کی اصلی شکل

خلافتِ الٰہی میں قطائع کی جو نوعیت تھی اُس کو سامنے رکھ کر ان کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے: "مفادِ عامہ کی خاطر غیر آباد زمین کو آبادکاری کے لئے کسی کو دینا اور حسبِ حاجت و مصلحت اس سے سرکاری ٹیکس وصول کرنا"۔

مندرجہ ذیل تصریحات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

اَلْاِقْطَاعُ اِعْطَاءُ الْاَرْضِ لِلْاِحْیَاءِ سَوَاءٌ وَجَبَ فِیْہِ الْعُشْرُ اَوِ الْخَرَاجُ[1]

"اقطاع" کسی کو آبادکاری کے لئے زمین دینا خواہ اس میں عشر واجب ہو یا خراج۔

علامہ مقریزیؒ اس سلسلہ میں کلامِ عرب کا یہ محاورہ نقل کرتے ہیں۔

---

[1] فیض الباری للعلامہ انور الکشمیری ج ۳ صفحہ ۳۰۰

اَقْطَعَهٗ نَهْرًا اَوْ اَرْضًا اَبَاحَ لَهٗ ذٰلِكَ

نہر یا زمین "قطیعۃ" دیا۔ یعنی اس کے لئے مباح کر دیا۔

علامہ بدرالدین عینیؒ شارح بخاری فرماتے ہیں۔

"قطائع" قطیعہ کی جمع ہے۔ خلیفہ کے قطائع دینے کی یہ شکل ہے کہ جس شخص میں وہ اہلیت وصلاحیت دیکھے اللہ کے اموال میں سے کچھ حصہ خلافت کی جانب سے اس کو عطا کر دے۔

اکثر اس لفظ کا استعمال زمین کے بارے میں آتا ہے اور اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔

(۱) یا تو زمین کی ذات اور منفعت دونوں کا مالک بنا دیا جاتا ہے۔

(۲) یا صرف زمین کی منفعت کا مالک بنایا جاتا ہے ذات کا نہیں[۱]۔

قاضی ابوبکر بن علیؒ شارح ترمذی کہتے ہیں۔

"اقطاع" ہبہ ہے جس میں ایک کا حصہ دوسرے شرکاء سے جدا کر دیا جاتا ہے کیونکہ اصولاً اراضی میں تمام لوگ برابر کے شریک ہوتے ہیں[۲]۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی کا بیان ہے۔

وَلِلسُّلْطَانِ اِقْطَاعُهٗ عَلَى الْمِلْكِ وَكَذَا عَلٰى عَدَمِهٖ[۳]

خلیفہ کو قطائع دینا جائز ہے چاہے تو زمین کا مالک بنا دے اور چاہے تو مالک نہ بنائے (صرف انتفاع کا موقع دے)۔

ان تمام تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خلافت الٰہی میں "قطائع" کی حقیقت صرف اتنی تھی کہ کسی شخص کو آبادکاری کے لئے خلافت کی جانب سے زمین دی جاتی تھی اور وہ زمین سرکاری قانون اور ٹیکس سے مستثنیٰ نہ ہوتی تھی بلکہ خلیفہ کے اختیارات اس پر بہ نسبت دیگر اراضی کے زیادہ ہوتے تھے۔ بعض متاخرین نے "قطائع" کی یہ تعریف کی ہے۔

هُوَ تَمْلِيْكُ الْاَرْضِ مَنْزُوْعَةً عَنِ الْمُؤْنِ فَلَا يَكُوْنُ فِيْهَا الْعُشْرُ اَوِ الْخَرَاجُ[۴]

"قطائع" کسی کو زمین کا اس طرح مالک بنا دینا کہ اس پر ٹیکس وغیرہ نہ عشر کی صورت میں واجب ہو اور

---

[۱] عمدۃ القاری ج ۶ ص ۳۰۶ [۲] ایضاً ص ۱۵۰ از فیض الباری۔ [۳] مسوی ص ۴۰۵ [۴] فیض الباری ج ۳ ص ۳۰۰

نہ خراج کی صورت میں۔

ظاہر ہے کہ "قطائع" کی یہ تعریف مذکورہ بالا تعریفوں سے کتنی مختلف اور حقیقت سے کس قدر دور ہے۔ زمانۂ خلافت میں نہ اس قسم کی تنظیم کا کوئی ثبوت ملتا ہے اور نہ یہ مزاج اسلامی ہی کے موافق بیٹھتی ہے۔ اسلام تو دراصل اسی قسم کی زیادتیوں کو ختم کرنے کے لئے آیا ہے نہ کہ ان کو باقی رکھنے اور رواج دینے کے لئے۔

احادیث و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تین قسم کی اراضی ایسی تھیں جو خلافت کی جانب سے لوگوں کو بطور "قطیعہ" دی جاتی تھیں۔

(۱) بنجر زمین جو ہمیشہ سے غیر مزروعہ اور غیر آباد چلی آتی تھی۔ ایسی زمینوں کی ویرانی اور سختی دیکھ کر عام لوگوں کو انہیں قابلِ کاشت بنانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ خلافت نے ایسی زمینوں کی طرف توجہ کر کے انھیں قابلِ کاشت بنانے کے لئے لوگوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ چنانچہ نقیع میں جو زمین حضرت زبیرؓ کو دی گئی تھی وہ اسی زمین سے تھی[1]۔

(۲) افتادہ زمین جس میں قابلِ زراعت ہونے کے باوجود کسی وجہ سے کاشت نہ ہوتی تھی اس میں تمام وہ زمینیں شامل تھیں جو بستیوں کے اجاڑ ہو جانے کے بعد بیکار پڑی رہتی تھیں اور انہیں کوئی آباد کرنے والا نہ رہ جاتا تھا۔ مدینہ کی وہ زمینیں بھی اسی میں شامل تھیں۔ جو آبپاشی کی دشواری کی وجہ سے رسول اللہؐ کے حوالہ کر دی گئی تھیں اور ان کو آپ نے لوگوں میں زراعت کی خاطر تقسیم کر دیا تھا۔ چنانچہ بلال بن حارث کو رسول اللہؐ نے وادی عقیق اسی زمین سے عطا فرمائی تھی[2]۔

(۳) خالصہ زمین اس میں مفتوحہ علاقوں کی تمام وہ زمینیں شامل ہوتی تھیں جو خلافت کے لئے خالصہ قرار دی جاتی تھیں۔ ایسی زمینوں کی کئی قسمیں تھیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

ا ۔ جن زمینوں کے مالک جنگ میں مارے جاتے۔

ب ۔ یا بھاگ جاتے۔

ج ۔ شاہی جاگیریں جو بادشاہ کے صرفِ خاص کے لئے "خالصہ" ہوتی تھیں۔

د ۔ شاہی خاندان اور امراء کی جاگیریں۔

ہ ۔ ترائی، جھیلیں، جھاڑیاں وغیرہ۔

یہ اور اسی قسم کی تمام وہ زمینیں جن پر چند افراد قابض ہو کر عیش کرتے تھے اور اسلامی غلبہ کے بعد

---

[1] الاحکام السلطانیہ ماوردی ص ۱۰۳ [2] الاموال ابی عبید ص ۲۸۲۔

ان کا کوئی مالک اور آباد کرنے والا نہ رہ جاتا تھا۔ ایسی تمام زمینیں خلافت کے لئے "خالصہ" ہو کر مفاد عامہ کے لئے وقف ہو جاتی تھیں[1]۔

ابو عبیدؒ "خالصہ" زمین کی تفصیل بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

فَلَمْ يَبْقَ بِهَا سَاكِنٌ وَلَا لَهَا عَامِرٌ فَكَانَ حُكْمُهَا إِلَى الْإِمَامِ[2]

مذکورہ خالصہ زمینوں میں نہ کوئی رہنے والا باقی رہتا تھا اور نہ آباد کرنے والا اس لئے ان کا معاملہ خلیفہ کے سپرد ہو جاتا تھا۔

قاضی ابو یوسفؒ فرماتے ہیں۔

وَذٰلِكَ بِمَنْزِلَةِ الْمَالِ الَّذِي لَمْ يَكُنْ لِأَحَدٍ وَلَا فِي يَدِ أَحَدٍ[3]

ایسی زمین کی حیثیت اس مال جیسی ہوتی تھی جو نہ کسی کا ہو اور نہ کسی کے قبضہ میں ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ زمانۂ خلافت میں انہی زمینوں سے "قطائع" دیئے جاتے تھے جو نہ تو کسی کے قبضہ میں ہوتیں اور نہ کوئی ان کا مالک اور وارث ہوتا۔ نہ کسی کے آباد کرنے کا کوئی نشان ہوتا اور نہ ایسی زمین ہوتی جو قانوناً کسی کو نہ دی جا سکتی تھی مثلاً چراگاہ، جنگل، نمک کی جھیل وغیرہ اور نہ ایسی صورت ہوتی جس میں کسی کے نقصان کا سوال پیدا ہوتا[4]۔

ایسی زمینوں کے متعلق دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ یا تو وہ بیکار پڑی رہتیں اور حقوق عامہ جو زمین سے متعلق ہیں وہ پامال ہوتے رہتے (۲) اور یا وہ صورت اختیار کی جاتی جو مفاد عامہ کے لحاظ سے مناسب اور بہتر ہوتی۔

خلافت نے نفع خلق کے پیش نظر دوسری صورت اختیار کی تھی، یہ اسی انتظام کا نتیجہ تھا کہ زمانہ خلافت میں تمام بنجر و افتادہ زمینیں آباد ہو گئی تھیں اور آباد شدہ زمینوں سے غلہ اُگلنے لگا تھا۔

قطائع لوگوں کو مفاد عامہ کے پیش نظر دیئے جاتے تھے

حکومتِ الٰہی میں قطائع دینے کا مقصد زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنا اور خلق اللہ کا عام مفاد ہوتا تھا۔ جب تک یہ مقصد پورا ہوتا رہتا خلافت کو دخل دینے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی تھی لیکن اگر اس میں

---

[1] الاموال ص ۲۸۲ و الخراج ص ۵۷ و ۵۸ [2] الاموال ص ۲۸۲ [3] الخراج ص ۵۰ [4] الخراج ص ۵۹ و الاموال صفحہ ۲۷۲ و ۲۷۳۔

کوتاہی ہوتی یا اور کوئی عمدہ صورت اراضی کے تنظیم کی سامنے آتی جس میں نفع خلق زیادہ معلوم ہوتا تو خلافت کو بے دخل کرنے کا پورا حق حاصل ہوتا تھا۔

چنانچہ تاریخ میں چند ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں بلا پس وپیش اسی نظریہ کے ماتحت صاحبِ زمین کو بیدخل کر دیا گیا تھا۔ چند واقعات یہ ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث کو پوری "وادی عقیق" دیدی تھی لیکن وہ اس کا بڑا حصہ آباد نہ کر سکے تھے۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا کہ رسول اللہؐ نے آپ کو یہ زمین اس لئے نہ دی تھی کہ نہ خود آباد کریں اور نہ دوسروں کو آباد کرنے دیں لہذا جتنی زمین آپ آباد کر سکتے ہوں اپنے پاس رکھئے اور بقیہ خلافت کے حوالے کر دیجئے۔

یہ سن کر حضرت بلالؓ نے کہا کہ میں رسول اللہؐ کی دی ہوئی زمین کبھی واپس نہ کروں گا خواہ میں اسے آباد کروں یا نہ کروں۔ حضرت عمرؓ نے واپسی پر اصرار کیا اور بالآخر آباد شدہ حصہ کو چھوڑ کر بقیہ زمین واپس لیلی[1]۔

اس موقع پر قابلِ غور بات یہ ہے کہ بلال بن حارثؓ رسول اللہؐ کے قریب ترین صحابی تھے اور یہ تھیں زمین کا عطیہ خود رسول اللہؐ نے عطا فرمایا تھا جس کی بنا پر اس عطیہ کے ساتھ خصوصی لگاؤ ہونا فطری بات تھی۔ مگر حضرت عمرؓ نے مفادِ عامہ کے لئے بلالؓ جیسے جلیل القدر صحابی کا خیال کیا اور نہ اس جذبہ کا کہ رسول اللہؐ کا دیا ہوا عطیہ کس طرح واپس لیا جائے۔

اس واقعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حکومتِ الٰہی میں خلیفۃ اللہ کے سامنے خلق اللہ کا عام مفاد ہوتا تھا۔ وہ اس کے لئے نہ اپنے بزرگ ساتھیوں کے ساتھ کسی قسم کا ترجیحی سلوک کرنے کے لئے تیار ہوتا تھا اور نہ محض جذباتی امور سے متاثر ہو کر عام مفاد کو نظر انداز کر سکتا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ جب رسول اللہؐ کا دیا ہوا عطیہ مفادِ عامہ کے پیشِ نظر بلالؓ جیسے جلیل القدر صحابی سے واپس لیا جا سکتا ہے تو دیگر نا اہل لوگوں کے پاس سے بیکار زمین یا اُن کی ضرورت سے زائد زمین واپس لینے میں کیسے غور و فکر کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ اور اس میں حقوقِ ملکیت کا "گورکھ دھندا" کیسے حائل بن سکتا ہے۔

(۲) رسول اللہؐ نے ایک اور شخص کو زمین دی تھی۔ حضرت عمرؓ نے زمین کے آباد شدہ حصہ کو چھوڑ کر بقیہ زمین لیلی تھی[2]۔

(۳) قوم بجیلہ کا واقعہ ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ حضرت عمرؓ نے خالصہ

---

[1] الاموال ۔ص ۲۹۰ ۔ والخراج یحییٰ ۔ص ۹۳ ۔ ۹۴ [2] خراج یحییٰ ۔ص ۸۷ ۔

زمین کا کچھ حصہ انہیں دیدیا تھا، اور دو تین سال تک وہ اس کو آباد کرتے رہے تھے لیکن جب خلق خدا کے نفع کی اس سے عمدہ صورت سمجھ میں آئی تو خلافت نے بلا پس و پیش وہ زمین ان لوگوں سے واپس لے لی تھی۔

(۴) حضرت عمرؓ اور عمر بن عبد العزیزؒ کا عام قانون کے ماتحت مسلمانوں کو زمین کی جائیداد سے بیدخل کر کے ان کا وظیفہ مقرر کر دینا[1] اس بات کی شہادت کے لئے کافی ہے کہ حکومت الٰہی میں قطائع دینے کا سلسلہ عام مفاد کے پیش نظر ہوتا تھا جب تک یہ مقصد پورا ہوتا رہتا قطائع باقی رکھے جاتے تھے ورنہ جس صورت کے اختیار کرنے میں نفع خلق زیادہ نظر آتا حتیٰ الامکان ذاتی مفاد کو ملحوظ رکھ کر وہی صورت اختیار کرنے کی پوری گنجائش ہوتی تھی۔

اس نظریہ کی مزید وضاحت ان اصول سے ہوتی ہے جو قطائع کے بارے میں نافذ تھے اور اس طرزِ عمل سے بھی ہوتی ہے جو خلفاء کا اس سلسلہ میں تھا۔

قطائع کن لوگوں کو دیئے جاتے تھے

حکومتِ الٰہی میں انہی لوگوں کو قطائع دیئے جاتے تھے جو کاشتکار ہوتے یا جن کے ذمہ مفادِ عامہ کی کوئی خدمت سپرد ہوتی تھی جس کی بنا پر وہ خود کاشت نہ کر سکتے بلکہ دوسروں سے کاشت کرا کے اس کے ذریعہ اپنی گذر بسر کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں علامہ مقریزی اور قاضی ابو یوسف یہ کلیہ بیان کرتے ہیں۔

قَدْ أَقْطَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ تَأَلَّفَ عَلَى الْإِسْلَامِ أَقْوَامًا وَ أَقْطَعَ الْخُلَفَاءُ مَنْ رَأَوْا أَنَّ فِيْ إِقْطَاعِهِ صَلَاحًا[2]

پیغمبرِ اسلام اور آپ کے جانشینوں نے انہی لوگوں کو قطائع دیئے تھے جن کے دینے میں ملک و ملت کی بھلائی ہوتی تھی اور قطائع دینے میں تالیفِ قلوب مقصود ہوتی تھی۔

علامہ بدر الدین عینی فرماتے ہیں: "خلیفہ کے قطائع دینے کی شکل یہ ہے کہ اللہ کے مال سے وہ ان لوگوں کو عطایا دے جن میں اس کی اہلیت و صلاحیت دیکھے[3]"۔

زمانۂ خلافت میں جن کو قطائع دیئے جاتے تھے ان کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ جن میں آبادکاری اور کاشتکاری کی صلاحیت ہوتی تھی۔

---

[1] تفصیل ذرا آگے چل کر ملے گی۔ [2] الخراج ص ۶۱ و الخطط للمقریزی ج ۱ ص ۹۵ [3] عینی ج ۶ ص ۳۶

۲۔ جن کے سپرد مفادِ عامہ کی کوئی خدمت ہوتی تھی۔

۳۔ فوجی اور تمام وہ لوگ جو ملک و قوم کی حفاظت پر مامور ہوتے تھے۔

۴۔ نومسلموں کو تالیفِ قلوب کے لئے قطائع دیئے جاتے تھے۔

بسا اوقات لوگ اسلام قبول کرکے اپنے آپ کو نادار اور محتاج پاتے تھے اور ان کے پاس گذر و بسر کی کوئی شکل نہ رہ جاتی تھی۔ ایسی صورت میں خلافت انہیں قطائع دے کر کسبِ معاش کے قابل بناتی تھی۔ اس حسنِ سلوک سے ایک طرف تو یہ ہوتا تھا کہ نومسلموں کو اسلام قبول کرنے کے بعد معاشی پریشانیوں سے دو چار نہیں ہونا پڑتا تھا اور وہ مطمئن ہو کر خدمتِ خلق اور رحمتِ الٰہی کو عام کرنے میں اپنی توجہ خرچ کرتے تھے اور دوسری طرف یہ کہ غیر مسلموں کو یہ حُسنِ سلوک دیکھ کر سوچنے اور سمجھنے کا موقع ملتا تھا اور اسلام قبول کرنے کے لئے راہیں کھلتی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خلافت کے پیشِ نظر، قطائع کا مقصد اللہ کی مخلوق کے لئے زیادہ سے زیادہ پیداوار بڑھانا اور عام خوشحالی کی فضا پیدا کرنا ہوتا تھا اس لئے بالعموم انہی لوگوں کو قطائع دیئے جاتے جو زمین کو زیرِ کاشت لاکر پیداوار بڑھا سکتے تھے۔ اور اگر کوئی خدمت سپرد ہونے کی بنا پر خود کاشت نہ کرسکتے تو دوسروں کے ذریعہ کاشت کرا کے اس مقصد کو پورا کرتے تھے۔ جیسا کہ قاضی ابو یوسفؒ نے فرمایا۔

وَ لَوْ لَا ذٰلِكَ لَمْ يَأْتُوْهُ وَ لَمْ يُقْطِعُوْا حَقَّ مُسْلِمٍ وَلَا مُعَاهِدٍ[1]

(اگر یہ مقصد نہ ہوتا تو رسول اللہؐ اور خلفاء کسی کو کسی مسلمان یا معاہد کا حق نہ دیتے (اس لحاظ سے کہ زمین میں سب شریک ہیں)۔

باقی رہی یہ بات کہ زمانۂ خلافت میں ایک شخص کو زمین کی کتنی مقدار دی جاتی تھی اس سلسلہ میں تاریخِ خلافت کا مطالعہ کرنے سے پہلے بنیادی حیثیت سے چند باتیں لائقِ توجہ ہیں۔

۱۔ اس زمانہ میں بنجر اور افتادہ زمینیں بکثرت تھیں اور آباد کرنے والے کم تھے۔

۲۔ پیداوار آج کے مقابلہ میں کم تھی خصوصاً عرب کی زمینوں کی۔

۳۔ رسول اللہؐ اور اور ابوبکرؓ کے زمانۂ خلافت تک فوجیوں اور دیگر کارپردازوں کی تنخواہیں مقرر نہیں ہوتی تھیں۔

---

[1] مزید تحقیق و تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ الخراج ص ۶۰ و ۶۱ و ۶۲ والاموال ص ۷۹ و ۸۰ و ۸۱ و ۲۸۲۔

۴۔ حضرت عمرؓ نے رجسٹر مرتب کر کے تنخواہوں اور وظیفوں کا باقاعدہ انتظام کیا تھا۔

۵۔ تنخواہ اور وظیفہ مقرر نہ ہونے کی صورت میں ان لوگوں کے لئے جن کے ذمہ مفادِ عامہ کی خدمت سپرد ہوتی تھی دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ (۱) ڈیوٹی چھوڑ کر خود کاشت کے ذریعہ اپنی گذر بسر کرتے۔ (۲) یا زمین کاشتکاروں کے حوالہ کر کے پیداوار میں یا اس کی آمدنی میں دونوں شریک ہوتے اور اس طرح کاشتکار اور صاحبِ زمین دونوں حسبِ حیثیت مفادِ عامہ کی خدمت کرتے رہتے۔

۶۔ تنخواہوں اور وظیفوں کے مقرر ہو جانے کے بعد حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کی زمین جائیداد کے بارے میں جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا جس کی تفصیل ذرا آگے چل کر آتی ہے وہ قابلِ غور ہے۔ مزید وضاحت کے لئے چند واقعات یہ ہیں۔

(الف) صدیق اکبرؓ نے حضرت طلحہؓ کو قطیعہ دیا تھا اور اس پر چند لوگوں کو گواہ بنا کر حکمنامہ ان کے حوالہ کر دیا تھا ان گواہوں میں حضرت عمرؓ کا نام بھی تھا۔ حضرت طلحہؓ حسبِ دستور حضرت عمرؓ کے پاس حکمنامہ پر دستخط کرانے کے لئے گئے تو انہوں نے یہ کہہ کر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اَ هٰذَا كُلُّهُ لَكَ دُوْنَ النَّاسِ ؟

کیا یہ سب آپ ہی کو مل جائے اور دوسرے لوگ محروم رہیں۔

اس کے بعد حضرت طلحہؓ غصہ میں بھرے صدیق اکبرؓ کے پاس آئے اور کہا:

وَ اللّٰهِ مَا اَدْرِيْ اَنْتَ الْخَلِيْفَةُ اَمْ عُمَرُ؟

واللہ میں نہیں سمجھ سکا کہ کون خلیفہ ہے آپ ہیں یا عمر

حضرت صدیق اکبرؓ نے جواب میں کہا بَلْ عُمَرُ (بلکہ عمر ہیں)۔

الغرض حضرت عمرؓ کی مخالفت کی وجہ سے صدیق اکبرؓ کا یہ حکم منسوخ کر دیا گیا تھا[1]

(ب) حضرت عیینہؓ کو صدیق اکبرؓ نے قطعیہ دیا تھا۔ جب وہ دستخط کرانے حضرت عمرؓ کے پاس گئے تو انہوں نے دستخط سے انکار ہی نہیں کیا بلکہ لکھے ہوئے حکم کو مٹا دیا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر حضرت عیینہؓ حضرت صدیق اکبرؓ کے پاس آئے اور دوسرا حکمنامہ لکھ کر دینے کی درخواست کی۔ صدیق اکبرؓ نے ان سے جواب میں فرمایا۔

---

[1] الاموال۔ ص ۲۸۳

وَاللّٰهِ لَا أُجَدِّدُ شَيْئًا رَدَّهُ عُمَرُ[1]

واللہ میں وہ کام دوبارہ نہ کروں گا جس کو عمرؓ نے رد کیا ہو۔

یہ بات کہ حضرت عمرؓ نے دستخط سے کیوں انکار کیا تھا جبکہ رسول اللہ اور ابوبکرؓ اور خود عمرؓ سے قطیعہ دینا ثابت ہے اس کی وجہ حضرت عمرؓ نے خود ہی ان الفاظ میں بیان کر دی تھی۔

أَهٰذَا كُلُّهُ لَكَ دُونَ النَّاسِ ؟

کیا یہ سب آپ ہی کو مل جائے اور دوسرے محروم رہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ صدیقؓ وفاروقؓ دونوں کا ایک ہی مقصد تھا یعنی قطائع دے کر زمین کو زیرِ کاشت لانا تاکہ خلق اللہ کے لئے زیادہ سے زیادہ غذا مہیا ہو سکے مگر یہ بات ہر وقت دونوں کو ملحوظ رہتی تھی کہ زمین چند افراد کے ہاتھ میں پڑ کر ان کے عیش و آرام طلبی کا سامان نہ بن جائے یا انتظام نہ ہو سکنے کی وجہ سے بیکار نہ پڑی رہے۔ اور حقوقِ عامہ جو زمین سے متعلق ہیں وہ پائمال ہوتے رہیں۔ اس لئے قطائع دینے میں یہ احتیاط ضروری تھی کہ صرف انہی لوگوں کو دیئے جائیں جو اس کے اہل تھے اور اس مقدار میں دیئے جائیں جن کو زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد بنایا جا سکے۔

مذکورہ صورتوں میں حضرت عمرؓ نے جب دستخط سے انکار کیا تھا تو صدیق اکبرؓ کے سامنے یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ حضرت عمرؓ کے انکار کی یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ یہ زمین کسی حیثیت سے مفادِ عامہ کے خلاف جا رہی ہے اور فلاں شخص کو قطیعہ دینے میں کسی حد تک مقصد کی پائمالی ہو رہی ہے ورنہ حضرت عمرؓ کو انکار کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس لئے حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پہلے حکم کو منسوخ قرار دے کر دوسرا حکمنامہ لکھنے کی درخواست رد کر دی تھی۔

حکومتِ الٰہی میں نہ تو کسی فرد کو بیکار رہنے دیا جاتا تھا اور نہ دوسرے کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کسی کو عیش و عشرت کا موقع دیا جاتا تھا۔ اگر کسی فرد میں کاشتکاری کی اہلیت و صلاحیت دیکھی جاتی تو زمین اس کے حوالہ کر کے اسے خلق اللہ کی خدمت پر مامور کر دیا جاتا تھا، اور اگر وہ شخص دیگر مفادِ عامہ کے کاموں کے لئے موزوں ہوتا تو اس مقدار میں قطیعہ دیئے جاتے تھے کہ وہ دوسروں کے ذریعہ کاشت کرا کے اپنی گذر بسر کے لائق آمدنی یا پیداوار حاصل کر سکے تاکہ اس کو دیگر کام اطمینان کے ساتھ انجام دینے میں سہولت ہو۔ ایسی صورت میں کاشتکار اپنی صلاحیت

---

[1] الاموال - ص ۲۸۳

کے مطابق خدمتِ خلق کرتا تھا اور صاحبِ زمین اپنی صلاحیت کے مطابق اس فرض کو انجام دیتا تھا۔ نہ کوئی شخص بیکار رہنے پاتا تھا اور نہ کسی کو اس کی صلاحیت اور طبیعت کے خلاف ڈیوٹی سپرد کی جاتی تھی۔ اس سے ایک طرف تو یہ ہوتا تھا کہ ہر شخص مفادِ عامہ کے کاموں میں لگا رہتا تھا اور سب کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام پاتے رہتے تھے اور دوسری طرف یہ کہ ہر شخص اپنی ضمیر کی آزادی اور صلاحیت کے لحاظ سے اپنی اپنی لائن میں زیادہ سے زیادہ ترقی کرتا تھا۔ نہ کسی کے ذہنی طور پر خودکشی کا سوال پیدا ہوتا تھا اور نہ کسی کو مزاج اور طبیعت کے خلاف محض سرمایہ اور روپیہ کی خاطر کسی کام کے کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ غرض زمانۂ خلافت میں جماعت جماعتی حیثیت سے خوش تھی اور فرد اپنی انفرادی حیثیت سے خوش تھا۔ نہ فرد کو جماعت سے شکایت تھی اور نہ جماعت کو فرد پر اعتراض تھا۔

قطائع کے بارے میں اسی پوزیشن کو واضح کرنے کے لئے علامہ بدرالدین عینیؒ نے فرمایا۔

يَجُوْزُ لِلْجُنْدِيِّ الَّذِيْ يُقْطَعُ لَهٗ اَنْ يُؤْجِرَ مَا اُقْطِعَ لَهٗ [1]

لشکری اور فوجی کے لئے اپنے قطائع کرایہ پر دینا جائز ہے۔

اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں

وَلَا يُقْطَعُ اِلَّا قَدْرَ مَا يَتَأَتّٰى الْعَمَلُ عَلَيْهِ [2]

اسی مقدار کا قطیعہ دیا جائے جس پر اس کا کام کرنا آسان ہو۔

پھر کہتے ہیں۔

امام را باید کہ اقطاع کند بقدرِ حاجت [3]

خلیفہ کو بقدرِ ضرورت قطیعہ دینا چاہیئے۔

ان تصریحات سے دو باتیں واضح ہوئیں (۱) پہلی تو یہ کہ حاجت و ضرورت سے زائد کسی کو قطیعہ نہ دیا جائے۔ (۲) دوسری یہ کہ بوقتِ ضرورت و مصروفیت اپنے قطیعہ کو کرایہ وغیرہ پر دیا جا سکتا ہے۔

قطائع پر خلافت کے اختیارات

زمانۂ خلافت کے دیئے ہوئے قطائع سرکاری قانون اور ٹیکس سے مستثنیٰ ہوتے تھے بلکہ بہ نسبت دیگر آراضی کے خلافت کے اختیارات قطائع میں زیادہ وسیع ہوتے تھے۔ کیونکہ خلافت کا براہِ راست تعلق "خالصہ" زمینوں سے ہوتا تھا اور قطائع بالعموم انہی زمینوں سے دیئے جاتے تھے۔ اس لئے ان کے نظام تنظیم و تقسیم میں خلافت کی ذمہ داری زیادہ تھی۔ جب اس میں خلافت کی ذمہ داری زیادہ ہوتی تھی تو اس کے اختیارات کا وسیع ہونا ایک فطری امر تھا تاکہ دونوں

[1] عمدۃ القاری ج ٦ ص ٣٦ - [2] مسوّی ص ٢٠٥ - [3] مصفّیٰ ص ٢٠٥ -

جانب توازن قائم رہ سکے۔ جیساکہ امام ابو یوسف اختیارات کی وسعت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"قطائع اگر عشری زمین سے دیئے گئے ہیں تو عشر واجب ہوگا اور خراجی زمین سے دیئے گئے ہیں تو خراج واجب ہوگا[1]"

پھر آگے چل کر اسی حقیقت کو ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں۔

جس کسی کو خراجی زمین سے قطائع دیئے جائیں تو ٹیکس کے بارے میں خلیفہ کو اختیار ہے کہ پیداوار کا دسواں، پندرھواں، بیسواں حصہ یا اس سے بھی زیادہ یا خراج بہرحال جو مناسب سمجھے وہ ٹیکس مقرر کر دے[2]

پھر کہتے ہیں۔

وَ اَرْجُوْا اَنْ یَّکُوْنَ ذٰلِکَ مُوَسَّعًا عَلَیْہِ فَکَیْفَ مَا شَآءَ مِنْ ذٰلِکَ فَعَلَ[3]

مجھے امید ہے کہ اس بارہ میں خلافت جو بھی مناسب سمجھ کر کرے گی اس کے لئے وسعت اور گنجائش ہے۔

یہی امام ہارون الرشید کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وَ اعْمَلْ بِمَا تَرٰی اَنَّہٗ اَصْلَحُ لِلْمُسْلِمِیْنَ وَ اَعَمُّ نَفْعًا لِخَاصَّتِہِمْ وَ عَامَّتِہِمْ وَ اَسْلَمُ لَکَ فِیْ دِیْنِکَ[4]

مفادِ عامہ کے پیشِ نظر جس میں مسلمانوں کی اور تمام لوگوں کی فلاح و بہبودی ہو آپ کو اس میں بالکلیہ اختیار ہے اور دین و ملت کے لحاظ سے بھی وہی زیادہ محافظ ہے۔

حاصل یہ کہ حکومتِ الٰہی میں زمین کی جائیداد نہ ذاتی وقار اور اقتدار بڑھانے کے لئے ہوتی تھی اور نہ کاشتکاروں کی محنت سے فائدہ اٹھا کر مفت خوروں کا طبقہ پیدا کرنے کے لئے بلکہ یہ ساری چیزیں پیداوار حاصل کر کے مفادِ عامہ کی راہوں میں صرف کرنے کے لئے اور خلقِ خدا کی خدمت کے لئے ہوتی تھیں اسی لئے قانون اور ٹیکس کے معاملات میں خلافت کے اختیارات وسیع ہوتے تھے۔

جس طرح خلق اللہ کی ضروریات مہیا کرنا خلافت کا فرض تھا اور جانوروں تک کا انتظام اس کی ڈیوٹی میں داخل تھا اسی طرح قدرت کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں خلافت کے اختیارات کی وسعت اس کا حق تھا تاکہ آزادی

---

[1] الخراج ص ۵۹ و ۶۰ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] الخراج ص ۵۹ و ۶۰

کے ساتھ حقیقی معنوں میں وہ نیابت کے فرائض انجام دے سکے۔

مذکورہ بالا تصریحات کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ موجودہ زمینداری و جاگیر داری کی شکل زمانۂ خلافت کے قطائع سے بالکل مختلف ہے کیونکہ اس نظام میں جاگیر دار و زمیندار ایک وسیع حصۂ زمین کا مالک ہو کر کاشتکاروں اور مزدوروں سے کام لیتا ہے اور بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے ان کے منافع سے عیش و آرام کرتا ہے۔

اس سے ایک طرف تو راحت طلبوں اور مفت خوروں کا طبقہ پیدا ہوتا ہے جو دوسروں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر سوسائٹی کے لئے بار بنتا ہے اور دوسری طرف کاشتکاروں کو ان کی محنت کا پورا حق نہیں ملتا، جس کی بنا پر انہیں رات دن کی محنت کے باوجود فراغت کے ساتھ روٹی میسر نہیں آتی۔

قطائع سے اس قسم کی تنظیم کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں نکل سکتی۔ بلکہ اسلام ایسے نظام کو سختی کے ساتھ ختم کرنا چاہتا ہے اور زمانۂ خلافت کی متعدد مثالیں اوپر گزر چکی ہیں جن سے اسی حقیقت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔

یہ حقیقت اس بات سے اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ حکومتِ الٰہی کی طے شدہ اور مقرر کردہ پالیسی یہ ہے کہ زمین اور جائیداد ذاتی وقار اور اقتدار بڑھانے کے لئے نہ ابتداءً کسی کو دی جا سکتی ہے اور نہ بعد میں کسی کے پاس باقی رکھی جا سکتی ہے، یہ صرف مفادِ عامہ کے پیشِ نظر لوگوں کو دی جاتی ہے اور اس کو سامنے رکھ کر ان سے واپس لے لی جاتی ہے۔ حکومتِ الٰہی میں اصل چیز مفادِ خلق ہے۔ جب تک یہ حاصل ہوتا رہتا ہے خلافت کو اس میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی لیکن جب یہ فوت ہونے لگتا ہے تو خلافت اس وقت ہر تصرف کی مجاز ہوتی ہے۔ چنانچہ زمانۂ خلافت میں قوم بجیلہ سے قطائع کا واپس لے لینا (جس کی تفصیل آگے چل کر آتی ہے) اور بلال بن حارث مزنی کے قبضہ سے غیر آباد اراضی کا نکال لینا اور اس قسم کے جتنے واقعات اوپر مذکور ہو چکے وہ سب اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

قطائع پر خلافت کے اختیارات

اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر فرمایا تھا۔

لَنَا رِقَابُ الْاَرْضِ[1]

زمینیں در اصل ہماری (خلافت کی) ہیں۔

---

[1] الاموال ص ۲۷۹

اور حضرت علیؓ نے ایک شخص سے اس کے اسلام قبول کرنے کے بعد فرمایا تھا۔

إِنَّ أَرْضَكَ فَهِيَ لَنَا[1]

بیشک تیری زمین ہماری (خلافت کی) ہے

اسی حقیقت کو حافظ ابوبکر جصاصؒ یوں ادا کرتے ہیں۔

ہر وہ زمین جس کی آبادکاری سے لوگ عاجز ہیں اور حقوقِ عامہ جو زمین سے متعلق ہیں وہ پامال ہونے لگیں تو اس کے انتظام کے بارے میں خلافت کو پورا اختیار ہے[2]۔

قاضی ابو یوسفؒ فرماتے ہیں۔

وَلَا يُخْرِجُ مِنْ يَدِهِ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا اِلَّا بِحَقٍّ يَجِبُ لَهٗ عَلَيْهِ فَيَأْخُذُهٗ بِذَالِكَ الَّذِيْ وَجَبَ لَهٗ[3]

اہل قطائع کو خلافت (بلاوجہ) بیدخل نہ کرے البتہ اگر حقوقِ واجبہ کی ادائیگی نہ ہو رہی ہو تو اسکو بیدخل کرنے کا پورا اختیار ہے۔

قاضی صاحب کا یہ جملہ "اِلَّا بِحَقٍّ يَجِبُ لَهٗ عَلَيْهِ" نہایت قابلِ غور ہے اور اپنے عمومِ فہم کی بناء پر حقوقِ عامہ کے ہر جائز حق اور خلیفہ کے ہر جائز تصرف کو شامل ہے۔ اسی سلسلہ میں امام ابو حنیفہؒ کی یہ تصریح ہے۔

اِنَّ نَوَاحِيَ دَارِ الْاِسْلَامِ تَحْتَ يَدِ اِمَامِ الْمُسْلِمِيْنَ[4]

دارالاسلام کے جملہ حصے خلیفۃ المسلمین کے زیرِ اقتدار ہوتے ہیں۔

اور امام مالکؒ کا یہ ارشاد ہے۔

تَصِيْرُ الْاَرْضُ لِلسُّلْطَانِ[5]

زمینیں ورثہ بادشاہ (حکومت) کی ہوتی ہیں۔

ایک موقع پر علامہ عینیؒ کہتے ہیں۔

---

[1] احکام القرآن ج ۳ ص ۳۲ [2] ایضاً [3] الخراج ص ۶۰ [4] مبسوط ج ۱ ص ۹۳ از اسلام کے معاشی نظریے۔ [5] المحلی ج ۸ از مقالہ اسلامی اشتراکیت۔

اِنَّ حُکْمَ الْاَرَاضِیْ اِلَی الْاِمَامِ

دراصل زمین کا معاملہ خلیفہ (خلافت) کے سپرد ہے۔

چونکہ اراضی کے معاملہ میں خلافت کے اختیارات وسیع ہوتے ہیں اس لئے خلیفہ کو مفاد عامہ کے پیش نظر موقوفہ اراضی میں بھی واقف کی مقرر کردہ شرطوں کی مخالفت جائز سمجھی جاتی ہے۔ آراضی موقوفہ کی بحث میں فقہا نے تصریح کی ہے۔

اِنَّ السُّلْطَانَ یَجُوْزُ لَہٗ مُخَالِفَۃُ الشَّرْطِ اِذَا کَانَ غَالِبُ جِھَاتِ الْوَقْفِ قُرًی وَ مَزَارِعُ فَیَعْمَلُ بِاَمْرِہٖ وَ اِنْ غَایَرَ شَرْطَ الْوَاقِفِ لِاَنَّ اَصْلَھَا لِبَیْتِ الْمَالِ[۱]

جب واقف کی اکثر جہات گاؤں اور مزروعہ زمینیں ہوں تو خلافت اپنے صوابدید کے مطابق انتظام کرے اگرچہ واقف کی شرطوں کی مخالفت پائی جاتی ہو کیونکہ گاؤں اور زمینیں دراصل بیت المال (خلافت) کی ہوتی ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ حکومتِ الٰہی میں زمین اور جائیداد پر کسی کے قبضہ ہونے کا صرف یہ مطلب ہے کہ قابض کو بحیثیت 'امین' اس کے استعمال کا حق حاصل ہو۔ یہ امانت اس کے قبضہ میں یا یہ حق استعمال اس کے پاس اسی وقت تک باقی رکھا جاتا ہے جب تک خلق اللہ کے مفاد میں وہ خلافت کا ہاتھ بٹا سکے اور ایسی فضا پیدا کرنے میں مددگار بنے جو مخلوق کی خوش حالی اور ترقی کی ضامن ہو لیکن جب اس کی خلاف ورزی ہونے لگے یا امانت میں خیانت کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو خلافت کو بلاپس وپیش زمین سے بیدخل کر دینے یا جو بہتر صورت اس کی سمجھ میں آئے اس پر عمل کرنے کا پورا اختیار ہے۔

خلافت کے اس اقدام میں نہ حقوقِ ملکیت کا گورکھ دھندا حائل ہوتا ہے اور نہ محض جذباتی چیزیں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔

چونکہ خلافت کے ہر تصرف اور ہر فیصلہ میں ہر شخص کے ذاتی مفاد کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے اس لئے اس قسم کے تمام مواقع میں وہ ذاتی وانفرادی مفاد کا پورا پورا لحاظ رکھتی ہے البتہ انفرادی اور اجتماعی

---

[۱] درالمختار ج ۱۴ ص درالمختار ۱۴

مفادات کے ٹکراؤ کی شکل میں وہ اجتماعی مفاد کو ترجیح دیتی ہے

دراصل اسی انفرادی حق کے ماتحت زمانہ خلافت میں بعض ایسی شکلیں ملتی ہیں جن میں صاحب زمین کو ان کی زمین لے لینے کے بعد کچھ رقم ادا کی گئی تھی تاکہ اس شخص کے ذاتی حقوق پامال نہ ہونے پائیں۔ کبھی تو اس کی شکل معاوضہ کی ہوتی تھی جیسے کہ حضرت عمرؓ نے وادی القریٰ کے باشندوں کو منتقل کرنا چاہا تو ان کی اراضی اور نخلستان کی ایک ایک پائی قیمت لگا کر جو نوّے ہزار کے قریب ہوتی تھی ان کے حوالہ کیا تھا۔[1]

اور جس طرح نجران کے باشندوں کو جب سیاسی مصلحت کی بنا پر منتقل کیا گیا تو زمین کے عوض زمین دی گئی اور فدک کے لوگوں کو منتقلی کے وقت زمین کی قیمت ادا کی گئی تھی اور جس طرح مدینہ کے یہودیوں کو انکے منتقل کرنے سے پیشتر اپنی اپنی زمینیں فروخت کرنے کا حکم دیا تھا۔[2]

اور کبھی حکومت کی جانب سے دی ہوئی رقم کی حیثیت معاوضہ کی نہ ہوتی تھی بلکہ بطور امداد ہوا کرتی تھی۔ جس طرح حضرت عمرؓ نے قوم بجیلہ کے ابن جریر اور ایک عورت ام کرز کو اسی اسی دینار کے قریب دیا تھا اس کی حیثیت امداد کی تھی نہ کہ معاوضہ کی جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

اراضی مسلم جس جگہ کے باشندے اسلامی رحمت قبول کرکے مسلمان ہوجاتے تھے ان کی زمین کی تنظیم و تقسیم کے بارے میں عام قانون یہی تھا کہ وہ بھی مفتوحین کی زمینوں کی طرح اللہ کی ملک قرار دیجاتی تھیں اور خلافت کے انتظام و نگرانی میں انہی کے پاس رہنے دی جاتی تھیں اور سرکاری ٹیکس کے علاوہ ان سے کچھ وصول نہ کیا جاتا تھا۔

عام قانون رسول اللہؐ کی زبان میں یہ تھا۔

إِنَّ الْقَوْمَ إِذَا أَسْلَمُوْا أَحْرَزُوْا دِمَاءَهُمْ وَ أَمْوَالَهُمْ[3]

جب کوئی قوم اسلام قبول کرلے تو وہ اپنی جانوں اور مالوں کو محفوظ کرلیتی ہے۔

یہ قانون عرب۔ عجم کی تمام زمینوں کے لئے یکساں تھا اور اس میں منقولہ و غیر منقولہ جائیدادیں سب شریک تھیں۔

---

[1] الاحکام السلطانیہ ماوردی۔ ص ۱۶۴ [2] بخاری کتاب البیوع ص ۱۹ [3] ابوداؤد۔

قاضی ابو یوسف صاحب اسی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

وَاِنَّ دِمَاءَ هُمْ حَرَامٌ وَمَا اَسْلَمُوْا عَلَيْهِ مِنْ اَمْوَالِهِمْ وَ كَذَالِكَ اَرْضُهُمْ لَهُمْ وَ هِيَ اَرْضُ عُشْرٍ بِمَنْزِلَةِ حَيْثُ اَسْلَمَ اَهْلُهَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَتْ اَرْضُهُمْ اَرْضَ عُشْرٍ وَ كَذَالِكَ الطَّائِفُ وَ الْبَحْرَانُ وَ كَذَالِكَ اَهْلُ الْبَادِيَةِ اِذَا اَسْلَمُوْا عَلٰى مِيَاهِهِمْ وَ بِلَادِهِمْ فَلَهُمْ مَا اَسْلَمُوْا عَلَيْهِ وَ هُوَ فِيْ اَيْدِيْهِمْ وَلَيْسَ لِاَحَدٍ مِنْ اَهْلِ الْقَبَائِلِ اَنْ يَبْنِيَ فِيْ ذَالِكَ شَيْئًا يَسْتَحِقُّ بِهٖ مِنْهُ شَيْئًا وَ لَا يَحْفِرُ فِيْهِ بِئْرًا يَسْتَحِقُّ بِهٖ شَيْئًا وَ لَيْسَ لَهٗ اَنْ يَمْنَعُوا الْكَلَاءَ وَ لَا يَمْنَعُوا الرِّعَاءَ وَ لَا الْمَوَاشِيَ مِنَ الْمَاءِ وَلَا حَافِرًا وَ لَا خُفًّا فِيْ تِلْكَ الْبَلْدَةِ وَ اَرْضُهُمْ اَرْضُ عُشْرٍ لَا يُخْرَجُوْنَ عَنْهَا فِيْمَا بَعْدُ وَ يَتَوَارَثُوْنَهَا وَ يَتَبَايَعُوْنَهَا[1]

جس زمین کے باشندے اسلام قبول کرلیں ان کا خون حرام ہے۔ قبول اسلام کے وقت جو مال ان کے پاس ہوگا وہ انہی کا رہے گا ایسے ہی زمینیں بھی انہی کی رہیں گی اور اس قسم کی زمینیں عشری ہوں گی جس طرح مدینہ کے باشندوں نے اسلام قبول کیا تو یہ ساری چیزیں انہی کے پاس رہنے دی گئی تھیں اور جس طرح طائف اور بحرین کے لوگوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا گیا تھا اسی طرح بدویوں میں سے جن جن لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا وہ اپنے اپنے چشموں اور اپنے اپنے علاقوں پر باقی رکھے گئے تھے قبیلہ والوں میں سے کسی کے لئے جائز نہ تھا کہ وہ ان کی چیزوں میں کوئی ایسا تصرّف کریں جس کی بنا پر اس کے وہ مستحق بن جائیں اور نہ ان میں کسی کو (بلا اجازت) کنواں کھودنا جائز تھا کہ جس کی وجہ سے کچھ حصّہ کے وہ مستحق ہو جائیں۔ البتہ انہیں گھاس سے کسی کو روکنا جائز نہیں ایسے ہی چرواہوں اور مویشیوں کو پانی سے روکنا جائز نہیں اور جانوروں اور اونٹوں کو اس علاقہ میں داخل ہونے سے روکنا جائز نہیں ہے۔ انکی

---

[1] الخراج ص ۶۳

زمینیں عشری ہوں گی بعد میں بھی ان سے نکالی نہ جائیں گی۔ ان میں وراثت جاری ہوگی اور
وہ ان کی خرید و فروخت کرسکیں گے[1]

یہی قاضی صاحب پھر آگے چل کر لکھتے ہیں۔

وَ كَذَالِكَ بِلَادُ اَسْلَمَ عَلَيْهَا اَهْلُهَا فَهِيَ لَهُمْ وَ مَا فِيْهَا[2]

ایسے ہی جس شہر و علاقہ کے لوگ اسلام قبول کرلیں تو اُن کی زمین اور ساری چیزیں (حسب سابق)
انہی کی رہیں گی۔

امام ابو عبیدؒ کہتے ہیں۔

جس زمین کے باشندے اسلام قبول کرلیں وہ زمین انہی کی ملک رہے گی اور عشر کے علاوہ
کچھ نہ دینا پڑے گا[3]

پھر آگے چل کر کہتے ہیں۔

كُلُّ اَرْضٍ اَسْلَمَ عَلَيْهَا اَهْلُهَا فَهُمْ مَالِكُوْنَ لِرِقَابِهَا كَالْمَدِيْنَةِ وَ
الطَّائِفِ وَ الْيَمَنِ وَ الْبَحْرَيْنِ[4]

جس زمین کے باشندے اسلام قبول کرلیں وہ اپنی زمین کے مالک ہوں گے (ضبط نہیں کی جائیگی
اور انہیں انتفاع اور استعمال کا حق رہے گا) جیسے مدینہ، طائف، یمن، بحرین وغیرہ میں یہی
کیا گیا تھا۔

الغرض زمانۂ خلافت میں مسلموں کی زمین جائیداد کا یہی انتظام تھا خواہ وہ غلبہ سے فتح کیے ہوئے
ممالک کے باشندے ہوتے یا وہ لوگ ہوتے جن سے پہلے مصالحت ہوگئی ہوتی اور بعد میں اسلام کی حقانیت
وصداقت واضح ہونے کے بعد اسلام قبول کرلیا ہوتا۔ لیکن اس کے علاوہ اراضی مسلم کے بارے میں ایک اور
بات خاص توجہ کے لائق ہے وہ یہ کہ دراصل اسلام کا مقصد ایک ایسی صالح جماعت بنانا ہے جس کا نصب العین
دوسروں کے لئے رحمت کا ماحول پیدا کرنا ہوتا ہے خواہ اس کی خاطر اسے جان و مال قربان

اگلا قدم

---

[1] جیسا کہ ذرا آگے چل کر واضح ہو جائے گا یہ طریق کار ابتدائی مصالح کے پیش نظر اختیار کیا گیا تھا۔ ورنہ خلافت کو حق حاصل
تھا کہ وہ اراضیات میں جس طرح کا جی چاہے تصرف کرے کیونکہ اراضی کسی کی ملکیت نہیں ہوتی تھی [2] الخراج ص ۱۶ [3] الاموال
صفحہ ۱۳ ۵ [4] ایضاً۔

کرنا ہی کیوں نہ پڑے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ان کے دلوں سے ذاتی منفعت اور عیش و عشرت کا بت نکال کر قربانی کا جذبہ نہ پیدا کیا جائے۔ عام طور سے تو یہ ہوتا ہے کہ با اقتدار جماعت میں جب کوئی فرد داخل ہو جاتا ہے تو اسے ہر قسم کی جائز و ناجائز رعایتیں دی جاتی ہیں اس کی زیادتیوں پر پردہ ڈالا جاتا ہے اور اس کو اتنی زیادہ چھوٹ ملتی ہے کہ وہ دوسروں کی حق تلفی کر کے خود عیش کر سکے۔ لیکن اسلامی جماعت میں داخل ہونے سے اللہ کے لئے ہر چیز وقف کر دینے کا عہد لیا جاتا ہے اور اپنے کو فنا کر کے دوسرے کی بقا کا سامان فراہم کرنے کا مطالبہ ہوتا ہے، اسی لئے مسلم کی زمین و جائیداد میں خلافت اپنے اختیارات بہ نسبت دوسرے لوگوں کے زیادہ استعمال کرتی ہے۔ کبھی ترغیب و ترہیب کے ذریعہ اور کبھی قانون کے ذریعہ جیسا کہ تاریخ اسلام میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ مسلم باشندے اپنی جائیدادیں عام مفاد خلق کے لئے خلافت کے حوالے کر دیتے تھے یا خلافت بوقت ضرورت ان سے لے لیتی تھی۔ چند مثالیں یہ ہیں۔

مدینہ کے لوگوں نے برضا و رغبت اپنی زمینیں خلافت کے حوالہ کر دی تھیں

(۱) ابتدائے اسلام میں مدینہ کے مسلم باشندوں نے اپنی زمینیں پانی کی دشواری کی وجہ سے عام مفاد کے پیش نظر رسول اللہؐ کے حوالہ کر دی تھیں کہ آپ جن لوگوں میں چاہیں انہیں تقسیم کر دیں۔

اسی واقعہ کے متعلق ابن عباسؓ لکھتے ہیں۔

إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَمَّا قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ جَعَلُوْا لَهٗ كُلَّ أَرْضٍ لَا يَبْلُغُهَا الْمَاءُ يَصْنَعُ بِهَا مَا يَشَاءُ[۱]

رسول اللہؐ جب مدینہ تشریف لائے تو اہل مدینہ نے ہر ایسی زمین آپ کے حوالہ کر دی جس میں پانی کا پہنچنا دشوار تھا اور آپ کو اختیار دیدیا کہ آپ جو چاہیں کریں۔

زمین ملنے کے بعد آپ نے اس کو زیادہ سے زیادہ مفید اور کار آمد بنانے کی کوشش کی اور ابو عبیدؒ کی رائے کے مطابق آپ نے بلال بن حارثؓ کو اسی زمین سے "قطیعہ" عطا فرمایا۔[۲]

قوم بجیلہ کی زمینیں خلافت نے واپس لیلی تھیں

(۲) خالصہ زمین کا کچھ حصہ حضرت عمرؓ نے قوم بجیلہ کو دیدیا تھا۔ دو تین سال تک ان لوگوں نے

---

[۱] الاموال۔ ص ۲۸۲ [۲] الاموال ص ۲۸۲

اس زمین کو اپنے قبضہ میں رکھا لیکن جب خلافت نے مفاد عامہ کے پیش نظر واپس لینا چاہا تو بلا پس و پیش ان لوگوں کو خلافت کے حوالہ کرنا پڑا۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

قیس بن حازم کہتے ہیں جنگ قادسیہ (جو ایرانیوں سے ہوئی تھی) کے دن اسلامی فوج میں قوم بجیلہ کے لوگ چوتھائی تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو سواد کا چوتھائی حصہ دیدیا تھا۔ دو یا تین سال تک یہ زمین ان کے قبضہ میں رہی۔ ایک مرتبہ کسی ضرورت سے اسی قبیلے کے چند افراد عمار بن یاسر اور جریر وغیرہ حضرت عمرؓ کے پاس تشریف لائے تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ لوگ اس زمین کو عام مفاد خلق کے لئے خلافت کے حوالہ کر دیجئے۔ اس پر ان لوگوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور زمین خلافت کے حوالہ کر دی، اس کے بعد حضرت عمرؓ نے سرکاری خزانہ سے جریر کو اسی دینار عطا فرمائے[1]

جب اس واقعہ کی خبر قوم بجیلہ کی ایک عورت "ام کرز" کو ہوئی تو اس نے اپنے حصہ کی زمین واپس کرنے میں پس و پیش کیا اور حضرت عمرؓ کے پاس آکر عرض کیا کہ

يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ إِنَّ أَبِي هَلَكَ وَ سَهْمُهُ ثَابِتٌ فِي السَّوَادِ وَ إِنِّي لَمْ أُسْلِمْ، فَقَالَ لَهَا يَا أُمَّ كُرْزٍ إِنَّ قَوْمَكِ قَدْ صَنَعُوا مَا قَدْ عَلِمْتِ فَقَالَتْ إِنْ كَانُوا قَدْ صَنَعُوا مَا صَنَعُوا فَإِنِّي لَسْتُ أُسْلِمُ حَتَّى تَحْمِلَنِي عَلَى نَاقَةٍ ذَلُولٍ عَلَيْهَا قَطِيفَةٌ حَمْرَاءُ وَ تَمْلَأُ كَفِّي ذَهَبًا قَالَ فَفَعَلَ عُمَرُ ذَالِكَ فَكَانَتِ الدَّنَانِيرُ نَحْوًا مِنْ ثَمَانِينَ دِينَارًا[2]

اے امیرالمومنین میرے والد کی وفات ہوگئی ہے۔ سواد کی زمین میں اس کا بھی حصہ تھا (جو ترکہ میں مجھے ملا ہے) میں اس کو کبھی واپس نہ کروں گی۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اے ام کرز تیری قوم نے بلا چون و چرا واپس کر دیا ہے اور تجھے اس کا اچھی طرح علم ہے، اس نے جواب دیا قوم نے جو کچھ کیا ہے مجھے اس سے سروکار نہیں ہے میں تو اس وقت تک واپس نہ کروں گی جب تک کہ آپ مجھے ایک فرمانبردار اونٹنی نہ دیں جس پر سرخ رنگ کی گرم چادر پڑی ہو اور

---

[1] الاموال۔ ص ۶۱، ۶۲ ــــ والخراج یحیٰی ص ۴۵ و ۴۶ [2] ایضاً۔

زر و مال سے میرا ہاتھ نہ بھر دیں۔ حضرت عمرؓ نے آخر ایسا ہی کیا۔ اور نقدی جو آپ نے اس کو دی تھی اس کی تعداد تقریباً اسی دینار کو پہنچ گئی تھی۔

اس واقعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خلافت جب چاہے مفادِ عامہ کے پیشِ نظر مسلم باشندوں کو بیدخل کرکے ان کی زمینیں لے سکتی ہے اسی طرح یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ ایسی صورت میں ہر شخص کے ذاتی مفاد کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے تاکہ اجتماعی مفاد کے ساتھ ذاتی حقوق کی پامالی نہ لازم آئے۔

لیکن اس واقعہ سے یہ بات لازمی طور سے نہیں ثابت ہوتی کہ خلافت کی جانب سے صاحبِ زمین کو جو کچھ دیا جائے اس کی حیثیت معاوضہ کی ہو یا حضرت عمرؓ نے جو کچھ جریر اور ام کرز کو دیا تھا اس کی حیثیت معاوضہ کی تھی جس کی بنا پر یہ کہا جائے کہ جب مفادِ عامہ کے پیشِ نظر ایسی صورت پیش آجائے تو خلافت کو بلا معاوضہ زمین لینے کا اختیار نہیں ہے اسی طرح یہ حقیقت بھی نمایاں نہیں ہوتی ہے کہ خلافت کی جانب سے اس قسم کے جو کچھ تصرفات کئے جائیں ان میں صاحبِ زمین کی رضامندی ضروری ہے۔ جیسا کہ ذیل کی تصریحات اس پر روشنی ڈالتی ہیں۔

ابو عبیدؒ کہتے ہیں۔

جو لوگ مفتوحہ زمین کو اصل باشندوں کے پاس رہنے دینے میں فوجیوں کی رضامندی ضروری سمجھتے ہیں (امام شافعیؒ کا یہی خیال ہے) یہ واقعہ ان کے لئے کیسے دلیل بن سکتا ہے جبکہ اسی جیسے واقعے عراق و شام کی فتح میں اصل باشندوں کے پاس زمین رہنے دیئے جانے کے بارے میں حضرت بلالؓ وغیرہ نے جب حضرت عمرؓ کی مخالفت کی تھی اور زمین کو فوجیوں پر تقسیم کرنے پر اصرار کیا تھا تو آپ نے ان سب کے متعلق فرمایا: اَللّٰهُمَّ اكْفِنِيْهِمْ (اے اللہ تو ہی ان کے لئے کافی ہے) اس وقت کون سی ان لوگوں کی رضامندی مطلوب تھی (جس کی بنا پر یہ کہا جائے کہ یہاں بھی حضرت عمرؓ ام کرز کو راضی کرنا چاہتے تھے اور بغیر رضامندی کے انہیں بیدخل کرنے کا کوئی حق نہیں تھا[1])

ابو بکر جصاص قوم بجیلہ کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

---

[1] الاموال ص ۶۲ و ۶۳

اس واقعہ میں ان کی رضامندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے کیونکہ حضرت عمرؓ نے یہ بات صاف طور پر کہہ دی تھی کہ زمین کو واپس کئے بغیر چارہ نہیں ہے اور اس میں لوگوں کی بھلائی ہے۔ باقی رہا ام کرز عورت کا معاملہ تو اس کو حضرت عمرؓ نے سرکاری خزانہ سے (بطور امداد) رقم دی تھی۔ ویسے بھی خلیفہ کو اختیار تھا کہ عورت کے قبضہ کی زمین واپس لئے بغیر سرکاری خزانہ سے اس کو عطیہ دیتے۔[1]

بہرحال مفادِ عامہ کے پیش نظر خلافت جب صاحب زمین کو بے دخل کرنا چاہے تو نہ اس کی رضامندی ضروری ہے اور نہ اس کا معاوضہ ادا کرنا لازمی ہے البتہ اس شخص کے ذاتی حقوق کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کہیں اس تصرف کی وجہ سے وہ پائمال نہ ہو جائیں۔

حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کو زمین و جائیداد رکھنے سے قانوناً منع کر دیا تھا

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں مسلمانوں کو زمین و جائیداد رکھنے اور کاشتکاری کرنے سے قانوناً منع کر دیا تھا اور یہ اعلان کرا دیا تھا کہ جب سب لوگوں کے اہل و عیال تک کے وظیفے سرکاری خزانہ سے دیئے جاتے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ یہ لوگ انسانیت کی خدمت کے لئے وقف نہ ہوں اور بیلوں کی دُم کے پیچھے لگے رہیں۔

علامہ طنطاوی جوہری اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

فَلَمَّا كَثُرَتِ الْأَمْوَالُ فِيْ أَيَّامِ عُمَرَ وَ وَضَعَ الدِّيْوَانَ فَرَضَ الرَّوَاتِبَ لِلْعُمَّالِ وَالْقُضَاةِ وَ مَنَعَ الْإِدِّخَارَ الْمَالِ وَ حَرَّمَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ اقْتِنَاءَ الضِّيَاعِ وَ الزِّرَاعَةِ وَ الْمُزَارَعَةِ

لِأَنَّ أَرْزَاقَهُمْ وَ أَرْزَاقَ عِيَالِهِمْ تُدْفَعُ لَهُمْ مِنْ بَيْتِ الْمَالِ[2]

حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں جب مال بہت بڑھ گیا تو باقاعدہ رجسٹر مرتب کئے گئے۔ لوگوں کے وظیفے مقرر ہوئے عاملوں اور قاضیوں کی تنخواہیں مقرر ہوئیں، سرمایہ جمع کرنے سے روک دیا گیا

---

[1] احکام القرآن ج ۳ ص ۵۳۱ و ۵۳۳ [2] نظام العالم والامم ج ۲ ص ۱۸۳ و ۱۸۴۔

کاشتکاری خود کرنے یا دوسروں سے کرانے دونوں کی ممانعت کردی گئی۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا تھا کہ لوگوں کے مع ان کے بال بچوں تک کے وظیفے بیت المال سے مقرر کر دیئے گئے تھے۔

ایک اہم قانون کاشتکاری وغیرہ سے ممانعت کے اس قانون نے یہاں تک ترقی پائی تھی کہ "اگر کوئی غیرمسلم اسلام قبول کر لیتا تو اس کی تمام جائیداد غیر منقولہ ضبط کر کے بستی کے غیرمسلموں میں تقسیم کر دی جاتی اور اس نومسلم کا سرکاری خزانہ سے وظیفہ مقرر کر دیا جاتا تھا"[۵۱]۔

غور سے دیکھا جائے تو فاروق اعظمؓ کے اس فیصلہ میں حکومتِ الٰہی کے خلیفہ کی انجام بینی اور مسلم جماعت کی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔

دراصل اس ممانعت کے قانون سے خلیفہ کے پیش نظر یہ بات تھی کہ اگر یہ لوگ (مسلمان) زمین جائیداد اور مال جمع کرنے کے پیچھے پڑ گئے تو ظلم و فساد کے دروازے کھل جائیں گے اور خدمتِ خلق کے بجائے (جو ان کا مقصدِ زندگی ہے) دیگر حاکموں کی طرح ان کو بھی دوسروں کے خون چوسنے کا موقع مل جائے گا۔ اس کے علاوہ عیش و عشرت میں پھنس کر یہ لوگ اپنے اعلیٰ جوہر جوانمردی بہادری، جفاکشی، ہمت، عزم وغیرہ کھو بیٹھیں گے جس کا نتیجہ بعد میں یہ ظاہر ہوگا کہ جو جماعت محض خدمتِ خلق اور رحمتِ الٰہی کو عام کرنے کے لئے زندہ ہے پھر اسے زندہ رہنے کا حق باقی نہ رہے گا۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ بعد کے مسلمان جب مال و دولت اور جائیدادوں کے چکر میں الجھ گئے تو اس جماعت کے بلند اوصاف اور پاکیزہ صفات میں فرق پڑ گیا اور ان کے اعلیٰ جوہر جن سے اس جماعت کی خمیر تیار ہوئی تھی وہ سب ایک ایک کر کے ختم ہو گئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بھی ممانعت کا یہی قانون نافذ کیا تھا پھر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جب خلیفہ ہوئے تو حضرت عمرؓ کے مذکورۂ بالا قانون کو دوبارہ نافذ کیا تھا اور انہی کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ علامہ طنطاوی کہتے ہیں۔

وَ اَیَّدَ هٰذِهِ الْقَاعِدَةَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِیْزِ وَ كَانَ یَجِدُّ اٰبْنَ الْخَطَّابِ بِكُلِّ خُطُوَاتِهٖ[۵۲]

---

[۵۱] نظام العالم والامم ج ۲ ص ۱۸۳ و ۱۸۴ [۵۲] ایضاً۔

اور حضرت عمرؓ کے اس قانون کو عمر بن عبدالعزیزؒ نے نافذ کیا اور وہ حضرت عمرؓ کے ہر نقشِ قدم پر چلتے تھے۔

وہ قانون یہ تھا۔

(۱) فَقَالَ اَيُّمَا ذِمِّيٍّ اَسْلَمَ فَاِنَّ اِسْلَامَهٗ يُحْرِزُ لَهٗ نَفْسَهٗ وَمَالَهٗ وَمَا كَانَ مِنْ اَرْضٍ فَاِنَّهَا مِنْ فَيْءِ اللّٰهِ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ۔

اعلان کرا دیا کہ جو ذمی (غیر مسلم) اسلام قبول کرے اس کی جان اور اموال منقولہ محفوظ رہیں گے لیکن اموال غیر منقولہ مسلمانوں کے لئے اللہ کی "فئی" ہو جائیں گے۔

(۲) وَاَيُّمَا قَوْمٍ صَالَحُوْا عَلٰى جِزْيَةٍ يُعْطُوْنَهَا فَمَنْ اَسْلَمَ مِنْهُمْ كَانَتْ دَارُهٗ وَاَرْضُهٗ لِبَقِيَّتِهِمْ۔

اور جن لوگوں سے معاہدہ ہو گیا ہے وہ لوگ اگر اسلام قبول کرلیں تو اموال غیر منقولہ انہی قوم کے بقیہ لوگوں میں تقسیم کر دیئے جائیں گے۔

یہ چند مثالیں ہیں جن سے ایک طرف تو مسلم جماعت کی زندگی کا پتہ چلتا ہے اور دوسری طرف یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلامی نظامِ حیات کا اپنے ماننے والوں سے کتنا بلند اخلاق اور قربانی کا مطالبہ ہے اور نہ ماننے والوں کے ساتھ کتنا اور کس قدر منصفانہ سلوک ہے۔

آج بھی دنیا کی مہذب قوموں میں اپنی پارٹی والوں کے ساتھ رو رعایت جائز سمجھی جاتی ہے اور پارٹی اسی لئے اقتدار حاصل کرتی ہے کہ وہ اوروں کا خون چوس کر خود عیش و عشرت کر سکے۔ بخلاف اس کے اسلامی حکومت میں کیا مسلمان ہو کر کسی کا ناجائز طریقے پر مال لینے کا خیال تو الگ رہا، خود اس کا مال و جائیداد غیر مسلموں میں تقسیم کر دینے کا حکم ہے۔

(جون ۱۹۵۰ء)

۱؎ نظام العالم والامم ج ۲ ص ۱۸۳ و ۱۸۴

زرعی اصلاحات

۱۹۵۹ء میں، حکومتِ پاکستان کی طرف سے زرعی اصلاحات کا اعلان ہوا۔ اس پر
طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت فروری ۱۹۵۹ء میں حسبِ ذیل تبصرہ شائع ہوا۔

حکومت کی طرف سے زرعی اصلاحات کے لئے جو کمیشن مقرر ہوا تھا اس نے اپنی سفارشات مرتب کر کے حکومت کے حوالے کر دیں۔ کابینہ نے ان پر غور و خوض کے بعد کچھ فیصلے کئے۔ ان فیصلوں کا ملخص، محترم صدر مملکت پاکستان نے ریڈیو سے نشر کیا۔ ان میں سے قرآنی نقطۂ نگاہ سے اہم فیصلے یہ ہیں کہ (i) کوئی شخص ایک خاص رقبہ سے زیادہ زمین اپنے قبضہ میں نہیں رکھ سکے گا۔ (ii) زائد زمین کو حکومت معاوضہ دیکر اپنی تحویل میں لے لیگی۔ جاگیروں کا معاوضہ نہیں دیا جائے گا۔ (iii) اگر کسی کے پاس ایک خاص معینہ رقبہ سے کم زمین رہ جائے تو وہ تقسیم نہیں ہو سکے گی۔ بغور دیکھئے تو ان میں دو فیصلے ایسے ہیں جنہیں اصولی کہا جائے گا۔ یعنی ایک خاص رقبہ سے زائد زمین، مالکانِ اراضی سے لے لی جائے گی اور ایک خاص رقبہ سے کم اراضی تقسیم نہیں ہو سکے گی۔

زمین کی ملکیت کے متعلق قرآنی مسلک کی وضاحت ایک مدت سے طلوعِ اسلام میں ہوتی چلی آرہی ہے اس لئے اس وقت اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ خدا نے انسان کو پیدا کیا تو اس کی ربوبیت (پرورش) اور ہدایت (راہ نمائی) اپنے ذمے لی۔ ربوبیت کے لئے اس کا سامانِ رزق زمین میں جمع کر کے رکھ دیا اور کہہ دیا کہ وہ اس میں سے حسبِ ضرورت نکال کر کھاتا رہے۔ راہ نمائی کے لئے اس نے اپنے رسول بھیجنے شروع کر دیئے۔ ربوبیت اور ہدایت کے بذمۂ خدا ہونے کا لازمی نتیجہ تھا

کہ یہ چیزیں بطور موہبت (بلاقیمت و بلامعاوضہ) ملیں گی۔ چنانچہ جہاں ہر رسول یہ اعلان کرتا رہا کہ مَاۤ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ۔" میں تم سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ زمین کے متعلق اس نے کہدیا کہ یہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ ہر ضرورتمند کے لئے یکساں طور پر کھلی رہنی چاہیئے۔ یہ تھا انتظامِ خداوندی، لیکن چونکہ زندگی کے اسٹیج پر ابلیس بھی "آدم" کے ساتھ ہی آگیا تھا۔ اس لئے اُس نے خدائی نظام کے بگاڑنے میں ہر ممکن کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طبقہ نے (طاقت کے زور پر) مائدہ ارض کو اپنی ذاتی ملکیت بنا لیا اور دوسرے نے ہدایت (خدائی راہ نمائی) پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی اور یوں رزق اور ہدایت (جو خدا کی طرف سے مفت ملے تھے) قیمتاً بکنے لگ گئے۔ انسانیت کی تاریخ اسی کشمکش کی داستان ہے جس کی رو سے حزب اللہ (خدائی جماعتیں) رزق و ہدایت کو نوعِ انسانی کے لئے عام کرتیں اور حزب الشیطان (ابلیسی قوتیں) ان پر اجارہ داری قائم کرتی چلی آرہی ہیں۔ یعنی اس کشمکش میں موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) ایک طرف ہوتے ہیں اور فرعون، قارون اور ہامان دوسری طرف۔ اسی داستان کا حسین ترین باب حضور (خاتم النبیینؐ) کا عہد ہمایوں تھا جس میں رزق کے سرچشمے اور شمع ہدایت عالمگیر انسانیت کے لئے عام ہو گئے۔ اس میں نہ کسی سرمایہ دار (زمیندار و جاگیردار) کا نام و نشان باقی رہا اور نہ ہی مذہبی پیشوائیت کا وجود۔ اور یوں "زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھی"۔ لیکن اس کے بعد پھر غیر قرآنی قوتوں نے زور پکڑ لیا اور سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت نے سر اُبھار لیا۔

قرآن نے کہا ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں آخر الامر حق، باطل پر غالب آجاتا ہے۔ لیکن اگر اس کشمکش کو تنہا خدا کے کائناتی قانون کے سپرد کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ بہت دیر میں جا کر برآمد ہوتا ہے کیونکہ خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے) اور اگر اس کے ساتھ انسانی دست و بازو بھی شریک ہو جائیں تو اس کے نتائج بہت جلد سامنے آجاتے ہیں۔ جس چیز کو عام طور پر "زمانے کے تقاضے" کہا جاتا ہے وہ خدا کے کائناتی قانون کے مخفی اشارے ہوتے ہیں۔ زرعی اصلاحات کے سلسلے میں موجودہ اقدامات اُنہی تقاضوں کے مظہر ہیں۔

ہمارے ہاں (دیگر مسلم ممالک کی طرح) مفاد پرست گروہ کا مؤقف یہ تھا کہ انہیں زمین پر ذاتی ملکیت کا حق حاصل ہے۔ ان کے اس مؤقف کی تائید مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہوتی تھی جو اس قسم کے فتاویٰ جاری کرتے تھے کہ

"اسلام کی حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر لینے والی ہوں..... جس طرح وہ (اسلام) ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ۔ اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار۔ اتنا صنعتی کاروبار۔ اتنے مویشی۔ اتنی موٹریں۔ اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔"

(مسئلہ ملکیت زمین - از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ صفحہ ۷۲، ۷۳)

یہ مؤقف اور یہ اصول، قرآن کے یکسر خلاف تھا۔ حکومت نے یہ فیصلہ کر کے کہ ایک خاص رقبہ سے زائد زمین حکومت کی تحویل میں آجائے گی زمینداروں کے اس مؤقف اور انسانوں کی خود ساختہ شریعت کے اس اصول کو توڑ کر رکھ دیا ہے اور اس طرح قرآنی اصول و نظام کی طرف ایک قدم بڑھایا ہے۔ ہمارے نزدیک حکومت کا یہ اقدام مستحق ہزار مبارکباد ہے کہ اس سے زمینداری کے غیر اسلامی نظام کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ حکومت نے فاضلہ رقبوں کو اپنی تحویل میں لینے کے لئے موجودہ "مالکوں" کو معاوضہ دینے کا بھی فیصلہ کیا ہے لیکن اس سے ذاتی ملکیت کا اصول بہر حال باقی نہیں رہتا۔ "ذاتی ملکیت" کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کو اس کا حق نہیں کہ وہ مالک کی رضامندی کے بغیر اس شے کو اس کے قبضے سے نکال کر اپنے قبضے میں لیلے یا کسی دوسرے کے قبضے میں دیدے۔ جب حکومت نے یہ فیصلہ کر دیا کہ اتنے رقبے سے زائد رقبے کو حکومت اپنے قبضہ میں لے لیگی تو اس سے ملکیت کا دعویٰ متزلزل ہو گیا۔ یہ بہت بڑا انقلاب ہے اور جب سے مسلمانوں میں سرمایہ داری اور زمینداری کا نظام آیا ہے اس قسم کے انقلاب کی مثال نہیں ملتی۔ ہم نے دسمبر ۱۹۵۸ء کی اشاعت (کے لمعات) میں لکھا تھا کہ

"جہاں تک زمینداریوں کا تعلق ہے اگر سر دست یہ ناممکن ہو کہ زمین کو بالکلیہ افراد کی ملکیت سے نکال لیا جائے تو پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ ذاتی ملکیت کے رقبوں کی اس طرح تحدید کر دی جائے کہ نہ کسی کے پاس ہزاروں ایکڑ زمین رہے اور نہ کوئی کاشتکار زمین کے مناسب قطعہ سے محروم رہے۔ قدم اول کی حیثیت سے یہ تحدید بجائے خویش قرآن کے منشاء کے مطابق ہوگی۔"

للہ الحمد کہ حکومت کا یہ پہلا قدم اس کے مطابق اٹھا ہے۔ ہماری ذاتی رائے میں پانچ صد ایکڑ نہری یا

ایک ہزار ایکڑ بارانی رقبہ (جو بعض حالات میں اس سے بڑھ سکتا ہے) زیادہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ رقبہ کی تعداد اتنی ہونی چاہیئے تھی جس سے ایک خاندان باعزت گذارہ کر سکے۔ پانچصد ایکڑ بلکہ اس سے بھی زیادہ رقبہ اراضی کی آمدنی اور زائد رقبہ کا زرمعاوضہ، مترفین کے اس طبقہ کو باقی رکھے گا جو دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرتے اور فاضلہ دولت کے بل بوتے پر معاشرہ پر مختلف نوعیتوں سے اثرانداز ہوتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے، یہ قدم اول بہرحیثیت موجودہ صورتِ حالات سے کہیں بہتر ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سے ذاتی ملکیت کا اصول متزلزل ہو جاتا ہے۔

ہمارے "اربابِ شریعت" کی طرف سے زمین پر ذاتی ملکیت کی تائید میں دوسری دلیل یہ دیجاتی تھی کہ اگر زمین پر ذاتی ملکیت نہ رہے تو قانونِ وراثت کا کیا بنے گا۔ ہم نے انہیں بار بار یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ جب قرآن کی رو سے زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی تو اس ضمن میں قانونِ وراثت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن وہ اپنی بات کو برابر دہرائے چلے جاتے۔ حکومت نے اب فیصلہ کیا ہے کہ اگر رقبۂ اراضی ایک خاص کمتر حد تک پہنچ جائے تو اسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ (مثلاً) کسی شخص کے پاس دس ایکڑ زمین ہے اور اس کے چار لڑکے ہیں۔ ہمارے اربابِ شریعت کے خیال کے مطابق یہ زمین ان چار لڑکوں میں بٹ جانی چاہیئے۔ لیکن حکومت کے حالیہ فیصلہ کے مطابق یہ زمین ان لڑکوں میں تقسیم نہیں ہو سکتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس قطعہ اراضی کی آمدنی میں ان سب لڑکوں کا حصہ ہوگا اور اس اعتبار سے وہ متوفی کے ترکے کے وارث قرار پائیں گے۔ لیکن جہاں تک زمین کا تعلق ہے اس فیصلہ سے قانونِ وراثت اپنی جگہ سے ضرور ہل جاتا ہے۔ موجودہ قانونِ وراثت کی رُو سے ان لڑکوں (متوفی کے ورثا) کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ اس رقبہ کو چار حصوں میں تقسیم کر کے اپنے اپنے حصے کے مالک بن جائیں۔ لیکن حالیہ فیصلے کے مطابق وہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ انہیں اس رقبہ کا مشترکہ انتظام کرنا ہوگا ورنہ حکومت اسے (مناسب معاوضہ دے کر) اپنی تحویل میں لے لیگی۔ اس سے وراثت میں زمین پر حقِ ملکیت کا اصول ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ یہ اصول قائم ہو جاتا ہے کہ حکومت، عوام کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے، زمین کا جس قسم کا انتظام چاہے کر سکتی ہے۔ اور یہی قرآن کا منشاء ہے۔

حکومت نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ زائد زمین کا معاوضہ دے کر اسے اپنی تحویل میں لے لیا جائے اور پھر اسے کاشتکاروں کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے۔ ہمارے نزدیک یہ بہتر ہوتا کہ، جاگیرداری کی طرح

زائد زمین بھی بلامعاوضہ حاصل کر لی جاتی اسے بلاقیمت کاشتکاروں میں حسبِ ضرورت تقسیم کر دیا جاتا۔ یہ یہ انتظام زمین کے متعلق قرآنی تصور سے زیادہ قریب ہوتا۔ بایں ہمہ یہ اعلان بڑا اطمینان بخش ہے کہ حکومت کی طرف سے زمین کے اس لین دین کے سلسلہ میں خزانۂ عامرہ پر کسی قسم کا کوئی بار نہیں پڑیگا۔ اور "کنویں کی مٹی کنویں میں لگا دی جائے گی"

حکومت کی طرف سے شائع شدہ پریس نوٹ میں (جواب ہمارے سامنے آیا ہے) یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو رقبہ اراضی "گزارہ کی حد تک" سمٹ جائے اس کا کوئی حصہ رہن۔ بیع۔ یا ہبہ کے ذریعے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ پورے کا پورا الگ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بہتر ہوتا کہ زمین کو رہن رکھنے کی قطعاً اجازت نہ دی جاتی اور بیع کی صورت میں یہ پابندی لگا دی جاتی کہ اسے صرف حکومت کے پاس فروخت کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد حکومت اسے اس شخص کے ہاتھ فروخت کرتی جس کے پاس اس کی ضرورتاً سے کم رقبہ ہو۔ اگر بیع پر اس قسم کی پابندی نہ لگائی گئی تو رفتہ رفتہ، یہ چھوٹے چھوٹے قطعات، (پانچصد یا ایک ہزار ایکڑ کی حد تک)، چند نفوس کے پاس اکٹھے ہوتے جائیں گے اور مالک کاشتکاروں کی حیثیت پھر مزارعوں کی رہ جائے گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ مزارعوں کے حقوق کے تحفظ کے حالیہ فیصلوں میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ایسی شکل پیدا نہ ہونے دی جائے جس میں پانچ پانچ سو ایکڑ والے زمیندار کثرت پیدا ہو جائیں اور محنت کرنے والے مزدور کے مزدور رہ جائیں۔

پریس نوٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ذاتی اوقاف کی اراضیات ان لوگوں میں تقسیم کر دی جائیں گی جو اس وقت صرف ان کی آمدنی سے متمتع ہو سکتے ہیں۔ یہ فیصلہ بھی نسبتاً بہتر ہے۔ قرآن کی رُو سے وقف کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ کسی مردہ کو اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ زندہ انسانوں پر اپنا حکم چلاتے اور اس طرح اپنے اختیارات کو ابدیت سے ہمکنار کر دے۔

حکومت نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ افتادہ زمینوں کے مالکان کو نوٹس دیا جائے گا کہ وہ ایک مدت معینہ کے اندر اندر رقبہ کو زیر کاشت لائیں۔ بصورتِ دیگر حکومت اس زمین کو اپنی تحویل میں لے لیگی۔ یہ فیصلہ بھی بڑا مستحسن ہے۔ اس سے بھی اصولِ ملکیت کی عمارت متزلزل ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ جو چیز زید کی ملکیت میں ہے، زید کو حق حاصل ہے کہ اسے استعمال میں لائے یا دیسے ہی پڑا رہنے دے۔ قرآن اس قسم کا حق ملکیت اساسی طور پر کسی شے میں بھی تسلیم نہیں کرتا۔ نہ زر میں۔ نہ زمین میں (حتّٰی کہ نہ انسان کی اپنی جان میں)

یہ چیزیں نوعِ انسان کی منفعت کی ہیں اور انہیں قوانینِ خداوندی کے مطابق، اس مقصد کے لئے صرف میں لانا چاہیئے۔

یہ ہیں بہرحال، وہ چند موٹی موٹی تفصیلات، جو حکومت کے حالیہ فیصلہ کے سلسلے میں ان سطور کی تسوید تک سامنے آئی ہیں جیسا کہ ہم نے ابتدا میں لکھا ہے حکومت اپنے اس فیصلہ کے لئے مستحق تبریک و تہنیت ہے بہ ہیئتِ مجموعی۔ یہ زمین کے انتظام کے ضمن میں قرآنی نظام کی طرف قدمِ اول ہے جسے فی الحقیقت بڑی جرأت سے اٹھایا گیا ہے۔ یہی وہ احساسِ تشکر و تبریک ہے جس کے اظہار کے لئے حسبِ ذیل تار، قرآنک ریسرچ سینٹر اور ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے جنرل محمد ایوب خان، صدرِ مملکت پاکستان کی خدمت میں ارسال کیا گیا ہے۔

> زرعی اصلاحات کے جرأت مندانہ اقدام پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ قرآن کی رو سے زمین کو عوام کی ضروریات پورا کرنے کے لئے حکومت کی تحویل میں رہنا چاہیئے ان اصلاحات نے زمین پر ذاتی ملکیت کے غیر قرآنی اصول کی بنیادیں ہلا کر اور رقبوں کی تحدید سے قرآنی نظام کی طرف پہلا قدم اٹھایا ہے۔ اور بیباکانہ اٹھایا ہے۔ اس سے ملک کی معاشی حالت خوشگوار ہو جائے گی اور کمیونزم کا سیلاب رک جائے گا۔ خدا آپ کو مزید ہمت عطا فرمائے تاکہ آپ اس آئیڈیلوجی کو جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا تھا، عملی حقیقت بنا سکیں اور اس طرح یہ خطۂ زمین اسلامی نہج زندگی کا گہوارہ بن جائے۔

ہم اس مقام پر دہرا دیں کہ قرآنی نظامِ ربوبیت کے مطابق، تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی ذمہ داری حکومت کے سر پر ہوتی ہے۔ اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے حکومت، ذرائعِ پیداوار کو اپنی تحویل میں رکھتی ہے۔ ان پر ملکیت نہ افراد کی ہوتی ہے نہ مملکت کی۔ "ذرائعِ پیداوار" میں صرف زمین ہی شامل نہیں۔ دورِ حاضر میں کارخانے بھی یہی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اب حکومت، کارخانوں کے نظام کے متعلق بھی اسی قسم کی اصلاحات پر توجہ دے گی۔ اس لئے کہ جو خرابیاں زمین سے حاصل شدہ لامحدود دولت سے پیدا ہوتی ہیں اسی قسم کی خرابیاں کارخانوں سے حاصل کردہ لامحدود دولت سے بھی رونما ہوتی ہیں۔ قرآن ان خرابیوں کا علاج یہ بتاتا ہے کہ فاضلہ (ضرورت سے زیادہ) دولت کو کسی کے پاس بھی نہ رہنے دیا جائے۔ اسے قوانینِ خداوندی کے مطابق نوعِ انسانی کی منفعت

کے لئے عام کر دیا جائے۔ خدا کرے ہماری مملکت بتدریج اس منزل تک پہنچ جائے اور اس طرح ایک ایسے انسانیت ساز معاشی نظام کو متشکل کر دکھائے جس کے سامنے امریکہ اور روس دونوں کی نگاہیں جھک جائیں۔

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است

اِقبال اور اشتراکیت

(شائع شدہ اپریل ۱۹۶۳ء)

اقبال نے اپنے آپ کو "شاعرِ فردا" کہا تھا۔ چونکہ قوموں کی زندگی میں امروز و فردا صدیوں کے پیمانے سے ملپے جاتے ہیں اس لیے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس فردا کا طلوع کب ہوگا جب مسلمان اقبالؒ کے صحیح مقام اور اس کے پیغام کے صحیح مفہوم سے آشنا ہو سکے گا۔ لیکن یہ حقیقت تو ابھی سے بے نقاب ہونا شروع ہوگئی ہے کہ اقبال "دیارِ غیر" کا شاعر تھا۔ چنانچہ آج انگلستان، فرانس، جرمنی اور اٹلی میں اقبال کے کلام کے ترجمے شائع ہو رہے ہیں اور اس کی شرحیں لکھی جا رہی ہیں۔ لیکن خود پاکستان میں یہ حالت ہے کہ سال بھر کے بعد اپریل کے مہینے میں دو چار مقامات پر انفرادی طور پر "یومِ اقبال" کے جلسے منعقد کر لئے جاتے ہیں اور اس کے بعد اس "دفترِ بے معنی" کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ دوران سال میں اتنا ہوتا ہے کہ کبھی کسی قوال نے اقبال کی کوئی غزل گا دی یا کبھی ریڈیو والوں نے اپنے پروگرام کا خلا پُر کرنے کے لیے اس کی کوئی نظم سنا دی۔ یوں یاد قائم کی جا رہی ہے اُس شخص کی جس نے (اور تمام باتوں کو چھوڑیئے) اس قوم کو اس پاکستان کا تصور دیا۔ جس سے اب اس کی زندگی وابستہ ہے اور جس کی وجہ سے اسے وہ مواقع حاصل ہو گئے ہیں کہ اگر یہ چاہے تو دنیا کی ممتاز ترین قوموں کی صف میں جگہ پا سکتی ہے۔ اتنی بڑی احسان فراموشی مسلمانوں ہی سے ظہور میں آ سکتی تھی۔

ہمارے نزدیک اقبال کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے قوم کو پھر سے قرآن سے

آشنا کرانے میں مسلسل جدوجہد کی۔ اس میں شبہ نہیں کہ مملکت پاکستان بھی ایک گراں بہا نعمت ہے۔ لیکن اقبال کے الفاظ میں "مملکت ایک کوشش ہوتی ہے (قرآنی) نصب العینی اصولوں کو زمان و مکان میں صورت پذیر کرنے کی' یہ ایک آرزو ہوتی ہے ان اصولوں کو کسی خاص انسانی ادارہ میں روبہ عمل لانے کی"۔ یعنی اسلامی نقطۂ نگاہ سے مملکت کی اہمیت محض اس لئے ہوتی ہے کہ وہ انسانیت کے ان بلند مقاصد کو جنہیں قرآن نے عطا کیا ہے عملی پیکروں میں ڈھلنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اقبال کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے قرآن کے ان بلند مقاصد کو قوم کے سامنے بے نقاب کیا اور انہیں بتایا کہ ان کی زندگی اور سرفرازی کا راز انہی مقاصد کی عملی شکیل میں ہے۔

اقبال نے جو کچھ سمجھا قرآن سے سمجھا' اور جو کچھ سمجھایا قرآن سے سمجھایا۔ قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے بلند مقاصد کو اصولی طور پر بیان کرتا ہے اور ان کی جزئیات کو بالعموم غیر معین چھوڑ دیتا ہے تاکہ قرآن پر عمل کرنے والی قوم ان جزئیات کو اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں خود متعین کرتی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس دور میں زندگی کا کوئی تقاضہ نمایاں حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس تقاضے سے متعلق قرآن کے اصول بھی نمایاں طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ ہمارے دور میں انسانی زندگی کے جس تقاضے نے سب سے زیادہ نمایاں حیثیت اختیار کی ہے، وہ روٹی کا مسئلہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب سے انسان نے تمدنی زندگی شروع کی ہے روٹی کا مسئلہ اس کے ساتھ ساتھ رہا ہے۔ لیکن اس مسئلہ نے ایک عالمگیر تقاضے کی حیثیت ہمارے ہی دور میں اختیار کی ہے۔ یہ غیر ممکن تھا کہ اقبال جو زندگی کے تقاضوں پر قرآن کی روشنی میں غور کرتا تھا۔ اپنے دور کے ایسے اہم تقاضے سے غیر متاثر رہتا اور قرآن نے اس باب میں جو راہ نمائی دی ہے اسے پیش نہ کرتا۔ اقبال کا پہلا دور، ان بڑھتے ہوئے تقاضوں سے متاثر ہونے کا ہے۔ دوسرا دور اس حل پر غور و فکر کرنے کا اور اسے قرآنی روشنی میں پرکھنے کا ہے جو تنہا عقل انسانی نے اس مشکل کے لئے دریافت کیا۔ اور تیسرا دور وہ ہے جس میں اس نے اس مشکل کا قرآنی حل پیش کیا ہے۔ اس اثر پذیری کی آواز ہم سب سے پہلے "خضر راہ" میں سنتے ہیں۔ جب وہ خضر سے سوال کرتے ہیں کہ

زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے؟
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

اور اس کے جواب میں خضر کہتا ہے

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے — خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر — شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے

مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اس کے بعد پیامِ مشرق میں دیکھئے۔ وہ "صحبتِ رفتگاں" کے عنوان میں ٹالسٹائی، کارل مارکس، ہیگل، مزدک، کوہکن وغیرہ سب کو جمع کرتے ہیں اور ان کی زبان سے اس اہم تقاضے کی ترجمانی مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے کرتے ہیں، ٹالسٹائی کہتا ہے۔

بارکشِ اہرمن لشکری شہر یار — از پئے نانِ جویں تیغِ ستم برکشید

داروئے بیہوشیش تاج، کلیسا، وطن — جانِ خدا داد او را خواجہ بجامے خرید

کارل مارکس کہتا ہے۔

رازدانِ جزو و کل از خویش نامحرم شد است

آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شد است

ہیگل اپنا فلسفہ اضداد پیش کرتا ہے، اور ٹالسٹائی اسے "عقلِ دو رو" کی چابک دستی قرار دے کر اس کی تردید کرتا ہے۔ مزدک اعلان کرتا ہے کہ

دورِ پرویزی گذشت اے کشتۂ پرویز خیز

نعمتِ گم کردۂ خود را ز خسرو باز گیر

فرانسیسی فلاسفر کومٹ مزدور کو یہ سبق دیتا ہے کہ ——— نیابد ز محمود کار ایاز ——— اور مزدور ایک پرمعنی تبسم سے جواب دیتا ہے کہ

حق کوہکن دادی اے نکتہ سنج

بہ پرویز پرکار و نا بردہ رنج

آخر میں "قسمت نامۂ سرمایہ دار و مزدور" میں وہ ان دونوں کا تقابل نہایت وضاحت اور خوبصورتی سے

کرتا ہے جہاں سرمایہ دار مزدور سے کہتا ہے کہ

غوغائے کارخانہ آہن گری ز من | گلبانگ ارغنونِ کلیسا از آنِ تو
نخلے کہ شہ خراج بروی نہد ز من | باغ بہشت و سدرۂ و طوبیٰ از آنِ تو
ایں خاک و آنچہ در شکمِ او از آنِ من | وز خاک تا بہ عرشِ معلیٰ از آنِ تو

اور اس کے بعد "نوائے مزدور" میں کہتا ہے کہ

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگِ ساز | مئے کہ شیشہ گداز د بہ ساغر اندازیم
مغان و دیر مغاں را نظامِ تازہ دہیم | بنائے میکدہ ہائے کہن برا ندازیم
ز رہزنانِ چمن انتقام لالہ کشیم | بہ بزمِ غنچہ و گل طرحِ دیگر اندازیم

یہی دعوتِ انقلاب ہے جسے ہم "زبورِ عجم" میں اس سے بھی تیز انداز میں دیکھتے ہیں۔ جہاں اقبال کہتا ہے کہ

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب | از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام | آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

"بالِ جبریل" میں "فرشتوں کا گیت" اسی نظامِ سرمایہ پرستی کی تباہ انگیزیوں کے خلاف صدائے احتجاج ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر | تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست | بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

یہی وہ احتجاج ہے جس کے جواب میں خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم ملتا ہے

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو | کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی | اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اسی کتاب میں لینن کا وہ مشہور شکوہ بھی ہے جس میں وہ خدا سے کہتا ہے کہ

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

یہ ہیں نظام سرمایہ پرستی کے انسانیت سوز نتائج جنہیں اقبال کی نگہ بصیرت نے بھانپا اور جو اس کے قلب حساس کی گہرائیوں سے نشتروں کی شکل میں سطح سے اوپر ابھرے۔ یہی ہیں وہ اشعار جنہیں کمیونسٹ اپنے جلسوں اور جلوسوں میں گاتے ہیں اور ان سے ثابت کرتے ہیں کہ اقبال بھی کمیونسٹ تھا لیکن اقبال کمیونسٹ نہیں تھا، نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ ہو سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کمیونزم کے دو حصے ہیں۔ ایک تو ان کا یہ دعویٰ کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ رزق کو سمیٹ کر اپنے قبضہ میں لیلے جبکہ غریب اور ان کے بچے بھوکوں مر رہے ہوں۔ جہاں تک اس دعوے کا تعلق ہے اس کا ہر وہ مسلمان ہمنوا ہے۔ جو قرآن سے راہ نمائی حاصل کرتا ہے۔ اس لئے اقبال بھی اس کا ہمنوا تھا۔ اسے اس کا ہمنوا ہونا چاہیئے تھا لیکن دوسری چیز ہے کمیونزم کا وہ فلسفہ جس پر وہ اس دعوے کی بنیاد رکھتے ہیں۔ یعنی ہیگل کی جدلیت اور کارل مارکس کی تاریخ کی معاشی تعبیر۔ یہ وہ فلسفہ ہے جس کی تائید کوئی مسلمان نہیں کر سکتا اور چونکہ اقبال مسلمان تھا اس لئے وہ اس فلسفہ کا سخت مخالف تھا۔ چنانچہ وہ غلام السیدین کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں (جو ۱۹۳۶ء میں لکھا گیا تھا) کہ

> سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے مخالف ہیں، اور اسے افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے سیاسی مفہوم کا...... جو روحانیت میرے نزدیک مغضوب ہے۔ یعنی افیونی خواص رکھتی ہے اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال کارل مارکس کو "کلیم" تو کہتا ہے لیکن بے تجلی اور "مسیح" قرار دیتا ہے لیکن بے صلیب۔ حتیٰ کہ وہ جاوید نامہ میں افغانی کی زبان سے یہ کہلاتا ہے ؎

صاحب سرمایہ از نسلِ خلیل | یعنی آں پیغمبر بے جبرئیل
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است | قلب او مومن دماغش کافر است
غربیاں گم کردہ اند افلاک را | در شکم جویند جانِ پاک را

دین آں پیغمبر ناحق شناس
بر مساواتِ شکم دارد اساس

وہ کہتا ہے کہ جب روٹی کے مسئلہ کو خاص مادی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش کی جائے تو اس سے انسان حیوانی سطح پر تو زندہ رہ سکتا ہے لیکن اس کی انسانیت یکسر مردہ ہو جاتی ہے۔ لہذا اس قسم کی اشتراکیت ہو، یا مغرب کی ملوکیت، انسانیت کے حق میں دونوں کا نتیجہ ایک ہے۔

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب | ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب
زندگی ایں را خروج آں را خراج | درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل | ہر دو را تن روشن و تاریک دل

زندگانی سوختن با ساختن
در گلے تخمِ دلے انداختن

یہی "سوختن با ساختن" ہے جسے اقبال لاؔ اور اِلّاؔ سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ روس کا اشتراکی نظام درحقیقت لاؔ کے گرداب میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کی تمام کوششیں تخریبی ہی تخریبی ہیں۔ وہ "ساختن" یعنی اِلّاؔ (تعمیر) کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔ چنانچہ وہ "پس چہ باید کرد" میں روس کی اسی کشمکش کے بارے میں کہتا ہے۔

روس را قلب و جگر گردیدہ خوں | از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں
آں نظامِ کہنہ را برہم زد است | تیز نیشے بر رگِ عالم زد است
کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ! | لا سلاطیں لاؔ کلیسا لاؔ الٰہ

فکر او در تند بادِ لا بماند
مرکبِ خود را سوئے اِلّا نراند

یہاں سے وہ تیسرا دور شروع ہوتا ہے؛ جہاں اقبال اس اہم تقاضے کے متعلق قرآنی حل

پیش کرتا ہے وہ سب سے پہلے "سوختن اور ساختن" کے اصول کو لیتا ہے اور کہتا ہے کہ

نکتہ می گویم از مردانِ حال — امتاں را "لا" "جلال" "اِلّا" جمال
لا و اِلّا احتسابِ کائنات — لا و اِلّا فتحِ بابِ کائنات
بردو تقدیرِ جہانِ کاف و نون — حرکت از لا زاید از اِلّا سکون
در مقامِ لا نیاساید حیات — سوئے اِلّا می خرامد کائنات

لا و اِلّا سازو برگِ امتاں
نفی بے اثبات مرگِ امتاں

لا کے معنی ہیں ہر غلط نظام کو تباہ کردینا۔ اور اِلّا کے معنی ہیں اس کی جگہ ایک صحیح نظام قائم کرنا یہ صحیح نظام صرف مستقل اقدار کی بنیادوں پر قائم کیا جاسکتا ہے' اور مستقل اقدار عقل کی رد سے کبھی نہیں مل سکتیں۔ یہ اقدار صرف وحی کی رو سے مل سکتی ہیں اس لئے کہ

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر — سودِ خود بیند، نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ — در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

اسی لئے اقبال نے افغانی کی زبانی (جاوید نامہ میں) روس کو یہ پیغام دیا تھا کہ

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی — دل ز دستورِ کہن پرداختی
کردۂ کارِ خداوندان تمام — بگذر از لا جانبِ اِلّا خرام
در گذر از لا اگر جویندۂ — تارہِ اثبات گیری زندۂ

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے
جستۂ اورا اساسِ محکمے؟

اقبالؒ کے نزدیک نظامِ عالم کے لئے اس قسم کی محکم اساس[1] قرآن کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ اسی لئے اس نے روس سے کہا کہ

داستانِ کہنہ شستی باب باب — فکر را روشن کن از امّ الکتاب

---

[1] اس اجمال کی تفصیل "اساس محکم" کے عنوان سے جداگانہ مقالہ میں ملے گی جو چند صفحات آگے چل کر سامنے آئے گا۔

اس کے بعد وہ کہتا ہے

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغام مرگ　　دستگیر بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو　　لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا
با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ　　ہرچہ از حاجت فزوں داری بدہ

اقبال کو خالی تخریبی پروگرام کی نامکملی پر اس قدر یقین تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ روس زیادہ دیر تک تخریب کے گرداب میں رہ نہیں سکتا۔ چنانچہ اس نے اپنی مثنوی "پس چہ باید کرد" میں یہاں تک کہہ دیا کہ

آیدش روزے کہ از زورِ جنوں
خویش را زیں تند باد آرد بروں

اقبال اپنے ایک خط میں جو انہوں نے سر فرانسس ینگ ہزبنڈ کو ۱۹۳۱ء میں لکھا تھا (اور جو ۳۱ جولائی کے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں شائع ہوا تھا) لکھتے ہیں۔

"ذاتی طور پر میں نہیں سمجھتا کہ روسی فطرۃً لامذہب ہیں۔ اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ روسی عورتیں اور مرد بڑے مذہبی رجحانات رکھتے ہیں اور روسی ذہن کا موجودہ منفی رجحان ہمیشہ باقی نہیں رہے گا کیونکہ کوئی عمرانی نظام دہریت کی اساس پر باقی نہیں رہ سکتا۔ جونہی اس ملک میں حالات ٹھیک ہو جائیں گے اور اس کے باشندوں کو اطمینان سے غور کرنے کا وقت ملے گا۔ وہ مجبوراً اپنے نظام کی کوئی مثبت بنیاد تلاش کریں گے۔ چونکہ بالشویت کے ساتھ خدا کا قائل ہونا اور اسلام قریب قریب ایک ہی چیز ہیں۔ اس لئے مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوگا۔ اگر کچھ زمانے کے بعد روس اسلام کو ہضم کرلے یا اسلام روس کو۔"

لیکن اقبال ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو ہمیشہ اس انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں کہ یورپ کا فلاں ملک مسلمان ہو جائے تو مسلمان کا بول بالا ہو جائے اور ہماری بھی قسمت جاگ اٹھے۔ وہ مسلمانوں سے ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ تمہاری قسمت تمہارے اپنی ہاتھوں ہی سے بیدار ہوگی۔ لہٰذا اس نے مسلمانوں سے کہا کہ اس وقت زمانے کے تقاضوں سے جو معاشی کشمکش پیدا ہو رہی ہے، تم اس کی روشنی میں قرآن پر غور کرو۔ یہ قرآن تمہیں ایسی راہنمائی دیدے گا جس سے نہ صرف یہ کہ تمہاری قسمت بیدار ہو جائے گی بلکہ تمام اقوامِ عالم کی قیادت تمہارے حصہ میں آجائے گی۔ چنانچہ وہ ضربِ کلیم میں کہتے ہیں کہ

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم ‫—‬ بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار
اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور ‫—‬ فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا ‫—‬ کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں ‫—‬ اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

جو حرف "قُلِ العَفْو" میں پوشیدہ ہے ابتک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

چنانچہ جب خود اقبال نے زمانہ کے ان تقاضوں کی روشنی میں قرآن میں غور کیا تو اس کے سامنے یہ حقیقت آگئی کہ قرآن کی رو سے رزق کے فطری سرچشموں پر کسی کی انفرادی ملکیت کا تصور یکسر باطل ہے۔ خدائے رب العالمین نے سامان رزق کو تمام نوع انسانی کی پرورش کے لئے عام کر رکھا ہے۔ اس لئے اسے اس مقصد کے لئے عام ہی رہنا چاہیئے۔ رزق کے سرچشمے زمین سے پھوٹتے ہیں۔ اس لئے زمین کے متعلق اقبال صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ

حق زمیں را جز متاعِ ما نہ گفت ‫—‬ ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
دہ خدایا نکتۂ از من پذیر ‫—‬ رزق و گور از وے بگیر او را مگیر
باطنِ "الارض للہ" ظاہر است ‫—‬ ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است
رزقِ خود را از زمیں بردن رواست ‫—‬ ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست

آب و نانِ ماست از یک مائدہ
دودۂ آدم "کَنَفْسٍ وَّاحِدَہ"

بالِ جبریل میں قرآن کی اس حقیقت کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ جہاں لکھا گیا ہے کہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون ‫—‬ کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ ‫—‬ خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب ‫—‬ موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں، میری نہیں!

اقبال' پاکستان کا حصول بھی اسی مقصد کے لئے چاہتے تھے کہ یہاں خدا کے اس قانون کو رائج کیا جا سکے' چنانچہ انہوں نے اپنی وفات سے صرف ایک سال پہلے قائد اعظم کو ایک خط میں لکھا کہ

" روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ گذشتہ دو سو سال سے ان کی حالت مسلسل گرتی چلی جا رہی ہے...... لیگ کا مستقبل اس امر پہ موقوف ہے کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لئے کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر لیگ کی طرف سے مسلمانوں کو افلاس کی مصیبت سے نجات دلانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی تو مسلمان پہلے کی طرح اب بھی لیگ سے بے تعلق ہی رہیں گے...... شریعت اسلامیہ کے طویل وعمیق مطالعے کے بعد میں اس نتیجہ پہ پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریق پہ سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم معمولی معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے ...... اسلام کے لئے سوشل ڈیموکریسی کی کسی موزوں شکل میں ترویج' جب اسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل ہو حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا...... ان مسائل کے حل کے لئے ملک کی تقسیم کے ذریعہ ایک یا زائد اسلامی ریاستوں کا قیام اشد لازمی ہے "

یعنی اقبال کے نزدیک ایک الگ اسلامی مملکت کی ضرورت ہی اس لئے تھی کہ یہاں اسلامک سوشلزم کا نفاذ کیا جا سکے۔ جیسا کہ اقبال کو خود اندیشہ تھا' لیگ نے اس باب میں کچھ نہ کیا۔ جس کا نتیجہ لیگ اور اس کے ساتھ سارا ملک بھگت رہا ہے۔

اپریل ۶۳ ۱۹ء

ربٰو کی بحث

(کیا معاوضہ محنت کا ہے یا سرمایہ کا؟)

[آج سے کچھ عرصہ پہلے پاکستان میں یہ بحث بہت زوروں پر تھی کہ اسلام نے جس سود کو حرام قرار دیا ہے اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اس سلسلہ میں بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد سود مفرد ہے۔ سود در سود (سود مرکب) نہیں۔ ایک گوشے سے یہ آواز بلند اٹھی کہ کسی کو بھی ضروریات کے لئے قرضہ دے کر سود لینا تو حرام ہے لیکن کمرشل انٹرسٹ جائز ہے۔ کمرشل انٹرسٹ سے مراد ہے کسی کو تجارت کی غرض سے قرض دینا۔ بعض نے یہ بھی کہا کہ بینک کا سود جائز ہے۔ غرضیکہ عجیب نیاں نئی باتیں سننے میں آئیں۔ اس سلسلہ میں طلوع اسلام کی فروری ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں، اس موضوع پر کچھ تفصیلاً لکھا گیا، جسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ بات سامنے آجائے گی کہ ربٰو درحقیقت ایک ایسی اساس کا نام ہے جس پر ایک ایسے معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے جو اسلام کے معاشی نظام کی ضد ہے۔ اسی لئے قرآن نے ربٰو کو "خدا اور رسولؐ (اسلامی نظام) کے خلاف اعلان جنگ" سے تعبیر کیا ہے۔]

قرآن کی رُو سے ربٰو کی تعریف

قرآن کی رُو سے ربٰو کی جامع الممانع تعریف ان چار الفاظ کے اندر موجود ہے۔ جو سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۷۹ میں آئے ہیں۔

یعنی

وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ

اور اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لئے تمہارا راس المال ہے۔

سابقہ آیت میں کہا گیا ہے کہ اگر تم ربوٰ لینے سے باز نہ آئے تو اسے خدا اور رسول کے خلاف بغاوت سمجھا جائیگا۔ اس کے بعد مندرجہ بالا آیت میں کہا ہے کہ اگر تم ربوٰ لینے سے باز آجاؤ اور توبہ کرو تو تم اپنا اصل زر واپس لے لو۔ اس کے بعد ہے

لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ○ (۲/۲۷۹)

اس سے نہ تم کسی پر ظلم کروگے نہ تم پر ظلم ہوگا۔

اس سے واضح ہے کہ

(۱) اگر صرف اصل زر واپس لیا جائے تو اس سے مقروض پر ظلم نہیں ہوتا۔

(۲) اگر اصل زر سے کچھ بھی زیادہ لیا جائے تو یہ مقروض پر ظلم ہوگا۔

اسی کا نام ربوٰ ہے۔ یعنی زر اصل سے کچھ بھی زیادہ لینا۔ کہئے کہ اس میں کوئی الجھاؤ۔ کسی قسم کا التباس کوئی شک و شبہ کوئی دشواری یا اشکل ہے؟

۲۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ سود در سود (سود مرکب) تو حرام ہے لیکن سود مفرد حرام نہیں، تو یہ نتیجہ یونہی غلط ہے۔ یہ نتیجہ حسب ذیل آیت سے نکالا جاتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوۤا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (۳/۱۲۹)

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔

اے ایمان والو! یہ دو چند سہ چند ہونے والا ربوٰ کھانا چھوڑ دو۔

امام راغب نے کہا ہے کہ اس آیت میں مُضٰعَفَةً در اصل ضَعْفٌ سے ہے جس کے معنی "کم کرنے" کے ہیں۔ ضِعْفٌ سے نہیں جس کے معنی بڑھانے کے ہیں۔ لہذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ ربوٰ جسے تم سمجھ رہے ہو کہ اپنے روپے کو بڑھانا ہے، بڑھانا نہیں بلکہ در حقیقت (ضَعْفٌ) کم کرنا ہے۔ ربوٰ سے معاشرہ کی دولت کم ہوتی ہے اور سود خوار کی کمانے کی صلاحیتوں اور قوتوں میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس سے قومی معیشت بہت گھٹ جاتی ہے۔ بڑھتی نہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے لئے کسی دلیل اور شہادت

کی ضرورت نہیں۔ ربٰو سے افراد کے کمانے کی صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔ اور قومی دولت میں کمی آجاتی ہے۔

قرآن کی رو سے ربٰو کے معنی ہیں، اصل زر سے کچھ زیادہ لینا۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس زیادتی کا تعلق صرف قرض کے معاملات سے ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ یہ ایک جامع اصول ہے اور قرآنی نظامِ معیشت کی پوری عمارت اسی بنیاد پر اٹھتی ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا معاوضہ محنت (LABOUR) کا ہے یا سرمایہ (CAPITAL) کا بھی۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ

معاوضہ کس چیز کا جائز ہے

لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (۵۳/۳۹)۔ انسان صرف اپنی محنت کے معاوضہ کا حقدار ہے۔ سرمایہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا معاوضہ طلب کیا جائے۔ لہٰذا لین دین کے جس معاملہ میں محنت کے بغیر محض سرمایہ کا معاوضہ لیا جائے، خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ وہ ربٰو ہے، قرآن کریم کی رُو سے حرام ہے، اور خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ کے مرادف۔ آپ غور کیجئے کہ ایک کاشتکار آپ سے ایک ہزار روپیہ قرض مانگتا ہے تاکہ وہ ایک قطعہ اراضی خرید کر اس میں کاشت کرے۔ اور اس کی آمدنی سے اپنا پیٹ بھی پالے اور آہستہ آہستہ آپ کا

ربٰو کی مختلف شکلیں

قرضہ بھی ادا کر دے۔ آپ اسے ایک ہزار روپیہ قرض نہیں دیتے۔ لیکن اسی روپیہ سے وہ قطعہ اراضی خرید کر اسے بٹائی یا پٹہ پر دیدیتے ہیں۔ وہ اس میں سال بھر محنت کر کے فصل بوتا ہے اور اس میں سے نصف پیداوار آپ لے جاتے ہیں۔ یہ ہر سال ہوتا ہے اور اس کے باوجود آپ کا قرض بدستور باقی رہتا ہے۔ کیا یہ ربٰو نہیں؟

یا ایک دوکاندار آپ سے کچھ قرض مانگتا ہے تاکہ وہ اس سے اپنے روزگار میں کچھ اضافہ کر سکے آپ اسے روپیہ دیدیتے ہیں لیکن بطور قرض نہیں بلکہ بطور حصہ دار۔ وہ دن رات کی محنت شاقہ سے کاروبار کرتا ہے لیکن اس کے منافع میں آپ برابر کے شریک ہو جاتے ہیں۔ وہ آپ کو منافع کا حصہ دیئے چلا جاتا ہے لیکن آپ کا اصل زر اس کے ذمہ بدستور باقی رہتا ہے۔ کیا یہ ربٰو نہیں؟

یا، آپ اس کاروباری آدمی کو براہ راست قرض نہیں دیتے۔ آپ اپنا روپیہ بینک میں جمع کر دیتے ہیں اور بینک والے اس روپے کو بطور قرض، اس کاروباری آدمی کو دیدیتے ہیں۔ وہ اس قرض پر جو سود

ادا کرتا ہے اس میں سے ایک متعین حصہ آپ کو ملتا رہتا ہے۔ اور آپ کا اصل زر بینک کے پاس محفوظ رہتا ہے۔ کیا یہ ربٰو نہیں؟ یہ سب ربٰو ہے اور قرآن کی رو سے ناجائز۔ خواہ اسے سود مفرد کے حساب سے شمار کیا جائے۔ یا سود مرکب کے حساب سے۔

جو کچھ ہم لیتے ہیں آپ غور کیجئے تو بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ جو کچھ ہم دوسروں سے لیتے ہیں اس کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً

(۱) عطیہ۔ اس میں نہ محنت کرنی پڑتی ہے نہ سرمایہ لگانا پڑتا ہے۔ دینے والا اسے واپس لینے کے خیال کے بغیر تحفتہً دیتا ہے۔ لہٰذا اسے لین دین کی مد میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی صورت اس "صدقہ" کی ہے جسے کسی ضرورتمند کے لئے حسبتہً للہ دیا جاتا ہے۔ قرآن کی رُو سے وہ ضرورتمند اس امداد کو معاشرہ سے بطور اپنے حق کے طلب کر سکتا ہے۔ اس لئے اس میں بھی لین دین کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(۲) اُجرت۔ یہ محنت کا معاوضہ ہوتا ہے اس میں سرمایہ کچھ نہیں لگایا جاتا۔

(۳) ربٰو۔ اس میں دوسرے کو سرمایہ دیا جاتا ہے اور اس سرمایہ پر اصل سے زائد وصول کیا جاتا ہے۔ سرمایہ دینے والا محنت نہیں کرتا۔ بلکہ دوسرے کی محنت کا ایک حصہ وصول کر لیتا ہے۔

(۴) منافع (دتجارت میں) اس میں سرمایہ بھی لگایا جاتا ہے۔ اور محنت بھی کی جاتی ہے۔

(۵) قمار۔ (جوا) اس میں نہ سرمایہ لگایا جاتا ہے نہ محنت کی جاتی ہے۔

رشق اول کو چھوڑ کر) آپ باقی شکلوں کو دیکھئے۔ جہاں معاوضہ محنت کا نہیں، اسے قرآن جائز قرار نہیں دیتا۔ اس کا اصول یہ ہے کہ معاوضہ محنت کا ہے۔ چونکہ یہ اصول لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھا اس لئے ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ بیع کے منافع اور ربٰو

معاوضہ محنت کا ہے میں فرق کیا ہے؟ ایک شخص سو روپے کی چیز خرید کر ایک سو دس روپے میں بیچتا ہے اسے دس روپے اصل زر سے زائد وصول ہو جاتے ہیں۔ دوسرا شخص کسی کو سو روپیہ قرض دیکر اس سے ایک سو دس روپے وصول کرتا ہے اس سے اُسے بھی دس روپے اصل زر سے زیادہ ملتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ جب یہ دونوں، اصل زر پر زائد ہیں تو ان میں فرق کیا ہے؟ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (۲۷۵/۲)۔ وہ بیع اور ربٰو کو ایک جیسا سمجھتے تھے لیکن قرآن کریم نے کہا کہ یہ ان کی بھول ہے۔ یہ دونوں ایک نوعیت کا معاملہ نہیں۔ بیع میں سرمایہ اور محنت دونوں صرف ہوتے ہیں۔ سرمایہ کے

بیع اور ربوٰ میں فرق

بدلے میں سرمایہ واپس آجاتا ہے۔ اور دکان دار کو اس کی محنت کا معاوضہ سرمایہ کے علاوہ ملتا ہے۔ یہ حلال ہے کیونکہ یہ اس کی محنت کا معاوضہ ہے۔ لیکن ربوٰ میں صرف سرمایہ لگتا ہے۔ محنت کچھ صرف نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس میں جو کچھ زائد ملتا ہے وہ سرمایہ کا معاوضہ ہے جو حرام ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کی رو سے اصول یہ ہے کہ

(۱) محنت کا معاوضہ لینا حلال ہے۔ اور

(۲) سرمایہ پر زائد لینا حرام۔

اگر تجارت میں بھی کوئی شخص، اپنی محنت سے زائد منافع لیتا ہے تو ربوٰ ہے۔ کیونکہ یہ سرمایہ کا معاوضہ ہوگا۔ محنت کا نہیں۔ اس بات کا تعین معاشرہ کرے گا کہ اس شخص کی محنت کا معاوضہ کیا ہونا چاہیئے۔ وہ اس معاوضہ سے زیادہ منافع نہیں لے سکتا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بیع (تجارت) میں انسان (RISK) لیتا ہے۔ یعنی اس میں نفع اور نقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ اور ربوٰ میں (RISK) نہیں ہوتا۔ لیکن حلت اور حرمت کے لئے یہ معیار تفریق صحیح نہیں۔ اگر کسی آمدنی کو حلال قرار دینے کی شرط (RISK) ہو تو جوا عین حلال ہونا چاہیئے کیونکہ اس میں تو ہر داؤ میں (RISK) ہوتا ہے۔ بیع اور ربوٰ میں فرق وہی ہے جسے اوپر بیان کیا گیا ہے۔ بیع میں (راس المال + محنت کا معاوضہ) واپس ملتا ہے اور ربوٰ میں (راس المال + راس المال کا معاوضہ) ملتا ہے۔ محنت کا معاوضہ حلال ہے۔ راس المال کا معاوضہ حرام۔

دشواریاں کیوں پیش آتی ہیں؟

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی رو سے ربوٰ کا مسئلہ کس قدر آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس میں جو دشواریاں آجکل پیش آرہی ہیں ان کی وجہ یہ ہے کہ

(۱) ربوٰ کی بہت سی شکلیں ایسی ہیں جنہیں قرآنِ کریم حرام قرار دیتا ہے لیکن (بدقسمتی سے) ہماری مروجہ شریعت اسے حلال قرار دیتی ہے۔ (مثلاً زمین کی بٹائی (مزارعت) یا مضاربت۔ یعنی کاروبار میں ایسی شراکت جس میں ایک پارٹی محض سرمایہ پر منافع وصول کرتی ہے۔ یا تجارت میں جس قدر بھی منافع لیا جا سکے وغیرہ) ہمارے ارباب شریعت اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی غلطی کو تسلیم کر لیں۔ اس لئے وہ ربوٰ کی تعریف ایسی کریں گے جس کی رو سے یہ شکلیں ربوٰ کی شق میں نہ آسکیں۔

(۲) سرمایہ دار طبقہ، بلا محنت روپیہ حاصل کرنے کا اس قدر خوگر ہو چکا ہے کہ محنت کے تصور سے انہیں پسینہ آجاتا ہے۔ اس لئے وہ ربوٰ کے قرآنی تصور کی طرف آنا ہی نہیں چاہتے۔

(۳) اور سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ ہمارا موجودہ معاشی نظام غیر قرآنی ہے۔ بجائے اس کے

پیوندسازی سے کام نہیں چلے گا

کہ ہم اس نظام کو قرآنی نظام سے بدلیں، چاہتے ہیں کہ اس میں پیوند لگا کر اپنے آپ کو دھوکا دے لیں کہ یہ قرآنی ہوگیا ہے۔ لیکن وہ پیوند، اصل کے ساتھ فٹ نہیں بیٹھتا۔ اس لئے ہم کوشش یہ کرتے ہیں کہ اس میں کچھ کتر بیونت کر کے اسے کسی نہ کسی طرح اصل کے ساتھ چپکا دیا جائے۔ لیکن یہ کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ قرآنی نظام ایک غیر منقسم وحدت ہے۔ اس میں غیر قرآنی پیوند کبھی فٹ بیٹھ ہی نہیں سکتا۔ قرآن کے معاشی نظام کی رُو سے۔

(ا) زمین ذریعۂ رزق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے (ہوا۔ پانی۔ روشنی کی طرح) نوعِ انسان کی پرورش کے لئے بلا مزد و معاوضہ عطا کیا ہے۔ اس پر ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ امت کی تحویل میں رہے گی تاکہ وہ اس سے تمام افراد کو رزق پہنچانے کا انتظام کرے۔ زمین سے مراد ہے ہر وہ چیز جو زمین سے برآمد ہو۔ اس میں اناج اور مصنوعات کے لئے خام مسالہ سب آجاتے ہیں۔

(ب) اس نظام میں کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت (SURPLUS MONEY) رہ نہیں سکتی۔ اس لئے افراد کے لئے جائیدادیں کھڑی کرنے یا ویسے ہی روپیہ (INVEST) کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(ج) اس میں تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری نظام پر عائد ہوتی ہے۔ اس لئے کسی کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے کسی کا دستِ نگر نہیں ہونا پڑتا۔ لہٰذا اس میں سودی لین دین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(د) حتیٰ کہ اس میں انفرادی تجارت کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اس میں دوکاندار اشیائے ضروریات تقسیم کرنے کی ایجنسی ہوگا۔ اسے نفع اندوزی کا ذریعہ نہیں بنایا جائے گا۔ اس کی محنت کا معاوضہ نظام کی طرف سے ملے گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس نظام میں ربوٰ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حقیقت

دو متضاد نظام

یہ ہے کہ ربوٰ سود کا نام نہیں۔ یہ ترجمان ہے اس معاشی نظام کا جو قرآن کے معاشی

نظام کی یکسر ضد ہے — قرآنی نظام میں ہر فرد زیادہ سے زیادہ محنت کرکے کم از کم اپنے پاس رکھ کر زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دیتا ہے۔ غیر قرآنی نظام میں، ہر فرد کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ محنت دوسرے کریں اور اسے بلا محنت زیادہ سے زیادہ ملتا جائے۔ یہ دونوں نظام اس قدر ایک دوسرے کی ضد ہیں کہ قرآن نے اس نظام کو "خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ" قرار دیا ہے۔ یہ نظام فی الواقعہ قرآنی نظام سے بغاوت ہے۔ اب اس کے بعد آپ یہ سوچئے کہ کیا یہ کسی طرح ممکن ہے کہ ہمارا نظام تو غیر قرآنی رہے اور ہم اس کے اندر رہتے ہوئے ربوٰ کے مسئلہ کا کوئی اطمینان بخش حل تلاش کر لیں۔ اس قسم کی کوشش ہم نے اس سے پہلے اپنے جاگیرداری اور زمینداری دور (عہد عباسیہ) میں کی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے زمین کی بٹائی۔ مضاربت، تجارت میں غیر محدود منافع وغیرہ کو جائز قرار دے کر اپنے آپ کو فریب دے لیا۔ جو کوشش اب ہو رہی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم بینکوں کے سود یا صنعتی اداروں کے حصّوں پر منافع وغیرہ کو جائز قرار دے کر اپنے آپ کو فریب در فریب میں مبتلا کر لیں گے۔

بینکوں کے سود کی مخالفت

بینکوں کے سود وغیرہ کے سلسلے میں اس وقت جو مخالفت قدامت پرست طبقہ کی طرف سے ہو رہی ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ حضرات اسے اسلامی نظام معیشت کے خلاف پاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بینکوں کے سود کا مسئلہ اُس وقت موجود نہیں تھا۔ جب ہماری فقہ مرتب ہوئی ہے۔ اسے اب "جائز" کی فہرست میں داخل کرنا ان کے نزدیک "بدعت" ہے۔ اگر یہ شکل اس وقت موجود ہوتی تو جس طرح زمین کی بٹائی اور مضاربت وغیرہ جائز قرار دی گئی تھیں، ممکن ہے یہ بھی اسی فہرست میں شامل ہو جاتا۔ بینک کا سود تو بٹائی وغیرہ کے مقابلہ میں استحصال (EXPLOITATION) کی بہت نرم شکل ہے۔

اشتراکیت کی آڑ

لیکن اس سلسلے میں سب سے بڑی دشواری ایک اور ہے اور وہ یہ کہ ہمارے زمانے میں اشتراکیت (کمیونزم) نے ایک ایسے نظام کی طرح ڈالی ہے جو نظام سرمایہ داری کی ضد ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اشتراکی نظام اور اسلامی نظام کی بعض جزئیات کی باہمی مماثلت (یعنی ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہونا) فطری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اشتراکی فلسفۂ زندگی اسلامی فلسفۂ حیات کی ضد ہے۔ اس چیز کو ہمارا قدامت پرست، مذہبی طبقہ ایک مؤثر حربہ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ:-

(۱) مذہبی پیشوائیت اور نظام سرمایہ داری کا گٹھ جوڑ شروع سے چلا آرہا ہے۔ مذہبی پیشوائیت بجائے خویش، نظام سرمایہ داری ہی کی ایک شاخ ہے۔ نظام سرمایہ داری کی اصل و بنیاد یہ ہے کہ محنت کئے بغیر دولت حاصل ہو جائے۔ محنت نہ مذہبی پیشوا کرتے ہیں نہ سرمایہ دار، سرمایہ دار تو پھر بھی روپیہ لگا کر روپیہ حاصل کرتے ہیں۔ مذہبی پیشوا بغیر روپیہ لگائے دوسروں کی کمائی بٹور لیتے ہیں۔ یہ سرمایہ داری کی شدید ترین شکل ہے۔ لہٰذا مذہبی پیشوائیت کی طرف سے قرآنی نظام معاشی کی مخالفت فطری امر ہے۔

(۲) لیکن ان میں اتنی جرأت ہے نہیں کہ یہ کھلے بندوں قرآنی نظام کی مخالفت کریں۔ نہ ہی ان کے پاس ایسے دلائل ہیں جن کی رو سے یہ اس نظام کو خلاف اسلام قرار دے سکیں۔ لہٰذا یہ کرتے یہ ہیں کہ

(۳) جوں ہی کسی نے قرآن کے معاشی نظام کا ذکر کیا انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ یہ کمیونسٹ ہے اور چونکہ (جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے) قرآنی نظام اور اشتراکی نظام کی بعض جزئیات میں مماثلت ہے اس لئے عوام اور سطح بین پڑھے لکھے لوگ، فوراً ان کے فریب میں آجاتے ہیں، اور ایسا کہنے والے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے اس پراپیگنڈے کا اثر یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ سینے میں درد مند دل رکھنے والے لوگ یہ کہتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں کہ ملک میں بھوک اور افلاس کا علاج ہونا چاہیئے کہ مبادا وہ کمیونسٹ نہ ٹھہرا دیئے جائیں۔ قرآنی نظام کی مخالفت کے لئے، مذہبی پیشوائیت کا یہ حربہ بڑا کارگر ثابت ہو رہا ہے۔ عوام کی نگاہیں ظاہر بیں ہوتی ہیں۔ انہیں یہ سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام اور اشتراکیت کے معاشی نظام کی بعض جزئیات میں مماثلت ہے۔ ان جزئیات کو پیش کرنے والا ضرور نہیں کہ اشتراکی ہو۔ وہ سچا مسلمان بھی ہو سکتا ہے۔ بنیادی فرق، اسلام کے فلسفۂ زندگی اور اشتراکی فلسفۂ حیات میں ہے۔ اشتراکی فلسفۂ حیات کا ماننے والا بلاشبہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اگر اسلام کے معاشی نظام اور اشتراکیت کے معاشی نظام کے کسی جزو کا باہمدگر مماثل ہونا، اسلامی نظام کے پیش کرنے والے کو کمیونسٹ بنا دیتا ہے تو اس اعتبار سے ہمارے تمام علمائے کرام کمیونسٹ ہیں۔ اس لئے کہ کمیونزم میں بھی سود ناجائز ہے اور یہ حضرات بھی سود کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ اس سے یہ حضرات تو کمیونسٹ قرار نہیں پاتے لیکن اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی تو وہ ان حضرات کے نزدیک فوراً کمیونسٹ قرار پا جائے گا۔ اس لئے نہیں کہ زمین پر ذاتی ملکیت کی نفی اسلام کے خلاف ہے۔ بلکہ اس لئے کہ یہ حضرات اس پر ذاتی ملکیت کو جائز سمجھتے ہیں۔

یہ ہے وہ سب سے بڑی دشواری جو اس وقت ان مسائل کے صحیح حل کے راستے میں حائل ہو رہی ہے۔

اسلام اور اشتراکیت اگر اسلام اور اشتراکیت کے نظریہ ہائے حیات کے فرق کو پیش نظر رکھ کر ان کے معاشی نظاموں کا مطالعہ کیا جائے تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے علامہ اقبال نے جب سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کو لکھا تھا کہ

اشتراکیت کا معاشی نظام + خدا = اسلام

تو اس سے ان کی یہی مراد تھی اور جب انہوں نے قائد اعظم سے کہا تھا کہ اگر ہندو اشتراکی نظام معیشت کو اپنانا ہے تو اسے ہندو مت سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ لیکن اگر مسلمان اسے اپناتا ہے تو اس کا یہ اقدام اس خالص اسلام کی طرف جانے کے مرادف ہوگا جو چودہ سو سال پہلے ظہور میں آیا تھا' تو اس سے بھی ان کا یہی مطلب تھا۔

معاشی نظام اور فلسفۂ زندگی کے فرق کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے کہ آج یہ بھی کہا جاتا ہے کہ

اگر ہم نے اشتراکی نظام معیشت اختیار کیا تو اس کی پابندیاں اور اس کا جبر بھی قبول کرنا ہوگا۔ جس کے لئے شاید ہم میں سے اکثر تیار نہ ہوں۔

یہ "جبر" اشتراکی فلسفۂ زندگی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر اس نظام کو اسلامی فلسفۂ زندگی کے تابع اختیار کیا جائے تو اس میں جبر و استبداد کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔ اس کی عمارت انسانی ذات، اسے نشو و نما دینے والی مستقل اقدار، قانونِ مکافاتِ عمل اور اخروی حیات پر ایمان کی بنیادوں پر اٹھتی ہے اور ایمان میں جبر و اکراہ کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ وہ دل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے۔ اسی ایمان کے تصور کا فقدان

اسلام میں جبر نہیں ہے جس سے اشتراکیت اور جبر و تشدد لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔ اشتراکیت + خدا کے معنی یہ ہیں کہ اس معاشی نظام کو وحیٔ خداوندی کی بنیادوں پر استوار اور ایمان کے ذریعہ قبول اور اختیار کیا جائے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کی روشنی میں ہمارے نزدیک "ہمارے معاشی مسائل کے حل کا طریق یہ نہیں

کرنے کا کام کہ کبھی ملکیت زمین کے سوال کو زیر بحث لے آئے اور کبھی بینک کاری پر گفتگو کرنے لگ گئے۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ متعین کیا جائے کہ اسلام کا معاشی نظام ہے کیا۔

یہ کام ہمارے قدامت پرست طبقہ کے بس کا نہیں۔ اس لئے کہ

(۱) ان کے نزدیک وہ معاشی نظام جو عباسی ملوکیت کے زمانے میں مرتب ہوا تھا عین اسلامی نظام ہے۔

(۲) ان کی ذہنیت یہ قرار پا چکی ہے کہ جو بات اسلام کے نام سے متعارف ہو کر چلی آرہی ہے اس پر نظرِ ثانی نہیں کی جاسکتی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ

(۳) ان کے نزدیک قرآنِ کریم، دین میں واحد اور آخری سند نہیں۔

یہ کام ان لوگوں کے کرنے کا ہے جو قرآن کریم کو آخری سند اور حجت تسلیم کریں اور عصر حاضر کے اقتصادی تقاضوں پر ان کی نگاہ ہو۔

جب اس طرح، پہلے یہ متعین ہو جائے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے تو اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ ہم اپنے موجودہ نظام سے، اسلامی نظام تک کس طرح تدریجاً پہنچ سکتے ہیں۔ یعنی پہلے منزل کا تعین کر لیا جائے اور اس کے بعد اس تک بتدریج پہنچنے کے طرق و وسائل پر غور کر کے، چلنا شروع کر دیا جائے۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ اسلامی نظام۔ اس کی حکمت بالغہ۔ اس کی انفرادیت اور اس کے بے مثل و بے نظیر ہونے کے دعوے کی صداقت کو تعلیم کے ذریعہ آنے والی نسلوں کے دل و دماغ میں اس طرح جاگزیں کیا جائے کہ اس کا مطالبہ ان کے دل کی گہرائیوں سے اُبھرے اور وہ اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے اس طرح مضطرب و بیتاب ہوں جس طرح مچھلی پانی میں جانے کے لئے بے قرار ہوتی ہے۔

اگر ایسا نہ کیا گیا اور ہم ان مسائل کو فرداً فرداً لے کر انہیں اسی طرح بحث و نظر کا موضوع بناتے رہے جس طرح اب تک بناتے چلے آرہے ہیں۔ تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ ہم اپنے وقت اور توانائی کو ضائع کرتے رہیں، ان لوگوں کی طرح جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ..... وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (۱۸/۱۰۵ — ۱۰۴) در اصل مسئلہ جوں کا توں رہے۔ بینک کے سود کے مسئلہ ہی کو لیجئے۔ اگر آپ اس سود کو جائز قرار دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ "بے محنت کی کمائی" کی اس فہرست میں ایک اور شق کا اضافہ کر دیتے ہیں جو قرآنی اصولِ معیشت کے علی الرغم ہمارے ہاں پہلے سے رائج چلی آرہی ہے۔ مثلاً زمین کی پیداوار کی بٹائی۔ مضاربت وغیرہ۔ اور اگر آپ بٹائی۔ مضاربت وغیرہ کو جائز رکھ کر بینک کے سود کو ناجائز قرار دیتے ہیں تو آپ کا بینکنگ سسٹم

ختم ہوجاتا ہے۔ کیونکہ سرمایہ دار طبقہ اپنا روپیہ بینک کے کاروبار میں لگائے گا ہی نہیں۔ لیکن اگر آپ قرآن کا معاشی نظام اختیار کر لیتے ہیں تو اس میں اس قسم کی کوئی مشکل پیش ہی نہیں آئے گی۔ اس وقت افراد کے پاس فالتو دولت (SURPLUS MONEY) رہے گی ہی نہیں جو اس پر نفع کمانے کا سوال پیدا ہو۔ دولت ملت کی تحویل میں رہے گی اور وہیں سے تمام ضرورتمندوں کی ضروریات پوری ہوتی رہیں گی۔ ان ضرورتمندوں کی احتیاج سے فائدہ اٹھا کر نفع کمانے کا تصور تک بھی باقی نہیں رہے گا۔

یہ ہے اس مسئلہ کا اصلی حل۔

(فروری ۱۹۶۴ء)

خدا اور سرمایہ دار

شائع شدہ اکتوبر ۱۹۶۶ء

پرویز

"اشیاء اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں" ـــــ یہ ایک قدیم مسلمہ ہے اور حقائق فہمی کے لئے عمدہ اور موثر طریق ـــــ قرآن کریم نے بھی بسیط حقائق کو سمجھانے کے لئے اسی طریق سے کام لیا ہے۔ یعنی وہ دو متضاد اشیاء کو آمنے سامنے رکھ کر حقیقت کی وضاحت کرتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۝ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ ۝ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ ۚ یاد رکھو! اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہو سکتے، تاریکی اور روشنی ایک جیسے نہیں ہو سکتے، سایہ اور دھوپ یکساں نہیں ہو سکتے۔ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ۚ (۳۵/۱۹—۲۱) - اور مردہ اور زندہ بھی کبھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ یعنی اگر آپ نے یہ سمجھنا ہو کہ زندہ کسے کہتے ہیں تو ایک مردہ پر غور کرو۔ جو جو بات مردہ میں نہیں ہوگی، جس میں وہ باتیں ہوں گی وہ زندہ ہوگا۔ یہی طریق اس نے دین کی حقیقت و ماہیت سمجھانے کے لئے اختیار کیا ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ اگر تم یہ دیکھنا چاہو کہ دین کا پیغام اور اس کا نظام زندگی کیا ہے، تو اس پر غور کرو کہ دین کی مخالفت کس کس طبقہ کی طرف سے ہوتی رہی ہے۔ جس طبقہ کی طرف سے دین کی مخالفت کی گئی تھی، دین اُس نظام کی ضد تھا جس کا علمبردار وہ طبقہ تھا۔ اس اہم مطالعہ کے لئے اُس نے ہمیں انسانوں کی مرتب کردہ تاریخ کا محتاج نہیں رہنے دیا۔ قرآن کریم نے دین کی تاریخ

خود ہی محفوظ کر کے ہم تک پہنچا دی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ خدا کے رسول انسانوں تک دین پہنچاتے رہے۔ اس سلسلہ کا آغاز اس نے حضرت نوحؑ سے کیا ہے اور خاتمہ حضور خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر۔ وہ بتاتا ہے کہ دین اپنی اصل و بنیاد کے اعتبار سے شروع سے آخر تک ایک ہی رہا ہے ____ دین کے معنی ہیں انسانوں کے لئے نظامِ زندگی ___ اور اس کی مخالفت بھی شروع سے اخیر تک ایک ہی قسم کے طبقات کی طرف سے ہوتی رہی ہے۔ یعنی اربابِ حکومت، جو اپنی مرضی دوسروں پر چلانا چاہتے تھے۔ سرمایہ دار، جو دوسروں کی کمائی پر تن آسانی اور تعیش کی زندگی بسر کرتے تھے اور مذہبی پیشوائیت، جو خدا کے نمایندے بن کر اوّل الذکر دونوں گروہوں کے مفاد کی حفاظت کرتے تھے۔ جب بھی خدا کا کوئی رسول آیا، تو ان تینوں گروہوں نے اس کے پیش کردہ دین کی مخالفت کی۔ لہٰذا اگر آج بھی یہ دیکھنا ہو کہ خدا کا تجویز کردہ نظامِ حیات (دین) کیا ہے تو "تعارف بالضد" کے اصول کے مطابق، اس کا معیار یہ ہے کہ جس نظریہ کی مخالفت ان گروہوں کی طرف سے ہو، سمجھ لیجئے کہ وہ دین کے مطابق ہے۔ اور جس کی تائید ان کی طرف سے ہو وہ دین کے خلاف ____

یہ نہایت واضح روشن اور بیّن اصول ہے۔ اور نہایت آسان اور سادہ طریق کار جس کی تائید خود قرآن کریم کرتا ہے۔ آئندہ اوراق میں یہ بتایا جائے گا کہ سرمایہ داروں کے گروہ نے کس طرح ہر رسول کی مخالفت کی، اور ہر ممکن کوشش کی کہ وہ نظام متشکل نہ ہونے پائے، جس کے داعی انبیائے کرامؑ تھے۔

"سرمایہ داروں کے لئے قرآنِ کریم میں دو اصطلاحات عام طور پر آئی ہیں۔

(۱) اَلْمَلَاُ ـ مَلَاَ ، یَمْلَاُ ، مَلْاً کے بنیادی معنی ہیں، کسی چیز کو بھر دینا ـ اس اعتبار سے (اَلْمَلَاُ) ان لوگوں کو کہتے ہیں جن کے گھر ضروریات زندگی کی اشیاء سے بھرے ہوئے ہوں۔ جنہیں سامانِ زیست بڑی فراوانی سے حاصل ہو۔ چونکہ غیر خداوندی نظام میں عزت اور ریاست کا معیار دولت ہوتی ہے اس لئے یہی لوگ قبیلہ یا قوم کے سردار بھی ہوتے تھے۔ اس لئے تبعاً یہ لفظ (اَلْمَلَاُ) سرداران قوم کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا۔ لیکن اس سے بنیادی طور پر مراد سرمایہ دار طبقہ ہی تھا۔

(۲) مُتْرَفِیْنَ ____ وہ لوگ جو عیش و آرام کی زندگی گذار رہے ہوں۔ ایسے خوشحال لوگ جن کے پاس کثرت سے دولت ہو، اور اس بنا پر وہ بڑے خود سر ہو جائیں۔ قرآن کریم نے مُتْرَفِیْنَ کی وضاحت خود ہی کر دی ہے جہاں کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں قَالُوْا نَحْنُ اَکْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا

وَّ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ۔ (۳۴/۳۵) جو کہتے ہیں کہ ہمارے پاس بڑی کثرت سے دولت ہے اور ہمارا قبیلہ اور جتھا بھی بہت بڑا ہے۔ ہم جو جی میں آئے کریں ہمیں کون ہاتھ لگا سکتا ہے۔؟

حضرت نوحؑ

قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ دینِ خداوندی کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ آسمانی دعوتِ انقلاب کے داعیٔ اوّل حضرت نوحؑ کے تذکرہ جلیلہ کے ضمن میں کہتا ہے۔

ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف پیغامبر بنا کر بھیجا۔ اس نے ان سے کہا کہ تم قوانین خداوندی کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے علاوہ کوئی ایسی قوت نہیں جس کی محکومی اختیار کی جائے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا (اور اپنی موجودہ روش پر اڑے رہے تو) مجھے نظر آتا ہے کہ تم پر سخت تباہی آجائے گی۔

(۷/۵۹)۔

آپ نے پیغام دیکھ لیا۔ یہ پیغام ساری قوم کے لئے تھا۔ لیکن قوم میں سے بھڑک کر کون سا طبقہ اٹھا؟ —سنیئے:

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔ (۷/۶۰)

اس قوم کے دولتمند سرمایہ دار طبقہ نے کہا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ تم عجیب اُلٹے راستے پر چل رہے ہو۔ (ہمیں اس روش پر چلنے سے اس قدر مال و دولت حاصل ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ اسی سے ہم پر تباہی آجائے گی۔)

سورۂ ھُود میں اس اجمال کی تفصیل دی گئی ہے جہاں کہا ہے کہ

اس پر قوم کے سرمایہ دار طبقہ نے کہا کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ تم ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو۔ (اس لئے ہم کیسے مان لیں کہ تم خدا کے رسول ہو) باقی رہے یہ لوگ جو تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں تو ان کی حیثیت ہی کیا ہے؟ یہ ہم میں سے نچلے درجے کے لوگ ہیں اور یہ صاف دکھائی دے رہا ہے کہ انہوں نے تمہارا مسلک عقل و فکر کی رو سے اختیار نہیں کیا۔ یونہی بلا سوچے سمجھے تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں۔ ہمیں تو کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس میں تمہیں، ہمارے مقابلہ میں کوئی برتری حاصل ہو— لہذا، ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ تم اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہو۔ (۱۱/۲۷)

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ قوم کے غریب اور کمزور طبقہ نے اس دعوت پر لبیک کہا اور دولتمند اور طاقتور طبقہ نے اس کی مخالفت کی۔ اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ اس دولتمند طبقہ کی طرف سے یہ مطالبہ پیش کیا گیا کہ تم ان غریب اور نادار لوگوں کو دھتکار کر نکال دو تو پھر ہم تمہاری بات سننے کے لئے آمادہ ہوسکیں گے۔

اس پر حضرت نوحؑ نے کہا کہ

> تم اس پر غور کرو کہ میں جو کچھ تمہاری بھلائی کے لئے کرنا چاہتا ہوں، اس کے معاوضہ میں تم سے کوئی مال و دولت نہیں مانگتا۔ لیکن میں یہ نہیں کرسکتا کہ جو لوگ اس نظام کی صداقت پر ایمان لائے ہیں، انہیں اس لئے نکال باہر کروں کہ وہ غریب و نادار ہیں اور اس لئے تم انہیں ذلیل سمجھتے ہو۔ میں اگر تمہاری خاطر ان لوگوں کو دھتکار دوں، تو اس سے تم تو بے شک خوش ہوجاؤ گے، لیکن ذرا سوچو کہ قانون خداوندی کی رو سے اس جرم کی جو سزا مجھ پر وارد ہوجائے گی اس سے مجھے کون بچا سکے گا؟ .... تم جو یہ سمجھتے ہو کہ یہ لوگ جنہیں تم اپنے معیار کے مطابق ذلیل اور حقیر خیال کرتے ہو، خدا کی نظروں میں بھی ذلیل اور حقیر ہیں، اور انہیں اس کے ہاں سے کوئی خوشگواری کا سامان نہیں مل سکتا، یہ غلط ہے قانون خداوندی کی رو سے معیار عزت و تکریم اور استحقاق خیر و برکت انسان کے جوہر ذاتی ہیں۔ اس کی نگاہ کسی کے مال و دولت پر نہیں، بلکہ انسان کے دل پر ہوتی ہے۔ اگر میں تمہاری بات مان لوں، تو میں بھی تمہارے ہی جیسا ظالم ہوجاؤں۔ (۱۱/۳۱-۲۹)۔

آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے اس کا جواب کیا دیا؟ وہی، جو ہر ایسا شخص جو دولت و قوت کے نشہ میں بدمست ہو، دیا کرتا ہے۔ انہوں نے کہا

> اے نوحؑ ہم نے تم سے یونہی ذرا سی بات کی تھی اور تم ہو کہ آگے ہی آگے بڑھتے چلے جارہے ہو۔ ہم تمہاری کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں۔ تم جس تباہی کی دھمکی دے رہے ہو، اسے لے آؤ۔ ہم دیکھیں کہ وہ ہمارا کیا بگاڑ لیتی ہے۔ (۱۱/۳۲)۔

سورۃ الشعراء میں ہے کہ ان امرائے قوم نے کہا کہ

> اے نوح! تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا ہم تمہیں اپنا لیڈر تسلیم کرلیں اور اس طرح تمہاری اس جماعت میں شامل ہوجائیں جس میں سوسائٹی کے وہ لوگ شامل ہیں جو نہایت پست اور ذلیل ہیں اور ادنیٰ درجے کے کام کاج کرتے ہیں۔ (وہ مزدور اور محنت کش ہیں۔ کیا ہم اس جماعت میں شامل

ہو کر ان لوگوں کو اپنا ہمسر بنالیں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟) (۲۶/۱۱۱)۔

اس پر حضرت نوحؑ نے کہا کہ مجھے اس سے غرض نہیں کہ میں معلوم کروں کہ یہ لوگ کیا کام کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ لوگ صداقت کو کس قدر تسلیم کرتے ہیں اور اس نظام کے قیام کے لئے کیا کرنے میں، جسے میں پیش کرتا ہوں۔ یہی ہمارے ہاں قدر و قیمت کے پیمانے ہیں۔ میرے نزدیک یہ غریب و نادار لوگ جو اس نظام کے قیام کے لئے میرے رفیق کار بنے ہیں، ان سردارانِ قوم سے کہیں زیادہ واجب الاحترام ہیں جو اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ (۲۶/۱۱۴-۱۱۱)۔

سورۃ المؤمنون میں ہے کہ ان رؤسائے قوم نے، اپنے طبقہ کے دیگر افراد سے کہا کہ یاد رکھو! اس شخص سے بڑا محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ تو ہم پر بالادستی (SPERIORITY) حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ تم پر اپنا نظام مسلط کر دے۔ اس کا (معاذ اللہ) دماغ چل گیا ہے۔ یہ پاگل ہو گیا ہے جو کہتا ہے کہ امیر و غریب سب ایک جیسے ہیں۔ تم چند دنوں تک انتظار کرو۔ اس کی یہ تحریک خود بخود ناکام ہو جائے گی۔ (۲۳/۲۴)۔

لیکن آخر الامر ہوا یہ کہ انہی ناداروں اور غریبوں کی جماعت محفوظ رہی اور وہ جو سامانِ زیست کی فراوانیوں سے اس قدر بدمست ہو رہے تھے غرق ہو گئے۔

حق و باطل کی کشمکش کی اس پہلی کڑی کو بیان کرنے کے بعد قرآن کریم کہتا ہے کہ:۔

اس سرگذشت میں تمہارے لئے، ہمارے قانونِ مکافات کی ہمہ گیری کی نشانیاں ہیں۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہم غلط نظام کو کس طرح الٹا کر رکھ دیا کرتے ہیں۔۔۔ (۲۳/۳۰)۔

حضرت ہودؑ

قوم نوحؑ کے بعد ہمارے سامنے قوم عاد کا تذکرہ آتا ہے جس کی طرف حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی قوم کے سامنے اسی انقلاب آفریں نظام زندگی (دین) کو پیش کیا جسے حضرت نوحؑ نے پیش کیا تھا۔ اس کے جواب میں قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ ...... اس قوم کے بڑے بڑے سرغنوں نے جنہیں مال و دولت کی فراوانی حاصل تھی۔ اور جو اس دعوت کی مخالفت کے لئے

اُٹھ کھڑے ہوئے تھے کہا کہ

ہمیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ تم عقل و ہوش کھو بیٹھے ہو۔ تم جو کہتے ہو کہ ہماری روش ہمیں تباہیوں کی طرف لے جارہی ہے' یہ سب جھوٹ ہے۔ (۶۶/۷ نیز ۲۳/۳۳)۔

اس قوم کو رزق کی کس قدر فراوانیاں حاصل تھیں اور اس کے بل بوتے پر انہوں نے خلقِ خدا پر کس طرح گو عافیت تنگ کر رکھا تھا۔ اس کے ضمن میں قرآن کریم میں ہے کہ

حضرت ہودؑ نے ان سے کہا کہ ذرا دیکھو کہ تمہیں اس وقت سامانِ زیست کس قدر فراواں حاصل ہے۔ مال مویشی کی کثرت، افرادِ قبیلہ کی بہتات، لہلہاتے باغ، اُن کی سیرابی کے لئے رواں دواں چشمے۔ (یہ سب خدا کے عطا کردہ ذرائع رزق ہیں جسے اس نے تمام انسانوں کی پرورش کے لئے پیدا کیا تھا' لیکن تم اسے کمزوروں اور ناداروں پر ظلم کرنے کے لئے استعمال کرتے ہو تمہاری حالت یہ ہے کہ تم اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے اونچی اونچی پہاڑیوں پر اس قسم کے میموریل بناتے ہو جن کا کوئی مصرف نہیں۔ ان سے بھلا نوع انسانی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اور تم بڑے بڑے سازوسامان (اور اسلحہ وغیرہ) بناتے ہو۔ اس لئے نہیں کہ اس سے ظلم کی روک تھام کرو۔ بلکہ اس لئے کہ کمزوروں پر تمہارے آہنی پنجے کی گرفت ڈھیلی نہ ہونے پائے اور تمہارا غلبہ و تسلط ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم رہے۔ تم اس روش کو چھوڑ دو اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ (۲۶/۱۲۸-۱۳۵)

اس طبقہ کی طرف سے اس کا ردِ عمل کیا تھا؟ قرآن بتاتا ہے کہ

(انہوں نے یہ سب کچھ سنا اور نہایت طنز اور حقارت سے کہا کہ آپ کے اس وعظ کا شکریہ! ہمیں اس کی ضرورت نہیں) ہمارے لئے تمہارا وعظ و نصیحت کرنا' نہ کرنا' یکساں ہے (خدا اور اس کا قانونِ مکافات' تباہیوں اور بربادیوں کا عذاب' جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ سب) اگلے زمانے کے لوگوں کے من گھڑت افسانے ہیں۔ ہم پر کوئی تباہی نہیں آسکتی۔ (۲۶/۱۳۶-۱۳۹)

وہ کوئی جاہل اور گنوار قوم نہیں تھی۔ ان کے پاس

سننے کے لئے کان' دیکھنے کے لئے آنکھیں' اور سمجھنے سوچنے کے لئے دل و دماغ تھے۔ لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی کی اس طرح مخالفت کی تو ان کی سماعت و

بصارت و قلب ان کے کسی کام نہ آیا۔ ان کا علم و عقل انہیں اس تباہی سے نہ بچا سکے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ (۴۶/۲۶)۔

حضرت ھودؑ نے ان سے کہا تھا کہ "اگر تم نے اس غلط روش کو نہ چھوڑا۔ تو تمہاری جگہ ایک اور قوم آجائے گی جن کا نظام، تمہارے نظام کی ضد ہوگا" (۱۱/۵۷)۔ یہ ہے خدا کے قانون مکافات کی رو سے قوموں کے استبدال و استخلاف (SUCCESSION AND SUBSTITUTION) کا اصول جس کی رو سے وہ قوم جو غلط نظام حیات کی حامل ہو، تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ وہ قوم لے لیتی ہے جو صحیح نظام کی حامل ہو۔

حضرت صالحؑ

قوم عادؔ کے بعد ہمارے سامنے قوم ثمود آتی ہے جس کی طرف حضرت صالحؑ، دعوت انقلاب لے کر آئے تھے۔ وہ زمانہ گلہ بانی کا تھا۔ معیشت کا مدار مویشی تھے۔ اور ان مویشیوں کی زندگی کا مدار چراگاہوں اور پانی کے چشموں پر تھا۔ اس قوم کے بالادست طبقہ نے ان ذرائع پرورش کو اپنی ملکیت میں لے رکھا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کمزوروں کے جانوروں کو ان میں گھسنے نہیں دیا جاتا تھا۔ ان کی پانی کی باری ہی نہیں آتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ خاندانی اعتبار سے حضرت صالحؑ کا تعلق بھی اسی طبقہ سے تھا۔ لیکن انہوں نے ان کی اس باطل روش کے خلاف اعلان انقلاب کیا تو انہوں نے کہا کہ:۔

يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ (۱۱/۶۲)

اے صالح: ہماری تو تمہارے ساتھ بڑی بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ تم تو ہماری امیدوں کے مرکز تھے۔ تم یہ کیا کرنے لگ گئے؟

یہ کہنے والے کون تھے؟ وہی اَلْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ (۷/۷۵) اس کی قوم کا وہ دولتمند طبقہ جس نے دھاندلی مچا رکھی تھی۔

اور حضرت ھودؑ نے ان سے کیا کہا تھا جس پر یہ ان کی طرف سے اس قدر مایوس ہو کر بگڑ بیٹھے تھے؟ — انہوں نے کہا تھا کہ

دیکھو! خدا نے تمہیں اس ملک میں کس قدر تمکن عطا کیا ہے۔ تم میدانوں میں محلات تعمیر کرتے ہو۔ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں مکانات بناتے ہو۔ تم خدا کی ان نعمتوں کو اپنے پیش نظر رکھو اور ملک میں فساد مت برپا کرو۔ (۷/۷۴)۔

پھر انہوں نے کہا کہ

ذرا سوچو کہ اگر تم نے اپنا معاشی نظام اسی قسم کا رکھا جس سے معاشرہ میں اس قدر ناہمواریاں پیدا ہو جائیں، تو کیا یہ آسائشیں اور فارغ البالیاں اسی طرح رہنے دی جائیں گی۔ کیا تم ان لہلہاتے باغات اور چشموں میں، ان زرخیز زمینوں میں۔ ان نخلستانوں میں جہاں درختوں پر پھلوں کے نرم اور خوشگوار خوشے نیچے لٹک رہے ہیں۔ اور ان قلعہ نما محلوں میں جنہیں تم پہاڑوں کو تراش کر بڑی صنعت کاری سے بناتے ہو اور پھر اتراتے ہو کہ یہاں تمہارا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح رہو گے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس غلط معاشی نظام کے باوجود یہ تمام خوشحالیاں علیٰ حالہٖ قائم رہیں گی؟ (۲۶/۱۴۶—۱۴۹)

اس پر انہوں نے وہی حربہ اختیار کیا جو ابلیسی سیاست کے علمبردار اختیار کیا کرتے ہیں۔ یعنی انہوں نے حضرت ہودؑ سے تو کچھ نہ کہا۔ کیونکہ ان کا خاندان بڑا تھا۔ لیکن ان کے متبعین کو جو غریبوں، اور کمزوروں پر مشتمل تھے، دھمکانا شروع کر دیا۔

اس پر اس قوم کے سرکش اکابرین نے، جنہیں مال و دولت کی فراوانی نے بدمست کر رکھا تھا، جماعت مومنین سے کہا۔۔۔ اور یہ وہ لوگ تھے جنہیں وہ اکابرین، ان کے افلاس کی وجہ سے بہت کمزور اور حقیر سمجھتے تھے۔۔۔ کہ کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ صالحؑ خدا کا رسول ہے؟ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم اسے اب تسلیم نہیں کرتے۔ (اس لئے تم خود سمجھ لو کہ جس روش کو ہم صحیح نہیں سمجھتے اس پر چلنے سے تمہارا کیا حشر ہوگا) (۷/۷۵—۷۶)

جب یہ حربہ بھی کارگر نہ ہوا تو انہوں نے حضرت صالحؑ سے مصالحت کی کوشش کی۔ اور ان سے پوچھا کہ آپ چاہتے کیا ہیں؟ انہوں نے کہا کہ میں اس کے سوا اور کیا چاہتا ہوں کہ خدا نے جو رزق تمام انسانوں کی پرورش کے لئے پیدا کیا ہے، اسے تمام انسانوں کے لئے کھلا رکھا جائے۔ ہر ایک کے مویشی چراگاہوں میں چریں اور اپنی اپنی باری چشموں سے پانی پئیں۔ اس پر وہ راضی ہو گئے تو حضرت صالحؑ نے کہا۔ کہ مجھے اس کا

عملی ثبوت ملنا چاہیئے کہ تم اس معاہدہ پر کاربند رہتے ہو۔ اس وقت تمہاری حالت یہ ہے کہ تم نے خدا کی زمین پر لکیریں کھینچ کر ـــــ یہ میری اور یہ تیری ـــــ کی تفریق پیدا کر رکھی ہے۔ اور پھر "میری زمین میں میرے مویشی چر سکتے ہیں اور تیری زمین میں تیرے"۔ حالانکہ نہ زمین میری اور تیری ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس مقصد کے لئے میرے اور تیرے مویشیوں کی تفریق ـــــ یہ ایک اونٹنی ہے جسے یوں سمجھو کہ یہ نہ میری ہے، نہ تیری

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ ـــــ تَأْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ (11/64)

یہ خدا کی اونٹنی ہے ـــــ جو خدا کی زمین میں چرے گی۔

اگر تم نے اسے اس طرح چرنے دیا، تو سمجھ لیا جائے گا کہ تم میرے تجویز کردہ معاشی نظام پر کاربند رہو گے۔ لیکن اگر تم نے اسے اس سے روکا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تم اس تبدیلی کو گوارا نہیں کر سکتے اور اپنی روش پر قائم رہنا چاہتے ہو۔

قرآنی نظام کی اساس

آگے بڑھنے سے پہلے یہ دیکھئے کہ قرآن کریم نے اپنے معاشی نظام کو کس طرح چار لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا ہے ـــــ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ ـــــ تَأْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ ـــــ خدا کی زمین مخلوقِ خدا کی پرورش کے لئے ـــــ قرآن کریم میں جس چیز کی نسبت خدا کی طرف کی گئی ہے (یعنی یہ کہا گیا ہے کہ وہ خدا کی ہے)، اس سے مراد یہی ہے کہ وہ عام انسانیت کے لئے کھلی ہے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ مثلاً اس نے کعبہ کو بَيْتُ اللّٰهِ (یا بَيْتِيَ ـــ میرا گھر) کہہ کر پکارا ہے تو اس کی تشریح خود ہی یہ کہہ کر کر دی ہے کہ ـــ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ ـ (3/95) وہ گھر جسے تمام نوعِ انسان کے لئے بنایا گیا ہے ـــــ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ ـــ (2/125) عالمگیر انسانیت کا اجتماعی مرکز ـــ قِيَامًا لِّلنَّاسِ ـــ (5/97) تمام نوعِ انسان کے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا ذریعہ ـــــ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ (22/25) جس کے دروازے تمام انسانوں کے لئے ـــ خواہ وہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے ہوں ـــ یکساں طور پر کھلے رہیں گے۔ اسی طرح جب اس نے ارض اللہ کہا ہے تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ وہ تمام نوعِ انسان (بلکہ ساری مخلوق کے لئے) ذریعہ پرورش ہے۔ معاشرہ کو

ایسا انتظام کرنا چاہیئے کہ خدا کے رزق سے تمام افراد کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ "خدا کی مخلوق اور خدا کی زمین"۔ یہ ہے دین کے معاشی نظام کی اصل و بنیاد جس کا اعلان حضرت صالحؑ نے کیا۔

قوم کے سرمایہ داروں نے ملنے کو تو اسے مان لیا لیکن جب دیکھا کہ غریبوں کے مویشی اور ان کے جانور سب ایک جیسے بنا دیئے گئے تو ان کے سینوں میں حسد و رقابت کی آگ بھڑک اٹھی ——— فَعَقَرُوْهَا (۲۶/۱۵۷) انہوں نے غم و غصہ سے پاگل ہو کر اس اونٹنی کو مار ڈالا۔ (۹۱/۱۴) - اور اپنے اسی سابقہ معاشی نظام کی طرف لوٹ گئے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ——— (۹۱/۱۴) خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ان پر روڈ رولر (ROAD ROLLER) کی طرح پھر گیا۔ اور انہیں زمین کی سطح کے ساتھ ہموار کر کے رکھ دیا۔

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

قومِ مدین

اسی طرح قومِ مدین کی طرف حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے۔ اس قوم کی معیشت گلہ بانی بھی تھی اور کاروباری بھی۔ ان کے زرعی نظام کی کیفیت کیا تھی؟ اس کا اندازہ حضرت موسیٰؑ کے اس واقعہ سے لگایئے جو اس بستی سے باہر پیش آیا تھا۔

حضرت موسیٰؑ جب مصر سے بھاگ کر مدین کے قریب آئے تو وہ سستانے کے لئے ایک چشمے کے قریب، درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ چشمے پر مویشی غٹا غٹ پانی پی رہے ہیں لیکن دو لڑکیاں ہیں جو بیاذ سے دور کھڑی ہیں۔ ان کے مویشی پیاس کے مارے قابو سے باہر ہوئے جا رہے ہیں لیکن وہ انہیں چشمے کی طرف جانے سے روکتی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کو اس پر تعجب ہوا کہ وہ انہیں پانی کی طرف جانے سے روکتی کیوں ہیں؟ چنانچہ ان کے دریافت کرنے پر لڑکیوں نے جواب دیا کہ

جب تک یہ چرواہے اپنی بکریوں کو پانی پلا کر نہ لے جائیں، ہم اپنی بکریوں کو پانی نہیں پلا سکتیں اس لئے کہ یہ لوگ بڑے بڑے جتھوں کے مالک اور صاحبِ قوت ہیں۔ اور ہمارے ہاں کوئی مرد نہیں۔ صرف ایک باپ ہے جو بہت بوڑھا ہے۔ (۲۸/۲۳)۔

حضرت موسیٰ نے دل میں کہا کہ ——— بہر زمینے کہ رفتیم آسماں پیداست ——— مصر سے بھاگا تھا کہ وہاں فرعونیوں کی بالادست قوم نے بنی اسرائیل پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ یہاں پہنچا تو معاملہ وہاں سے بھی زیادہ الم انگیز نظر آیا۔ وہاں ایک قوم دوسری قوم کو تنگ کرتی تھی۔ یہاں ایک ہی قوم کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو پانی کے چشمہ کے قریب نہیں آنے دیتا۔ یہ جی میں کہا اور اٹھ کر ان غریب لڑکیوں کی بکریوں کو خود پانی پلا دیا۔ اور پھر درخت کے نیچے آکر بیٹھ گئے۔ اور گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ (۲۸/۲۴)۔ کہ

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟

یہ تھی قوم مدین کی زرعی معیشت کی حالت۔ جہاں تک ان کی کاروباری زندگی کا تعلق ہے، ان کی کیفیت وہی تھی جو ہر سرمایہ دار قوم کی ہوتی ہے۔ حضرت شعیبؑ نے ان کی یہ حالت دیکھی تو ان سے کہا کہ

> تمہیں چاہیئے کہ اپنے معاشی نظام میں عدل برتو ——— ناپ تول کو پورا رکھو۔ لوگوں کے حقوق و واجبات میں کمی نہ کرو۔ اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہو جانے کے بعد ناہمواریاں مت پیدا کرو۔ یہ سب کچھ تمہارے ہی بھلے کے لئے ہے، اگر تم یقین کرو تو۔
>
> دیکھو! ایسا نہ کرو کہ زندگی کے ہر راستے پر راہزن بن کر بیٹھ جاؤ۔ جو لوگ صحیح نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے اٹھیں، انہیں دھمکیاں دے دیکر اس راستے سے روکو اور انسانیت کی راہ میں پیچ و خم پیدا کرنے کے درپئے رہو۔ (۷/۸۵-۸۶ ؛ ۲۶/۱۸۱-۱۸۴)

شروع شروع میں انہوں نے، حضرت شعیبؑ کی اس دعوت کو (SERIOUSLY) نہ لیا۔ اور ان سے صرف اتنا کہا کہ ——— اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ (۲۶/۱۸۵) "ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ تو بھی انہی میں سے ہے، جو اس فریب میں مبتلا ہو کر، کہ خدا ان سے باتیں کرتا ہے، قوم کے مصلح بننے کی کوشش کیا کرتے ہیں"؛ انہوں نے زیادہ سے زیادہ یہ سمجھا تھا کہ یہ ایک "مذہبی ریفارمر" ہے اس لئے اسے جس طرح یہ چاہتا ہے، اسی طریق پر صلوٰۃ (پوجا پاٹ) ادا کرنے دو۔ اس سے ہمارا کیا بگڑتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کہدیا کہ ہم تمہاری صلوٰۃ میں مزاحمت نہیں کریں گے۔ لیکن انہوں نے دیکھا کہ شعیبؑ کے نزدیک "صلوٰۃ" سے مفہوم پرستش نہیں، کچھ اور ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس سے کہا کہ

يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (۱۱/۸۷)۔

تم جو کچھ کہتے تھے، اس سے ہم نے یہ سمجھا تھا کہ تم صرف پوجا پاٹ کا کوئی اپنا طریقہ لے کر آئے ہو
اس لئے ہم نے تجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ ہمارے ذہن میں تھا کہ ہم اپنے طریق پر پوجا پاٹ
کرتے رہیں گے تم اپنے طریق پر کرتے رہو۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ معاملہ صرف پوجا پاٹ کا
نہیں تیری صلوٰۃ صرف پرستش نہیں۔ یہ تو ہماری روزمرہ کی عملی زندگی کے ان شعبوں میں دخل
ہو رہی ہے جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ کیا تیری صلوٰۃ تجھ سے یہ کہتی ہے کہ ہم ان معبودوں
کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے اسلاف کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اور نہ ہی ہم جس طرح
ہمارا جی چاہے دولت حاصل کریں اور جس طرح ہمارا جی چاہے اسے خرچ کریں۔ ہماری
معاشی زندگی تمہاری مرضی کے تابع چلے ۔۔۔ یہ انوکھی "صلوٰۃ" ہے!

ضمناً آپ نے غور فرمایا کہ "مذہب" میں صلوٰۃ (نماز) کا کیا مفہوم ہوتا ہے اور "دین" میں صلوٰۃ کا مقصود کیا؟
دین کی رو سے صلوٰۃ کا نظام، قوم کے معاشی نظام کو بھی اپنے دائرے کے اندر لئے ہوتا ہے۔ اسی نظام کے قائم
کرنے کا حکم قرآن نے دیا تھا۔

بہرحال، جب قوم نے دیکھا کہ معاملہ آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے اور یہ تحریک ہی کچھ اور ہے تو انہوں نے
دھمکیاں دینی شروع کیں ۔۔۔ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ

اس قوم کے سرمایہ دار طبقہ نے، جو قوت کے نشہ میں بدمست ہو رہے تھے، کہا کہ اے شعیبؑ!
دونوں باتوں میں سے ایک ضرور ہوگی ۔۔۔ یا تو تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو پھر سے وہی قدیم
مسلک اختیار کرنا ہوگا جسے چھوڑ کر وہ تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں، ورنہ ہم تمہیں اور تمہارے
ساتھیوں کو بستی سے نکال دیں گے۔ اب تم خود سوچ لو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ (۸۸/۷)

قوم نے اپنی روش کو نہ چھوڑا اور اپنے غلط نظام کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئی۔ (۲۹/۳۷)

صاحبِ ضربِ کلیم

اور داستانِ صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰؑ تو ہے ہی ۔۔۔ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، اور
نظامِ سرمایہ داری، تینوں کے خلاف بیک وقت دعوتِ مبارزت۔ فرعون، ملوکیت کے استبداد کا مجسمہ

ہامان، مذہبی پیشوائیت کی روباہ بازیوں کا نمائندہ ــــ اور قارون، نظام سرمایہ داری کی ہوسِ خون آشامی کا پیکر۔ لیکن جہاں تک فرعون کا تعلق ہے، اس نے بھی اپنی مملکت کے استحکام کے لئے قوم کو معیشت کے نام پر ہی اپیل کیا تھا جب کہا تھا کہ

اے میری قوم کے لوگو! سوچو کہ کیا یہ نہریں جو میرے انتظام کے ماتحت جاری ہیں، اور جن پر تمہاری معیشت کا دار و مدار ہے، میری نہیں ؟ (۴۳/۵۱)۔

یہ درحقیقت قوم کو بہت بڑی دھمکی دی گئی تھی کہ اگر تم میں سے کسی نے اس داعیِ انقلاب کا ساتھ دیا تو اس پر نہروں کا پانی بند کر دیا جائے گا۔

فرعون کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کے تصادم کی داستان الگ ہے اس کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں۔ جہاں تک نظام سرمایہ داری کے خلاف کشمکش کا تعلق ہے، قرآن کریم نے اس کے تذکرہ کی ابتدا ہی بڑے رمز آفریں انداز سے کی ہے جب کہا ہے کہ اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ــــ (۲۸/۷۶) فرعون تو ایک دوسری قوم کا آدمی تھا جس نے بنی اسرائیل کو اپنی محکومیت کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا، لیکن قارون خود قوم موسیٰؑ کا فرد تھا۔ یعنی نظام سرمایہ داری کی خون آشامی کی یہ حالت ہے کہ اس میں کوئی باہر سے آکر قوم کا خون نہیں چوستا۔ خود قوم کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو لوٹتا ہے۔ دوسری مصیبت یہ ہوتی ہے کہ غیروں کی غلامی کی لعنت ہر ایک محسوس کرتا ہے اور کسی بدترین غدار کے علاوہ، کوئی ان کا ہمنوا نہیں ہوتا۔ لیکن سرمایہ داروں کی عیش سامانیوں اور تن آسانیوں کو دیکھ کر دوسرے لوگوں کے دل میں بھی ان جیسا بن جانے کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم بتاتا ہے کہ

ایک طرف وہ لوگ تھے جو قارون کو زندگی کی صحیح روش اختیار کرنے کی نصیحت کرتے تھے، اور دوسری طرف وہ تھے جن کے پیش نظر زندگی کی عیش سامانیاں تھیں۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ جب قارون کر و فر اور شان و شوکت سے باہر نکلتا تو وہ بڑی حسرت سے کہتے کہ اے کاش! جو کچھ قارون کو ملا ہے، وہ ہمیں بھی مل جاتا۔ یہ بڑا ہی خوش نصیب ہے (۲۸/۷۹)۔

جب قارون سے کہا جاتا کہ تم جو دوسروں کی محنت کی کمائی کو اس طرح غصب کر کے اتنی دولت اکٹھی کر رہے ہو، تمہیں اس کا کیا حق پہنچتا ہے؟ تو معلوم ہے وہ اس کا کیا جواب دیتا؟ وہی جواب جو ہر دور

اور ہر قوم کے سرمایہ پرست کی طرف سے ملتا ہے۔ وہ کہتا۔ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ۔ (۲۸/۷۸) یہ دولت میں نے اپنی ہنرمندی اور چابک دستی سے حاصل کی ہے۔ اس لئے اس میں کسی دوسرے کا کیا حق ہے اور اس کی بابت مجھ سے کون باز پرس کر سکتا ہے؟

یہ کشمکش جاری رہی۔ اس کے بعد۔

جب قارون کی بدکرداریوں کے نتائج کے ظہور کا وقت آ گیا۔ تو ہم نے اسے، اور اس کے مال و متاع سے بھرے ہوئے گھر کو تباہ کر دیا۔ اور اس وقت کوئی گروہ ایسا نہ نکلا جو قانونِ خداوندی کے مقابلہ میں اس کی مدد کر سکتا، نہ ہی اس سے خود ایسا ہو سکا کہ وہ اس تباہی سے بچ نکلتا (سرمایہ دار کی اقبال مندی کے زمانے میں ایسا نظر آتا ہے کہ ایک لشکر ہے جو اس کی خاطر اپنی جان تک قربان کر دے گا لیکن جب اس پر ادبار آتا ہے تو ایک شخص بھی اس کا ساتھ دینے والا نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس کی اپنی ہنرمندی اسے اس تباہی سے بچا سکتی ہے۔ (۲۸/۸۱)

عدلِ داؤدی

حضرت داؤدؑ کے زمانے میں عام معاشی نظام کس قسم کا تھا، اسے قرآن کریم نے ایک قصہ کی شکل میں بیان کیا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اس پر ہے کہ بڑا سرمایہ، چھوٹی پونجی کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور اس طرح امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت داؤدؑ کے پاس ایک مقدمہ آیا جس میں۔

مستغیث نے کہا کہ فریقِ ثانی میرا اپنا بھائی ہے۔ لیکن دیکھئے یہ بھائی ہو کر میرے ساتھ کرنا کیا چاہتا ہے۔ اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک دنبی، جو میری معاش کا واحد سہارا ہے۔ اب بجائے اس کے کہ یہ اپنے غریب بھائی کی کچھ امداد کرے مجھ سے کہتا ہے کہ اپنی ایک دنبی بھی مجھے دیدو۔ چونکہ امیر آدمی ہے اور صاحبِ اثر بھی۔ اس لئے باتوں میں مجھے دبا لیتا ہے اور دوسرے لوگ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں — یہ ہے

میرے اس بھائی کا میرے ساتھ برتاؤ۔ اب بتاؤ کہ کیا اس کا یہ مطالبہ جائز ہے؟ (۳۸/۲۴)

یہ تھا وہ غلط معاشی نظام جس کی اصلاح کے لئے حضرت داؤدؑ مامور ہوئے تھے۔ چنانچہ آپ سے کہہ دیا گیا کہ

(تم بلا خوف وخطر، اطمینان سے معاشرہ کی اصلاح کرو) ہم نے تمہیں حکومت عطا ہی اس لئے کی ہے کہ تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے حق کے ساتھ کیا کرو۔ اور کسی کے خیالات اور جذبات کے پیچھے مت لگو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ لوگ تمہیں راہِ راست سے بھٹکا دیں گے۔ (۳۸/۲۶)

حضرت عیسیٰؑ

مسیح انسانیت، حضرت عیسیٰؑ کی تو دعوت ہی ایک طرف "سود خوار یہودیوں" کے خلاف چیلنج، اور دوسری طرف رومیوں کی مستبد حکومت کے خلاف بغاوت تھی۔ لیکن سود خوار یہودی خود سامنے نہیں آتا تھا۔ جس طرح فرعون نے مذہبی پیشوائیت (ہامان) کو حضرت موسیٰؑ کے خلاف اٹھا کھڑا کیا تھا۔ اسی طرح سرمایہ پرست یہودی ہیکل کے احبار ورہبان (علماء ومشائخ) آپ کے سامنے لے آئے تھے۔ اس آسمانی دعوت کی زد خود ان مذہبی پیشواؤں پر کس طرح پڑتی تھی اس کے متعلق انجیل برنباس کا ایک اقتباس دے دینا کافی ہوگا۔ اس انجیل کی فصل ۱۴۲ میں ہے۔

تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے خلاف مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ آدمی بادشاہ ہوگیا تو ہم کیا کریں گے۔ البتہ ہم پر یہ بہت بڑی مصیبت ہوگی۔ اس لئے، کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقے کے مطابق اصلاح کرنی چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ تقالید (رسومات) کو باطل کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہوجائیں گے۔ اس لئے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت جہاں بھی ہو اس کا مسئلہ مذہبی نہیں ہوتا، معاشی ہوتا ہے۔ اور چونکہ دینِ خداوندی کسی ایسے شخص کو برداشت نہیں کرسکتا جو تعمیری کام کئے بغیر دوسروں کی کمائی پر

عیش اُڑائے'، اس لئے مذہبی پیشوائیت کی اس میں گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ یہ وجہ تھی کہ ہیکل کے احبار و رہبان حضرت عیسٰیؑ کی اس انقلاب آفریں دعوت کی اس شدت سے مخالفت کرتے تھے۔

آخری دور

جب حضور خاتم الانبیاءؐ کی وساطت سے دین اپنی آخری اور مکمل شکل میں نوعِ انسانی کو دیا گیا تو نظامِ سرمایہ داری کے حاملین کی طرف سے اس کی مخالفت بھی انتہائی شدت تک پہنچ گئی۔ ہمارے ہاں کے مروّجہ اسلام کی رو سے، جو ہمارے دورِ ملوکیت اور جاگیرداری کا وضع کردہ اور مذہبی پیشوائیت کے سہارے قائم ہے، نبی اکرمؐ کی بعثتِ مقدسہ کا مقصد صرف اتنا ہی بتایا جاتا ہے کہ عہدِ جاہلیت میں عربوں میں شراب خوری، جوئے بازی، باہمی جنگ و جدال، توہمانہ رسومات عام تھیں۔ حضورؐ ان قبیح رسومات کی اصلاح کے لئے تشریف لائے تھے۔ وہ لوگ بت پرست تھے اور آپؐ اسے شرک قرار دیتے تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ قریشِ مکہ اور ان کے ساتھ جملہ قبائلِ عرب نے جو اس دعوت کی مخالفت میں جانوں تک کی بازی لگا دی تھی تو کیا اس کی وجہ محض اتنی تھی کہ وہ ان عادات و رسومات کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے. جو عام اخلاقی اصولوں کی رو سے بھی قابلِ مذمت اور درخورِ نفرت تھیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کی بت پرستی کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ تو اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہی قابلِ غور ہے کہ قرآن کریم نے مسلمانوں کو تاکید کر دی تھی کہ ان کے معبودوں کو گالی مت دیں ــــ لہٰذا ان کے انداز تبلیغ میں اشتعال انگیزی کا عنصر موجود ہی نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ مسلمان غیر مسلموں کو ان کے مذہب سے (خواہ وہ بت پرست ہی کیوں نہ ہوں) زبردستی روک نہیں سکتے تھے۔ تو پھر وہ کون سی بات تھی جس کی وجہ سے یہ سارا ملک اس دعوت کے خلاف میدان کارزار میں اتر آیا تھا۔ بالخصوص جب یہ جماعتِ مومنین مکہ چھوڑ کر مدینہ چلی آئی تھی تو پھر قریش کو کس بات کا خطرہ تھا جو انہوں نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور چھ سات سال تک مسلسل معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں۔

اس سوال کا جواب، ہمارا مروّجہ مذہبی طبقہ دے نہیں سکتا۔ اس کا جواب، البتہ، ایک غیر مسلم نے دیا ہے جس نے تاریخ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا تھا۔

بات یوں ہوئی کہ جب چین میں امریکہ کے پٹھو، چیانگ کائی شیک، کو کمیونسٹوں کے ہاتھوں بری طرح شکست ہوئی تو اس سے امریکہ کو جس قدر خفت اٹھانی پڑی وہ ظاہر ہے۔ اہلِ امریکہ حیران اور متعجب تھے کہ ان کی اس قدر امداد کے باوجود چیانگ کائی شک اس طرح خاسر و نامراد کیوں رہ گیا۔ اس کی (یا خود اپنی سیاست کی) اس ناکامی کی وجہ دریافت کرنے کے لئے اکثر امریکی دیدہ ور چین پہنچے۔ ان میں ایک نامور جرنلسٹ (JACK BELDEN) بھی تھا۔ اس نے وہاں کی سیاحت کے بعد ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا (CHINA SHAKES THE WORLD) وہ اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھتا ہے کہ

تاریخ کے اس تحیر انگیز واقعہ (یعنی انقلاب چین) کے اسباب و علل دریافت کرنے کے لئے نہ تو حکومت امریکہ اور امریکی پریس، نہ ہی امریکہ کے عوام اور ان کے وہ نمایندے جو مشرق بعید کے قونصل خانوں میں بیٹھے ہیں، نہ کاروباری حلقہ اور نہ ہی فوجی ادارے، اپنی نگاہ کو اپنے ذاتی یا قومی مفاد کی تنگ وادی سے آگے لے جاتے ہیں تاکہ وہ اہلِ چین کے دردآگیں اور جذبات سے لبریز قلوب تک پہنچ سکیں۔

اس کے بعد، بیلڈن اس انقلابِ عظیم کی حقیقی وجہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

ان تمام لوگوں کو جو اس انقلاب کی صحیح علت معلوم کرنا چاہتے ہیں، محمدؐ کے ان الفاظ کی یاد دلا دینا چاہیئے جو وہ مکہ کے تاجروں سے کہا کرتے تھے کہ

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝

نہیں! تمہاری تباہی کی وجہ وہ نہیں جو تم سمجھے بیٹھے ہو۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ تم اس شخص کو واجب التکریم نہیں سمجھتے تھے جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے اور ایک دوسرے کو اس امر کی تلقین نہیں کرتے تھے کہ جس کی چلتی گاڑی رک جائے اس کی روٹی کا بندوبست کرنا ضروری ہے۔

یہ تھا آپؐ کا وہ انقلاب آفریں پیغام جس کی وہ لوگ مخالفت کرتے تھے۔ آپؐ ان کے پورے کے پورے معاشرتی اور معاشی نظام کو بدلنا چاہتے تھے۔ قریش بہت بڑے تاجر تھے۔ اتنے بڑے کہ (قرآن کے الفاظ میں)۔

رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ (۱۰۶/۲)

ان کے کاروانِ تجارت سردی، گرمی، سارا سال۔ رواں دواں رہتے تھے۔

ایک طرف تجارت، اور دوسری طرف کعبہ کی تولیت۔ اس سے ان کا پورا معاشی نظام سرمایہ داری پر متفرع تھا۔ اور اس داعیٔ انقلاب کا پیغام، اس نظام کو ختم کرنے کا مدعی تھا۔ وہ اس کی بس طرح مخالفت نہ کرتے تو اور کیا کرتے؟ ان سرمایہ داروں کے سب سے بڑے نمایندہ، ابوجہل نے، جب غلافِ کعبہ کو تھام کر اس تحریکِ جدید کے خلاف اپنے معبودوں سے فریاد کی ہے تو اس میں اس نے کہا یہ تھا کہ یہ پیغام وہی ہے جو فارس میں ابھی ابھی مزدکؒ لایا تھا۔ محمدؐ کو یہ سبق (معاذاللہ) سلمان پارسیؓ نے پڑھایا ہے۔

ایں مساوات، ایں مواخات اجنبی است
خوب می دانم کہ سلماں مزدکی است

انہوں نے حضورؐ کے ساتھ مفاہمت کی صورت پیدا کرنے کے لئے اپنا جو نمایندہ بھیجا تھا اس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وَ جَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا (۷۴/۱۲) اسے بڑی فراواں دولت حاصل تھی۔ ان مخالفین سے جب کہا گیا کہ یاد رکھو! اگر تم نے اپنی روش نہ چھوڑی تو تمہارا حشر بھی وہی ہوگا جو تم سے پہلے تمہاری جیسی قوموں کا ہوا تھا۔ وہ تم سے بھی زیادہ مال و دولت اور قوت وحشمت کی مالک تھیں ان کی بڑی بڑی بستیاں تھیں (۹/۶۹) جن کے اب صرف کھنڈرات باقی رہ گئے ہیں۔ (۲۸/۵۸) اس لئے تم جو اپنے مال و دولت پر اتراتے ہو، تو تمہارا انجام بھی انہی جیسا ہوگا۔ اس لئے کہ یہ خدا کا اٹل فیصلہ ہے کہ

جو شخص مال اور دولت جمع کرتا ہے اور پھر ننانویں کے پھیر میں پھنس جاتا ہے تو اس کا انجام تباہی ہوتا ہے۔ (۱۰۴/۱-۴)

تم رَبِّ کعبہ، کی طرف نسبت رکھنے سے اس قدر مفاد حاصل کرتے ہو کہ نہ تمہیں بھوک کا ڈر ستاتا ہے، نہ کسی قسم کا خوف وخطر لاحق ہے۔ تو تمہیں چاہیئے کہ محکومیت بھی اسی رب کی اختیار کرو (۱۰۶/۱-۴) لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور اپنی مخالفت میں تیز سے تیز تر ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ جب ان کی ہلاکت بڑائی کے انجام کی مہرِ تصدیق ثبت ہوگئی تو قرآن کریم نے ان کے نمایندہ (ابولہب) کا نام لے کر ان کی تباہی

لہ ایران میں اشتراکیت کا داعی۔

سلسلہ میں کہا کہ مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ (۱۱۱/۲) اس کا اس قدر مال و دولت جو اس نے حاصل کر رکھا تھا، اس کے کسی کام نہ آیا۔"

"قرآن کا معاشی نظام" سردست میرا موضوع نہیں۔ میں اس عنوان پر بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ (نظامِ ربوبیت، اس موضوع پر میری مستقل تصنیف ہے)۔ قرآنِ کریم کا مطالعہ اس نگاہ سے کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام، نظامِ سرمایہ داری کے خلاف کھلا ہوا چیلنج ہے۔ اور جو دین (نظامِ زندگی) وہ پیش کرتا ہے، اس کی مخالفت کے اقنومِ ثلاثہ (ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، اور سرمایہ داری) میں، سرمایہ داری کو برابر کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ

(اس باب میں ایک اصولی حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھو۔ اور وہ یہ کہ) کوئی قوم اور بستی ایسی نہ تھی کہ اس میں ہم نے اپنے رسول کو بھیجا ہو جو انہیں ان کی غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتا تھا۔ اور وہاں کے آسودہ حال دولتمند سرمایہ دار طبقہ (مترفین) نے اس کی مخالفت نہ کی ہو۔

وہ کہتے یہ تھے کہ ہمارے پاس مال و دولت کی فراوانی ہے اور ہمارا جتھہ بھی بہت بڑا ہے۔ اس لئے کس کی مجال ہے جو ہمارا بال بھی بیکا کر سکے۔ (۳۴/۳۴)۔

یعنی اس وقت تک جو بات جزءً جزءً بیان ہو رہی تھی، قرآنِ کریم نے اسے ایک کلیہ کی حیثیت سے بیان کر کے، دین اور نظامِ سرمایہ داری کے باہمدگر متضاد اور نقیض ہونے کی حتمی شہادت بہم پہنچا دی۔ یعنی خدا کی طرف سے جہاں اور جب بھی دین آیا، مترفین نے اس کی مخالفت کی۔ اس میں کوئی استثنےٰ نہیں۔ ہر جگہ اور ہر زمانے میں ایسا ہی ہوا۔ ان کے پاس ان کی اس مخالفت کی دلیل فقط یہ ہوتی تھی کہ نظامِ سرمایہ داری ہمارے آباؤ اجداد سے متواتر چلا آرہا ہے۔ ہم اس سے ہٹ نہیں سکتے۔

اور اسی طرح ہم نے کسی بستی میں اپنا رسول نہیں بھیجا کہ وہاں کے دولتمند طبقہ (مترفین) نے یہ نہ کہا ہو کہ ہم نے اپنے اسلاف کو جس راستے پر چلتے دیکھا ہے، ہم اس راستے سے ایک قدم بھی اِدھر اُدھر ہٹنے کے لئے تیار نہیں۔ (۴۳/۲۳)۔

سورۃ انبیاء" میں ان لوگوں کے انجام کو بڑے ڈرامائی انداز میں سامنے لایا گیا ہے، جہاں قرآن کی مخاطب قوم سے کہا گیا ہے کہ

اگر تم اپنی زندگی کا نقشہ قرآن کے مطابق مرتب کر لیا تو تمہیں عظمت اور بلندی حاصل ہو جائیگی۔ اگر اس کے خلاف چلے تو تم بھی اسی طرح تباہ ہو جاؤ گے جس طرح تم سے پہلے کتنی ایسی قومیں تباہ ہو گئیں جنہوں نے ظلم اور نا انصافی پر کمر باندھ رکھی تھی۔ وہ تباہ ہو گئیں اور ان کی جگہ دوسری قوموں نے لے لی۔

ان کی غلط روش کے نتائج غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ انہیں ان کے انجام سے آگاہ کیا جا رہا تھا کہ وہ اس روش سے باز آجائیں۔ لیکن وہ اس تنبیہہ پر کان نہیں دھرتے تھے۔ چنانچہ وہ غیر محسوس نتائج آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ جب وہ محسوس طور پر سامنے آگئے تو وہ اس تباہی سے بچنے کے لئے لگے بھاگنے۔

لیکن اس وقت بھاگنے کا کون موقع تھا۔ چنانچہ ہمارے قانون مکافات نے انہیں للکارا اور کہا کہ اب بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو۔ مت بھاگو۔ اب لوٹے پاؤں اپنی انہی عیش سامانیوں کی طرف چلو (مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ) جن کی سرشاریاں تمہیں اس قدر مدہوش کئے ہوئے تھیں۔ اور اپنے ان محلات کی طرف پلٹو جن کے اندر تم اپنے آپ کو اس قدر محفوظ تصور کیا کرتے تھے۔ وہاں چلو، تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کچھ کس کی محنت سے بنا تھا اور تمہارا اس پر کیا حق تھا۔ ؟ (۲۱/۱۱-۱۴)

قوموں کی تباہی کے سلسلہ میں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ جب کسی قوم کی بربادی کے دن قریب آجاتے ہیں۔ تو

اس کا سرمایہ پرست طبقہ ہوس زر اندوزی میں حدود فراموش ہو جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت اس قوم پر بری طرح مسلط ہوتی ہے اور وہ صحیح روش زندگی کو چھوڑ کر غلط راہیں اختیار کر لیتی ہے۔ تو پھر وہ اس طرح ہلاک ہو جاتی ہے کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔ (۱۷/۱۶)

سورۂ ھود میں ہے کہ تم اقوام گذشتہ کے احوال و کوائف پر نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ اس سے تم کس نتیجہ پر پہنچتے ہو۔ کیا اس نتیجہ پر نہیں کہ

جو لوگ تباہی سے بچ جاتے، ان میں سے بعد میں معدودے چند ایسے رہ جاتے جو اپنے مفاد کو قوانین خداوندی کے مطابق حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور لوگوں کو ناہمواریاں پیدا کرنے سے

روکتے۔ ورنہ باقیوں کا تو یہ حال ہوجاتا کہ وہ اپنی تن آسانی اور مفاد پرستی کے پیچھے لگے رہتے اور دوسروں کا سب کچھ لوٹ کھسوٹ کر لیجاتے۔ تاکہ ان کی عیش ساما نیوں میں فرق نہ آنے پائے۔ (خواہ باقی انسانوں پر کچھ ہی کیوں نہ گزرے) یہ تھے ان کے وہ جرائم جن کی بنا پہ ان کی بربادی ہوتی۔ (پ ۱۱)۔

قوموں کی تباہی کے وقت سب سے زیادہ عذاب اسی سرمایہ دار طبقہ پر وارد ہوتا ہے۔ اس لئے کہ غریبوں کے پاس ہوتا ہی کیا ہے جس کے لٹنے کا انہیں ڈر ہو۔

حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ ۝ (۲۳)

تا آنکہ اس قوم کا مرفہ الحال، سرمایہ دار طبقہ عذاب میں گرفتار ہو جاتا ہے، اور وہ کس بری طرح سے چیختا چلاتا ہے

قول فیصل

قرآن کریم کی تصریحات آپ کے سامنے آچکیں۔ ان سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ دینِ خداوندی کی روسے سرمایہ پرستی کی پوزیشن کیا ہے۔ لیکن اگر آپ کو اب بھی کسی قول فیصل کا انتظار ہے تو اسے بھی سُن لیجئے جہنم کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور اس میں پڑے ہوئے لوگ چیخ چلا رہے ہیں۔ پوچھنے والا پوچھتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں اور انہوں نے کیا جرم کیا تھا جو یہ اس قدر شدید عذاب میں مبتلا ہیں؟

سوال آپ نے سُن لیا۔ اب جواب ملاحظہ فرمایئے۔ کہا کہ

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ۔ (۵۶)

یہ سابقہ سرمایہ داروں کا طبقہ ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد اس موضوع پر کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔

ہم نے دیکھ لیا کہ جو دین (نظامِ زندگی) خدا کی طرف سے آتا تھا۔ ہر دور اور ہر قوم میں، سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے اس کی مخالفت ہوتی تھی۔ اس آیہ جلیلہ کو ایک بار پھر سامنے لایئے جب قرآن کریم نے

بطور کلیہ بیان کیا ہے کہ

وَ مَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ ۝ (۳۴/۳۴)

کوئی بستی بھی ایسی نہ تھی کہ اس میں ہم نے اپنا رسول بھیجا ہو اور اس کے سرمایہ دار طبقہ نے اس کی مخالفت نہ کی ہو۔

مذہب اور سرمایہ داری

جب تک وہ دین اپنی شکل میں باقی رہتا' نظام سرمایہ داری کے حاملین کی پیش نہ چلتی۔ لیکن اس کے بعد وہ دوسرا حربہ اختیار کرتے۔ وہ اسی دین کے نام لیواؤں میں سے مفاد پرست گروہ کو اپنے ساتھ ملا لیتے۔ وہ اس دین کو مسخ کر کے' اسے مذہب کی سطح پر لے آتے اور یہ مذہب' نظام سرمایہ داری کا سب سے بڑا حامی بن جاتا۔ یوں سادہ لوح انسان (عوام) خدا کے نام پر اس فریب میں آجاتے جس طرح نظام سرمایہ داری دین کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا' اسی طرح نظام سرمایہ داری' مذہب کی حمایت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا' محنت کش طبقہ کو معاشی طور پر کتنا ہی مجبور و معذور کیوں نہ کر دیا جائے وہ "بطیب خاطر" کبھی بھی اس پر رضامند نہیں ہو سکتا کہ اس کی محنت کی کمائی دوسرے لوٹ کر لے جائیں۔ یہ فریضہ مذہب پرست طبقہ انجام دیتا ہے۔ وہ غریبوں کو یہ کہہ کر افیون پلاتا رہتا ہے کہ یاد رکھو! رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے وہ جسے چاہے لاکھوں کروڑوں دے' جسے چاہے فقیر بے نوا کر دے۔ امیروں کی دولت پر حسد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ تم خدا کی تقسیم کے خلاف احتجاج کرتے ہو۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ انسان کو ہمیشہ راضی برضا رہنا چاہیئے۔ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ یہ مال و دولت' یہ جائیدادیں اور محلات' سب آنی اور فانی ہیں' اصلی زندگی آخرت کی ہے' اور آخرت کی جنت غریبوں کے لئے ہے۔ خود حضور شہنشاہ دو عالمؐ نے اپنے لئے غریبی پسند کی تھی اور الفقر فخری فرمایا تھا۔ یعنی یہ کہ غریبی میرے لئے باعث فخر ہے۔ آپ خدا سے ہمیشہ دعا کرتے رہتے تھے کہ مجھے غریبوں میں رکھیو اور غریبوں میں اٹھائیو! اسلام غریبوں میں پیدا ہوا اور غریبوں ہی میں باقی رہے گا[1] ــــ مذہب پرست طبقہ یہ' اور

---

[1] یہ طبقہ اس قسم کی روایات (بلکہ آیات) کو ان کے حقیقی مفہوم سے الگ کر کے اپنے مطلب کے مطابق پیش کرتا ہے۔

اس قسم کی اور مقدس باتیں دن رات غریبوں اور محنت کشوں کے کان میں ڈالتا رہتا، اور اس طرح انہیں ان کی حالت پر شاکر رہنے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔ یوں نظام سرمایہ داری کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ مذہب پرست طبقہ خود تو کوئی کمائی کرتا نہیں۔ ان کی اس "خدمت جلیلہ" کے معاوضہ میں، سرمایہ دار طبقہ ان کی کفالت اپنے ذمے لیتا ہے۔

اسلام کے ساتھ کیا ہوا؟

جو کچھ سابقہ انبیائے کرامؑ کے لائے ہوئے دین کے ساتھ ہوا، وہی اسلام کے ساتھ ہوا۔ حضور نبی اکرمؐ نے جس دین کو پیش کیا، سرمایہ دار طبقہ نے اس کی مخالفت کی۔ لیکن ان کی مخالفت کے علی الرغم یہ دین عملی شکل میں قائم ہو کر رہا۔ اور اس طرح ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظام سرمایہ داری کے ابالیس شکست کھا کر پہاڑوں کے غاروں میں جا چھپے۔ لیکن اس کے بعد، انہوں نے وہاں سے پھر سر نکالا اور اسی سازش کہن کے مطابق جس کا ہم نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے، مذہبی پیشوائیت نے اس دین کو خود ساختہ مذہب میں تبدیل کر دیا۔ اب بادشاہوں کے لئے مساجد کے منبروں سے اَیَّدَ کُ اللہُ بِنَصرِہٖ اور خَلَّدَ اللہُ مُلکَہٗ کی دعائیں مانگی جانے لگیں۔ اور سرمایہ داروں کو یہ کہہ کر بدلگام چھوڑ دیا گیا کہ اگر تم بادشاہ کو اس کا ٹیکس اور ہمیں ہمارا ٹیکس (زکوٰۃ) دیدیا کرو تو پھر تمہیں اجازت ہے کہ جس قدر جی چاہے دولت جمع کرلو اور جتنی جی چاہے جائیدادیں کھڑی کر لو۔ اس "مذہب" کی تائید میں روایات وضع کی گئیں اور تاریخ کو مسخ کر کے، اور تو اور، خود صحابہ کبارؓ کو بڑے بڑے سرمایہ داروں کی شکل میں دکھا دیا گیا۔

یہی مذہب، اس وقت تک ہمارے ہاں مروج چلا آ رہا ہے جو دین کی ضد ہے۔ سرمایہ دار طبقہ نے ہمیشہ دین کی مخالفت کی تھی۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے مروجہ مذہب کا سب سے بڑا حامی یہی سرمایہ دار طبقہ ہے۔ کہیں یہ عظیم الشان مسجدیں بنوا رہے ہیں۔ کہیں ان مساجد کی تزئین و آرائش پر ہزاروں روپے خرچ کر رہے ہیں۔ ملک کے ہزاروں دار العلوم اور مکتب انہی کے روپے سے چلتے ہیں اور ائمہ مساجد اور علمائے کرام کی روزی کے یہی کفیل ہیں۔ مذہب کے نام پر بڑی بڑی جماعتیں انہی کے بل بوتے پر بڑھتی اور پھلتی پھولتی چلی جاتی ہیں فقط یہ ایک بات کہ سرمایہ دار طبقہ ہمارے مروجہ اسلام کی حمایت کرتا ہے، اس حقیقت کے اثبات کے لئے دلیل محکم ہے کہ یہ اسلام، بہر حال وہ دین نہیں، جو خدا کی طرف سے بوساطت محمد رسول اللہؐ

دنیا کو ملا تھا۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ وہی دین ہے تو اس سے (معاذ اللہ) خدا کی یہ شہادت جھوٹی ثابت ہوتی ہے کہ

دین جہاں بھی ہوگا، سرمایہ دار طبقہ اس کی مخالفت کرے گا۔

سرمایہ دار طبقہ ہمارے مروجہ اسلام کی اس قدر حمایت کرتا ہے اور اس اسلام کے علمبردار اسے اس کی حسن خدمت کے عوض جنت کے پروانے عطا کرتے رہتے ہیں۔ مروجہ اسلام کی رو سے جنت کس قسم کے کاموں کے عوض ملتی ہے؟ تعمیر و تزئین مساجد، اشاعت دین" کے لئے مالی امداد، صدقات و خیرات۔ زکوٰۃ۔ حج۔ بڑی بڑی درگاہوں کی تعمیر و آرائش۔ نذر نیاز وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ثواب کے یہ کام "صرف دولتمند طبقہ ہی سرانجام دے سکتا ہے۔ غریبوں میں اتنی استطاعت ہی نہیں ہوتی۔ اس لئے 'اس مذہب' کی رو سے دنیا بھی سرمایہ داروں کے لئے ہوتی ہے اور آخرت بھی سرمایہ داروں کے لئے۔ یہی ہے وہ ذہنیت جسے نمایاں طور پر سمجھانے کے لئے قرآن کریم نے سورۂ کہف میں، اپنے تمثیلی انداز میں، دو آدمیوں کا ایک قصہ بیان کیا ہے۔ اس میں، سرمایہ دار کو اس کا دوست سمجھاتا ہے کہ تم ساز و سامان حیات کی اس فراوانی پر اتراؤ نہیں۔ اس وقت تو تم بے شک اپنے آپ کو محفوظ و مصئون سمجھتے ہو، لیکن قیامت میں تمہارا انجام کیا ہوگا۔ کبھی اسے بھی سوچا ہے؟ اس کے جواب میں وہ کہتا ہے کہ

> میرے بھائی! تمہاری یہ باتیں محض واہمہ ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کی گھڑی جس سے تو مجھے ڈراتا ہے، کبھی آئے گی۔ لیکن بفرض محال، اگر ایسا ہوا بھی اور مجھے خدا کے حضور جانا ہی پڑا تو مجھے وہاں بھی اس سے بہتر ٹھکانا ملے گا۔ (۳۶/۱۸)

" میں نے کئی مسجدیں تعمیر کرائی ہیں — ہر مسجد کے عوض مجھے جنت میں ایک مکان — اور وہ بھی یاقوت اور زمرد کا — الاٹ ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ، صدقہ و خیرات کے اکثر کام کرتا رہتا ہوں۔ میں نے کئی حج کئے ہیں۔ اور یہ تو تم جانتے ہو کہ حج کرنے سے انسان ایسے ہو جاتا ہے جیسے آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔ یعنی اس کے تمام سابقہ گناہ دھل جاتے ہیں۔ میں زکوٰۃ بھی نکالتا ہوں۔ اور زکوٰۃ سے باقی مال بالکل پاکیزہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے قیامت میں نجات اور بخشش میرے لئے مقدر ہو چکی ہے۔ جس کی قسمت میں خدا نے یہاں عیش لکھا ہے وہ وہاں بھی عیش ہی کرے گا۔" یہ ہے جنت کی وہ ضمانت جو سرمایہ دار کو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ملتی رہتی ہے اور جس کے لئے انہوں نے وضعی روایات کا ایک انبار اپنے ہاں

محفوظ رکھ چھوڑا ہے۔

لیکن للہ الحمد، کہ خدا کی کتاب ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے۔ لہذا ان لوگوں کا خود ساختہ مذہب اور اس کی تائید میں وضعی روایات و تفاسیر، قرآن کی اس شہادت کو کہاں تک چھپا سکیں گی کہ

سرمایہ دار طبعت کی طرف سے ہمیشہ دین کی مخالفت ہو گی۔

یعنی دین اور نظامِ سرمایہ داری ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

اور جب حقیقت یہ ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ سرمایہ داروں کی اس جنت میں باریابی ہو سکے، جو اتباعِ دین کا فطری نتیجہ ہے۔ "دینداری" کے وہ کام جن کے عوض، مذہبی پیشوائیت، سرمایہ داروں میں جنت کے پروانے تقسیم کرتی رہتی ہے، دین کی میزان میں ان کا وزن کیا ہوتا ہے؟ اسے بھی قرآن کی زبان سے سُن لیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ

> کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اس قسم کے "ثواب" کے کام — مثلاً حاجیوں کے لئے سبیلیں لگا دینا یا خانہ کعبہ کی تزئین و آرائش کا سامان مہیا کر دینا — اُس شخص کے اعمالِ حیات کے برابر ہو جائیں گے جو نظامِ خداوندی کی بنیادی حقیقتوں (خدا اور آخرت) پر ایمان رکھتا ہے اور پھر اس نظام کے قیام و استحکام کے لئے (جسے سبیل اللہ کہا جاتا ہے) مسلسل جدوجہد کرتا ہے؟ اگر تم اپنے ذہن میں ایسا خیال کئے ہو، تو کرتے رہو۔ خدا کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے؟ (۹/۱۹)

اس قسم کے "عبادت گذاروں" کے متعلق کہا گیا ہے کہ

> ان ریاکار نمازیوں کا انجام تباہی ہے جو اس طرح کی پرستش سے لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں اور دین کی عملی تکذیب کرتے ہیں۔ یعنی وہ ایک طرف نمازیں پڑھ کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ بڑے دیندار ہیں۔ لیکن دوسری طرف ان کا عمل یہ ہے کہ وہ اس رزق پر، جسے بہتے پانی کی طرح ہر ایک ضرورتمند کے لئے کھلا رہنا چاہیئے تھا، بند لگا کر اُسے اپنے لئے مخصوص کر لیتے ہیں۔ (۱۰۷/۱-۷)

ان کا انجام کیا ہوگا؟ — اس کے متعلق واضح الفاظ میں بتا دیا کہ

> جو لوگ دولت جمع کرتے رہتے ہیں اور اسے نوعِ انسانی کی عام منفعت (فی سبیل اللہ

کے لئے کھلا نہیں رکھتے۔ اے رسول! تو ان کے لئے ایک الم انگیز عذاب کا اعلان کر دے۔
جب وہ انقلاب آئے گا تو ان کی اس دولت کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس سے انکی
پیشانی، ان کے پہلو، اور ان کی پشت کو داغا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ دولت
جسے تم محض اپنی ذات کے لئے سمیٹ کر بیٹھ گئے تھے۔ اب اپنے سرمایہ کا مزہ چکھو!
(۹/۳۸)

(اکتوبر ۱۹۶۶ء)

زکوٰۃ

قرآنِ کریم کی روشنی میں

(شائع شدہ جولائی ۱۹۶۶ء)

آجکل پاکستان میں یہ بحث چلی ہوئی ہے کہ زکوٰۃ کیا ہے۔ اس کا نصاب اور شرح کیا ہے۔ اور مصارف کیا۔ کیا ان میں تبدیلی کی جا سکتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ہم اس موضوع پر متعدد بار وضاحت سے لکھ چکے ہیں، لیکن اس بحث کے چل نکلنے پر ہمارے پاس استفسارات آنے شروع ہو گئے ہیں اور تقاضا کیا جاتا ہے کہ ہم بتائیں کہ قرآنِ کریم کی رو سے اس کی پوزیشن کیا ہے ـــ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے زکوٰۃ کے متعلق مروجہ مسلک کو سمجھ لیا جائے جسے ہمارا قدامت پرست طبقہ پیش کرتا ہے۔ ان کے مسلک کے مطابق، جب کسی شخص کے پاس ایک خاص مقدار کے مطابق مال جمع ہو۔ اور اس پر ایک سال گذر جائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کا ایک خاص حصہ بطور خیرات دیدے۔ مال کی اس مقدار کو جس پر (ان کے مسلک کے مطابق) زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے۔ نصاب کہتے ہیں اور جس نسبت سے اس میں سے زکوٰۃ نکالی جائے اسے شرح کہا جاتا ہے۔ عام طور پر نصاب حسب ذیل بتایا جاتا ہے۔

(۱)	چاندی	۵۲½ تولہ
(۲)	سونا	۷½ تولہ
(۳)	اونٹ	(۵) پانچ
(۴)	گائے	تیس

(۵) بکریاں چالیس ۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر اسلامی حکومت قائم ہو تو اسے چاہیئے کہ لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرے۔ اگر ایسی حکومت نہ ہو، تو لوگ اپنے اپنے طور پر زکوٰۃ خرچ کردیں۔ لیکن حکومت ہو یا افراد، زکوٰۃ خرچ کی جائے گی انہی مصارف پر جن کا تعین کردیا گیا ہے۔

(۲) قرآن کریم میں "زکوٰۃ" دینے کا حکم تو آیا ہے (جس کی تفصیل ہم آگے چل کر بیان کریں گے) لیکن جن باتوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان میں سے کوئی بات بھی قرآن مجید میں نہیں ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ (کم از کم) مصارف زکوٰۃ کی تصریح تو خود قرآن کریم نے کردی ہے اور اس کے لئے ذیل کی آیت پیش کی جاتی ہے۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ○ (۹/۶۰)

شاہ رفیع الدینؒ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔

سوائے اس کے نہیں کہ خیرات واسطے فقیروں کے اور محتاجوں کے اور عمل کرنے والوں کے اوپر تحصیل اس کی کے۔ اور جن کو کہ الفت دلائے جاتے ہیں دل ان کے۔ اور بیچ آزاد کرنے گردنوں کے۔ اور قرضداروں کو۔ اور بیچ راہ اللہ کے۔ اور مسافروں کو۔ فرض ہے اللہ کی طرف سے۔ اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

اس میں غور طلب بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے یہ مصارف "صدقات" کے بتلائے ہیں (جس کا ترجمہ شاہ صاحب "خیرات" کرتے ہیں)۔ یہ "زکوٰۃ" کے مصارف نہیں۔ قرآن کریم نے "زکوٰۃ" کے لئے "زکوٰۃ" ہی کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس کے مصارف کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ لہذا ہم نے جو کہا تھا کہ زکوٰۃ کے متعلق ان امور کا جنہیں ہمارا قدامت پرست طبقہ پیش کرتا ہے، قرآن کریم میں کہیں ذکر نہیں آیا، تو یہ ایک حقیقت کا بیان ہے۔

۳۔ کہا یہ جاتا ہے کہ یہ تمام تفاصیل نبی اکرمؐ کی متعین فرمودہ ہیں اس لئے یہ ہمارے غیر متبدل قوانین شریعت ہیں۔ (جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے) ہوسکتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے انہیں متعین فرمایا ہو۔ لیکن

بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اگر انہیں حضورؐ نے متعین فرمایا تھا تو آپؐ نے ایسا اپنے زمانے کے خصوصی حالات کے ماتحت کیا ہوگا۔ حضورؐ کا یہ منشار نہیں ہوسکتا کہ یہ تفاصیل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی طرح رہیں۔ اس کی دلیل واضح ہے۔ مثلاً

(۱) نصاب میں چاندی۔ سونے کا ذکر ہے۔ اُس زمانے میں نقدی، چاندی اور سونے ہی کی شکل میں ہوتی تھی۔ لیکن اب نقد مال چاندی/سونے میں اول تو ہوتا ہی نہیں۔ اور اگر کہیں شاذ و نادر کی شکل میں ہوتا بھی ہے تو شاذ۔ (روپیہ بھی خالص چاندی کا نہیں ہوتا)۔ اب نقد مال، نوٹوں کی شکل میں ہوتا ہے یا بینک کی ہنڈیوں وغیرہ کی شکل میں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص کے پاس کچھ روپیہ نوٹوں کی شکل میں ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں۔ اور اگر ہوگی تو کس شرح سے؟ چاندی کی شرح سے یا سونے کی شرح سے۔ اور ایسا کرنے کے لئے کیا سند ہوگی؟

(۲) مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ آجکل چاندی کا بھاؤ تین روپے فی تولہ ہے اور سونے کا نرخ ایک سو تیس روپے فی تولہ۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ مروجہ نصاب کے مطابق، جس شخص کے پاس قریب ڈیڑھ سو روپے کی مالیت کے چاندی کے زیورات ہوں گے اس پر تو زکوٰۃ واجب ہوجائے گی۔ لیکن جس کے پاس آٹھ نو سو روپے تک کی مالیت کے سونے کے زیور ہوں گے وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوگا؛ یعنی ڈیڑھ سو روپے رکھنے والے پر تو زکوٰۃ پڑ جائے گی لیکن آٹھ نو سو روپے رکھنے والے پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ یہ تو پھر بھی کم فرق ہے۔ اس نصاب کی رو سے جس شخص کے پاس ڈیڑھ سو روپے کی مالیت کا چاندی کا زیور ہوگا اسے تو زکوٰۃ دینی پڑے گی لیکن اگر اس کے پاس انیتس ۲۹ گائے ہوں جن کی مالیت سات آٹھ ہزار روپے سے کم نہیں ہوسکتی۔ اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ یعنی غریب پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اس سے نسبتاً امیر پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

آپ نے غور فرمایا کہ خود یہ نصاب بتا رہا ہے کہ (اگر اسے نبی اکرمؐ نے مقرر فرمایا تھا تو) یہ حضورؐ کے اپنے زمانے کے حالات کی رو سے ہوگا جب چاندی/سونے۔ اونٹ۔ گائے کی قیمتوں کا تناسب ایسا ہوگا جس کی رُو سے سب کے لئے نصاب یکساں ہوجائے۔ آج یہ صورت باقی نہیں رہی۔ آج اگر کسی کے پاس آٹھ سو روپے کے چاندی کے زیورات ہوں اور وہ سال ختم ہونے سے پہلے، ان کی جگہ سونے کا زیور بنوالے۔ یا تین

چار گائے دیدے، تو شریعت کی رو سے وہ زکوٰۃ دینے سے بچ جائے گا۔ شریعت کے غیر متبدل (ابدی) قوانین ایسے نہیں ہوا کرتے۔ اس لئے یہ نصاب یا شرح حضورؐ کی طرف سے ابدی طور پر متعین فرمودہ نہیں ہو سکتی۔ تاریخ اس پر بھی شاہد ہے کہ بعض چیزیں جن پر رسول اللہؐ کے زمانے میں زکوٰۃ نہیں پڑتی تھی، خلافت راشدہ کے زمانے میں انہیں زکوٰۃ کی فہرست میں شامل کیا گیا۔ مثلاً تجارتی گھوڑوں اور سمندر سے برآمد شدہ چیزوں کو مدِ زکوٰۃ میں حضرت عمرؓ کے زمانے میں شامل کیا گیا۔

لیکن یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ فرض کر لیجئے کہ زکوٰۃ کی شرح بھی مستقل طور پر خدا اور رسولؐ کی مقرر کردہ ہے اور اس کے مصارف بھی انہی کے متعین فرمودہ۔ ظاہر ہے کہ اس مقررشدہ شرح سے آمدنی بھی مقررہ حد تک ہو سکے گی۔ اب اگر صورت یہ پیدا ہو جائے کہ وہ ضروریات جنہیں مدِ زکوٰۃ سے پورا کیا جانا مطلوب ہے، زکوٰۃ کی آمدنی سے زیادہ ہوں تو اُس وقت کیا کیا جائے گا؟ اس صورت میں یا تو آپ کو بعض ضروریات کو ویسے کا ویسا ہی رہنے دینا پڑے گا۔ اور یا آمدنی زکوٰۃ کے علاوہ کسی اور مد سے حاصل کرنی پڑے گی۔ غور کیجئے کہ ان دونوں صورتوں میں نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ یہی ناکہ خدا نے اور اس کے رسول نے ایک مکمل دین دیا ہے۔ اور اس دین کی کیفیت یہ ہے کہ جو آمدنی اس میں تجویز کی گئی ہے وہ ان ضروریات کو پورا نہیں کرتی، جنہیں پورا کرنے کے لئے وہ آمدنی تجویز کی گئی تھی۔ تو سوچئے کہ غیر مسلم اس دین کے متعلق کیا اندازہ کریں گے جس کے متعلق ہمارا دعوےٰ ہے کہ وہ خدا کا آخری مکمل۔ اور غیر متبدل دین ہے!

(۴) جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، ہمارے قدامت پرست طبقہ کا مسلک یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے زمانے میں۔ زکوٰۃ کی تحصیل اور اس کا صرف کرنا، حکومت کے فرائض میں ہوتا ہے۔ لیکن جب ایسی حکومت نہ ہو تو پھر زکوٰۃ انفرادی طور پر دی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ انفرادی زکوٰۃ، ایک خاص شرح کے مطابق خیرات ہی ہوگی (جیسی کہ یہ اب ہے)۔ لیکن پاکستان میں کیفیت عجیب ہے۔ زکوٰۃ ابھی تک انفرادی طور پر دی جاتی ہے۔ اور خود حکومت بھی یہ طے نہیں کر پائی کہ زکوٰۃ کا وصول کرنا اور صرف کرنا اس کے فرائض میں داخل ہے یا نہیں۔ وہ اس مقصد کے لئے کبھی کوئی زکوٰۃ کمیٹی مقرر کر دیتی ہے کبھی اس کی وصولی کی کوئی اور صورت تجویز کر دیتی ہے لیکن وہ بھی اس انداز سے کہ جس کا جی چاہے اسے (گداگروں کی خیرات کی طرح) حکومت کی جھولی میں ڈال دے اور جس کا جی چاہے اسے خود خرچ کر دے۔ اس میں سے جس قدر روپیہ حکومت کی تحویل میں آجاتا ہے (ہمیں معلوم نہیں کہ اب کچھ آتا بھی ہے یا نہیں) اس کے متعلق یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ

اسے، حکومت کی باقی آمدنی سے بالکل الگ رکھ کر، صرف انہی مدات پر صرف کیا جائے گا جنہیں مصارف زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔

زکوٰۃ ــــ قرآن کریم کی روشنی میں

آیئے اب ہم دیکھیں کہ قرآن کریم کی رُو سے زکوٰۃ کا مفہوم کیا ہے۔ الزکوٰۃ کے بنیادی معنی ہیں نشوونما بالیدگی۔ بڑھنا۔ پھولنا۔ پھلنا۔ یعنی (GROWTH) اور (DEVELOPMENT)

قرآن کریم میں " اقیموا الصلوٰۃ واٰتو الزکوٰۃ " کا حکم متعدد بار آیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنی نظام کے یہ دو ستون ہیں۔ " اقامتِ صلوٰۃ " سے کیا مفہوم ہے، اس کے متعلق ہم اس وقت گفتگو نہیں کرتے۔ ایتائے زکوٰۃ کے معنی ہوئے نشوونما دینا۔ کسی کے بڑھنے۔ پھولنے۔ پھلنے کا انتظام کرنا۔ اس کی (DEVELOPMENT) کا سامان مہیا کرنا۔

اب آگے بڑھئے۔ اسلامی نظام مملکت (جسے حکومت خداوندی کہا جاتا ہے) کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرے جنہیں انسانوں کے متعلق خدا نے اپنے اوپر لے رکھا ہے۔ وہ حکومت جب خدا کے نام پر لوگوں سے اطاعت لیتی ہے تو اس کا فریضہ ہے کہ وہ لوگوں کے ان واجبات کو پورا کرے جن کا ذمہ خدا نے لے رکھا ہے۔

خدا نے قرآنِ کریم کی سب سے پہلی آیت میں اپنے آپ کو رَبُّ الْعٰلَمِیْن کہا ہے۔ یعنی وہ ربوبیت عالمینی کا ذمہ دار ہے۔ ربوبیت کے معنی ہوتے ہیں، کسی شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے نشوونما دیتے ہوئے اس کی تکمیل تک پہنچا دینا۔ اس سے واضح ہے کہ (دیگر اشیائے کائنات کے علاوہ) نوعِ انسان کی عالمگیر نشوونما کا ذمہ بھی خدا نے اپنے اوپر لے رکھا ہے۔ اس ذمہ داری کے سلسلہ میں اس کا ارشاد ہے کہ

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶)

زمین میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔

اور خود انسانوں کے سلسلہ میں فرمایا۔

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)

ہم ان کے اور ان کی اولاد کے رزق (سامانِ زیست) کے ذمہ دار ہیں۔

خدا کی یہ وہ ذمہ داریاں ہیں جنہیں پورا کرنے کے لئے جماعت مومنین (اسلامی نظام) کو متشکل کیا گیا تھا یعنی انکی ذمہ داری تھی کہ وہ ایسا نظام قائم کریں جس سے تمام افرادِ انسانیہ کو ان کی نشو و نما کا سامان ملتا رہے۔ اسے اس نے "ایتائے زکوٰۃ"۔۔۔ سامان نشو و نما دینے ۔۔۔ کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ دیکھئے اس حقیقت کو قرآن کریم کس قدر وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ سورۂ الحج میں ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰہُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ ... (۲۲/۴۱)

یہ (مومنین)، وہ ہیں کہ اگر انہیں زمین میں حکومت مل گئی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔

آپ نے غور فرمایا کہ اسلامی حکومت کا فریضہ "ایتائے زکوٰۃ"۔۔۔ زکوٰۃ دینا ۔۔۔ ہے۔ یعنی نوعِ انسان (یا افرادِ معاشرہ) کو سامان نشو و نما عطا کرنا۔ اس اعتبار سے حکومت کی ساری آمدنی (REVENUE) کو "زکوٰۃ" (یعنی سامان نشو و نما) کہا جائے گا، جسے وہ افرادِ معاشرہ اور اس کے بعد عالمگیر انسانیت کو دینے کے لئے حاصل کرے گی۔ اس کے لئے وہ کیا انتظام کرے گی۔ لوگوں کی کمائی میں سے کس قدر لے گی۔ اس کا تعین ضروریات کے لحاظ سے کیا جائے گا۔ زکوٰۃ کسی خاص ٹیکس کا نام نہیں۔ اسلامی حکومت کی پوری کی پوری آمدنی زکوٰۃ کہلا سکتی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ ان لفظی پیچیدگیوں میں الجھنے کے بجائے، ہمیں قرآن کے مفہوم کے مطابق یوں کہنا چاہیئے کہ

اسلامی مملکت کا ایک بنیادی فریضہ ایتائے زکوٰۃ ہے۔ یعنی تمام افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشو و نما بہم پہنچانا۔ اس مقصد کے پیش نظر اس کی تمام آمدنی زکوٰۃ۔ یعنی ذریعۂ نشو و نما کہلا سکتی ہے۔

اب آگے بڑھیے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سال میں بعض ہنگامی حالات ایسے بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن کے لئے بجٹ میں گنجائش (PROVISION) نہیں ہوتی۔ مثلاً۔ سیلاب۔ زلزلہ۔ وبا۔ جنگ وغیرہ۔ ان کے لئے ملک سے خاص عطیات کی اپیل کرنی پڑتی ہے۔ انہیں قرآن کریم نے "صدقات" سے تعبیر کیا ہے۔ سورۂ توبہ کی آیت ۶۰ میں جو پہلے درج کی گئی ہے، جن "مصارف" کا ذکر ہے وہ صدقات کے مصارف ہیں۔ "زکوٰۃ" کے نہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ

(۱) جو کچھ آجکل زکوٰۃ کے نام سے دیا جاتا ہے، اسے زکوٰۃ سے کوئی تعلق نہیں۔ اسے آپ خیرات کہہ سکتے ہیں۔

(۲) زکوٰۃ کے لئے اسلامی حکومت کا ہونا ضروری ہے۔

(۳) اسلامی حکومت "زکوٰۃ" دیتی ہے۔ یعنی لوگوں کے لئے سامان نشو ونما بہم پہنچاتی ہے۔

(۴) اس فریضہ کی ادائیگی کے پیش نظر اسلامی مملکت کی ساری آمدنی زکوٰۃ (یعنی ذرائع نشو ونما) کہلا سکتی ہے۔ اس آمدنی کی نہ کوئی غیر متبدل شرح ہے نہ خاص نصاب۔ حکومت اسے ضروریات کے مطابق خود متعین کرتی ہے۔ (نبی اکرمؐ اور خلافت راشدہ نے اسے اپنی ضروریات کے مطابق مقرر کیا ہوگا)۔

(۵) ہنگامی حالات کے عطیات کو صدقات کہا جاتا ہے۔

اصطلاحی طور پر بھی دیکھا جائے تو قرن اوّل میں حکومت کی آمدنی کی تین مدات سامنے آتی ہیں۔ غیر مسلموں سے جزیہ، زمین کا لگان (خراج)۔ اور باقی تمام آمدنی کو زکوٰۃ کہا جاتا تھا۔ اندازہ یہ ہے کہ لگان کے لئے اصطلاح انتظامی سہولت کے لئے رکھی گئی ہوگی۔

---

(۸) ہم نے اس گفتگو کو زکوٰۃ تک محدود رکھا ہے۔ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے اور مملکت اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے افراد سے کس حد تک لے سکتی ہے۔ ان نکات کا تعلق معاشی نظام سے ہے جسے ہم شرح و بسط سے پیش کرتے رہتے ہیں۔ اس مقام پر اتنی وضاحت اور کر دی جائے کہ اسلام کے سیاسی نظام کی رو سے، حکومت اور امت دو الگ الگ ادارے نہیں ہوتے۔ ساری کی ساری امت، حکومت میں شریک ہوتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ امت اپنے اجتماعی نظم و ضبط کے لئے جو مشینری وضع کرتی ہے اسے حکومت کہتے ہیں۔ اس لئے جب یہ کہا جائے گا کہ اسلامی حکومت زکوٰۃ دیتی ہے۔ تو اسے یوں بھی کہا جا سکیگا امت مسلمہ (جماعت مومنین) زکوٰۃ دیتی ہے۔ یعنی نوع انسان کی نشو ونما کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔

---

(۹) باقی رہا یہ کہ شریعت کے جو احکام، فقہا تو ایک طرف خود رسول اللہؐ کے مقرر کردہ ہیں حالات کی تبدیلی سے ان میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے متعلق مودودی صاحب تفہیمات (جلد دوم)

صفحہ ۳۲۷ پر رقمطراز ہیں:۔

یہ حقیقت یقیناً ناقابل انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجا آوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات اور تمام حالات میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسے بھی ہیں جن میں تغیرِ حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہو نا ضروری ہے۔ جو حالات عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہؓ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانے اور ہر ملک کے ہوں۔ لہذا احکامِ اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں، ان کی ہو بہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح و حکم کے لحاظ سے ان کے جزئیات میں کسی قسم کا ردوبدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روحِ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں۔

قرآنِ کریم نے زکوٰۃ کا اصول دیدیا ہے۔ اس اصول کی جزئیات اور طریق کار، امت اپنے اپنے زمانے میں، اپنے حالات کے مطابق خود طے کرے گی۔

کمیونزم اور اِسلام

[۸ دسمبر ۱۹۶۵ء کو پرویز صاحب نے پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ پبلک ایڈمنسٹریشن کے ایم۔اے۔ کے طلباء سے خطاب کیا۔ موضوع تھا۔ اسلام کا معاشی نظام۔ اس خطاب کو بعد میں ٹیپ ریکارڈر سے مرتب کر کے۔ طلوعِ اسلام میں شائع کیا گیا تھا۔]

عَزیزانِ من! آپ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ اسلام زندگی کا ایک کُلّی نظام پیش کرتا ہے۔ اور سیاسی، معاشرتی، معاشی، عمرانی نظام سب اس کُلّی نظام کے مختلف اجزاء ہیں۔ لیکن ان اجزاء اور اُن کے کل میں باہمی تعلق ــــ ابتدائی سائنس کی اصطلاح میں ــــ مکسچر یا آمیزہ کا سا نہیں ــــ کمپونڈ یا مرکب کا سا ہے۔ سائنس کے طالب علم جانتے ہیں کہ مکسچر کے تمام اجزاء اپنی اپنی خصوصیات اسی طرح برقرار رکھتے ہیں۔ لیکن مرکب میں ان کی کیفیت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ (مثلاً) پانی مرکب ہے ہائیڈروجن اور آکسیجن کا۔ ہائیڈروجن بڑی تیزی سے جلتی ہے اور آکسیجن ہر شے کے جلنے میں مدد دیتی ہے۔ لیکن دونوں کے مرکب (پانی) کی خصوصیات ان سے یکسر مختلف ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص ہائیڈروجن اور آکسیجن کی الگ الگ خصوصیات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہے کہ اس نے پانی کی خصوصیات کو سمجھ لیا ہے۔ تو وہ ایک بنیادی غلط فہمی میں مبتلا ہوگا ــــ اس سے آگے بڑھئے اور خود انسان کو لیجئے۔ اگر کوئی شخص، علم تشریح الابدان (اناٹومی) کی رُو سے، انسانی جسم کے مختلف اجزاء ــــ دل، گردہ، پھیپھڑے، جگر، حتیٰ کہ دماغ تک کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ کہے۔ کہ اس نے "انسان" (یا اُس فرد) کے متعلق سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ تو وہ کس قدر غلط فیصلے پر پہنچیگا! یہی کیفیت اسلام کے

متعین کردہ نظام کلی کے ان اجزاء کی ہے۔ اگر ان اجزاء کا الگ الگ مطالعہ کرنے کے بعد، یہ تصور کر لیا جائے کہ ہم نے اسلام کے نظام کلی کو سمجھ لیا ہے تو ایسا کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اسلام کے نظام حیات کا صحیح تصور سامنے رکھا جائے۔ اور اس کے بعد دیکھا جائے۔ کہ اس کلی نظام میں یہ اجزاء کیا کام کرتے ہیں۔ اور اُس نصب العین کے حصول میں کس طرح ممد و معاون ہوتے ہیں جو انسانی زندگی کا مقصود ہے بالفاظِ دیگر، یہ مختلف نظام، مقصود بالذات نہیں۔ بلکہ ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ یہ مقصد کیا ہے اور مختلف نظام ـــ یا کم از کم معاشی نظام ـــ اس مقصد کے حصول میں کس طرح ممد و معاون ہوتے ہیں، یہ وہ سوال نہیں جن کا جواب ایک نشست میں دیا جا سکے۔ اسے تو ہماری درسگاہوں کا نصابِ تعلیم ہونا چاہیئے تھا۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آسکتی تھی۔ کہ اسلام کیا ہے۔ اسلامی معاشرہ کسے کہتے ہیں۔ اس کے فرائض و واجبات کیا ہیں۔ اور مقصود و مطلوب کیا ـــ میں بہر حال کوشش کروں گا۔ کہ اس مختصر سے وقت میں اس امر کی وضاحت کروں کہ قرآن کریم کی رو سے اسلام کا معاشی نظام کیا ہے۔ اور اس کے پیش کردہ کلی نظام میں اس کا مقام کیا۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

مَعاشی نظام کی اہمیت

قرآن کریم کی رو سے انسانی زندگی میں معاشیات کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ سورۃ النحل کی ایک آیت سے لگایئے۔ جس میں اس نے ایک مثال سے بات سمجھانے کی کوشش کی ہے[لہ]۔ قرآن کریم کا یہ عام انداز ہے۔ کہ وہ مجرد حقائق کو محسوس تمثیلات سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس آیت جلیلہ میں کہا گیا ہے ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ۔ ایک بستی تھی بڑی مطمئن اور خوشحال۔ چاروں طرف سے سامانِ زیست بڑی فراوانی سے اس کی طرف چلا آتا تھا فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ۔ لیکن اس کے باشندوں نے کفرانِ نعمت کیا۔ جس مقصد کے لئے انہیں یہ سب کچھ

لہ اس خطاب میں بیشتر باتیں ایسی سامنے آئیں گی جو معاشی نظام کے سلسلہ میں اس سے پہلے بھی پیش کی جا چکی ہیں۔ اس میں وہ امور زیادہ وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں۔

دیا گیا تھا۔ اُسے اس کے لئے استعمال نہ کیا۔ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ وہ بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ رہا۔ اور یہی نہیں بلکہ خود اس قوم کی ہستی خطرے میں پڑ گئی۔

یہ کچھ کیوں ہوا۔ اس کا جواب قرآن کریم نے ایک لفظ میں دیدیا ہے۔ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۱۶/۱۱۲)۔ کہا۔ کہ یہ کچھ یونہی نہیں ہو گیا۔ خدا کسی قوم کو یونہی بیٹھے بٹھائے مبتلائے عذاب نہیں کر دیتا۔ یہ اس لئے ہوا۔ کہ انہوں نے رزق کی تقسیم کے صحیح نظامِ خداوندی کو چھوڑ کر، ایک (غلط) نظام خود وضع کیا۔ رزق تو دتی ہوتا ہے۔ اگر اس کی تقسیم خدا کے مقرر کردہ پیمانوں کے مطابق کی جائے تو اس کا نتیجہ ہر ایک کی خوش حالی ہوتا ہے۔ اگر اس کی جگہ انسانوں کا خود ساختہ نظام لے لے، تو اس کی تقسیم ناہموار ہو جاتی ہے اور ناہمواریوں کا نتیجہ غربت، افلاس اور بیرونی خطرات ہوتے ہیں۔

اس سے یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آگئی کہ اگر کسی قوم میں رزق کی قلت ہے ـــ اور یہ قلت ہنگامی طور پر پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ اس قوم کا نہجِ زندگی ہی ایسا ہو چکا ہے۔ یا اس قوم کو ہر وقت اپنی جداگانہ ہستی اور آزادی کے متعلق خطرہ لاحق رہتا ہے۔ تو اس قوم کو کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے۔ اسے سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ وہ خدا کے عذاب میں گرفتار ہے۔

قانونِ خداوندی سے اعراض

اس حقیقت کو سورۂ طٰہٰ کی ایک آیت میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا۔ جو قوم ہمارے قوانین سے اعراض برتتی ہے۔ ان سے پہلوتہی کرتی ہے۔ گریز کی راہیں نکالتی ہے تو اس کی معیشت تنگ ہو جاتی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ جو قوم غربت اور افلاس کی زندگی بسر کر رہی ہو، اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی زندگی قوانینِ خداوندی کے مطابق نہیں۔ وہ ان سے اعراض برت رہی ہے۔

ہمارے ہاں اس سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ اگر کسی قوم کی اس دنیا کی زندگی ذلت اور پستی میں گذرتی ہے تو کوئی بات نہیں۔ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ اصل زندگی تو آخرت کی ہے۔ کامیابی اور کامرانی تو اس کی ہے جس کی آخرت سنور جائے۔ یہ دنیا مومنین کے لئے ہے ہی نہیں۔ ان کے لئے آخرت کی زندگی ہے،

(بلکہ) خدا کے مقرب بندوں کی نشانی ہی یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں غربت اور افلاس کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ نہ کھانے کو روٹی، نہ پہننے کو کپڑا، نہ رہنے کو مکان ـــ یہ ہیں اللہ کے بندوں کی نشانیاں آخرت میں یہی لوگ جنت کی آسائشوں کے مالک ہوں گے۔ یہ ہمارے ہاں کا عام عقیدہ ہے اور اسے محراب و منبر سے ہمیشہ دہرایا جاتا ہے۔ لیکن دیکھئے کہ قرآن کریم کا اس باب میں کیا ارشاد ہے۔ سورۂ طٰہٰ کی جو آیت ابھی ابھی میں نے پیش کی ہے، وہ پوری آیت نہیں آدھی ہے۔ پوری آیت یوں ہے۔

وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی ۝ (۲۰/۱۲۴)۔

جو ہمارے قوانین سے اعراض برتتا ہے اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے اور اسے قیامت میں بھی اندھا ہی اٹھایا جائے گا۔

دوسری جگہ ہے

وَ مَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی وَ اَضَلُّ سَبِیْلًا ۝ (۱۷/۷۲)

جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہوگا۔ بلکہ اس سے بھی گیا گذرا۔

آپ نے غور فرمایا، عزیزانِ من! کہ قرآن کریم کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے؟ یہ کہ

(۱) جو قوم قوانینِ خداوندی سے اعراض برتتی ہے، اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔ اور

(۲) جس قوم کی روزی یہاں اس دنیا میں تنگ ہو۔ سمجھ لو کہ اس کی عاقبت بھی خراب ہوگی۔ جس قوم کی اس دنیا کی زندگی درخشندہ و تابناک نہیں، اُخروی زندگی میں بھی اس کا کچھ حصہ نہیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے!
وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا!
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے!

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد آگے بڑھیئے۔

رزق کا معاملہ

یہ آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ تمدنی زندگی میں (جس میں انسان کو مل جل کر رہنا ہوتا ہے) رزق

کا معاملہ کسی ایک فرد کا ذاتی معاملہ نہیں رہتا۔ یہ مسئلہ معاشرتی اور اجتماعی ہو جاتا ہے۔ مثلاً ہمارے موجودہ معاشرہ میں ایک مزدور دن بھر مزدوری کی تلاش میں مارا مارا پھرے اور کہیں کام نہ مل سکے، تو وہ اور اس کے بچے رات کو بھوکے سوئیں گے۔ یا اگر اسے مزدوری ملی ہے۔ لیکن اس کی اجرت اتنی نہیں جس میں اس کا، اور اس کے بال بچوں کا گزارا ہو سکے۔ تو انہیں اسی طرح دن کاٹنے ہوں گے۔ اس مزدور نے اپنی طرف سے حصولِ رزق کی پوری پوری کوشش کی لیکن اس کے باوجود اس کی بھوک کا علاج نہ ہو سکا۔ یہ اس لئے کہ رزق کا معاملہ پورے معاشرہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ کسی فرد کا الگ معاملہ نہیں۔ کسی جنگل یا صحرا میں ایک فرد تنہا نہ امیر ہو سکتا ہے نہ غریب۔ اس کی یہ پوزیشن معاشرہ کے اندر ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم، افراد کے رزق کے لئے معاشرہ کو ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ یعنی اسے انفرادی مسئلہ کے بجائے معاشرتی مسئلہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اسی کو نظام کہتے ہیں۔ غلط نظام میں رزق کی تقسیم ناہموار ہوتی ہے۔ ایک کے کتوں کو دودھ اور گوشت ملتا ہے اور دوسرے کے بچے بھوکے سوتے ہیں۔ صحیح نظام میں ہر ایک کے رزق کی ذمہ داری نظامِ معاشرہ پر ہوتی ہے جسے عصرِ حاضر کی اصطلاح میں مملکت (سٹیٹ) کہا جاتا ہے۔ جو مملکت قوانین خداوندی کے مطابق نظام قائم کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے۔ اسے "حکومتِ خداوندی" کہا جاتا ہے۔ یہ مملکت لوگوں سے خدا کے قوانین کی اطاعت کراتی ہے، اس لئے یہ ان تمام ذمہ داریوں کو بھی پورا کرتی ہے جنہیں، انسانوں کے سلسلہ میں، خدا نے اپنے اوپر لے رکھا ہے۔ رزق کے متعلق خدا کی ذمہ داری ان الفاظ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (۱۱/۶)

روئے زمین پر کوئی متنفس ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

یہ ذمہ داری اسلامی مملکت اپنے سر پر لیتی ہے۔ اور افرادِ معاشرہ سے واضح الفاظ میں کہتی ہے کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ إِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

اس مقام پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ ان (اور انہی جیسی دیگر) آیات سے عام طور پر یہ عقیدہ پیدا کیا جاتا ہے کہ جب رزق کی ذمہ داری خدا نے خود اپنے سر لے رکھی ہے تو اس کے لئے پریشان

ہونے کی کیا بات ہے۔ وہ جس انسان کو پیدا کرتا ہے اس کے لئے رزق بھی ساتھ ہی مہیا کر دیتا ہے اس لئے یہ کہنا کہ رزق کی پیدائش اور تقسیم کے لئے خاص نظام کی ضرورت ہے۔ مشیتِ خداوندی کی خلاف ورزی ہے۔

یہ عقیدہ غلط ہے اور اس کا ازالہ خود قرآنِ کریم نے کر دیا ہے۔ سورۂ یٰسین میں ہے وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ - جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو رزق خدا نے تمہیں دے رکھا ہے۔ اس میں سے دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بھی دو۔ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا تو کفار مومنین سے کہتے ہیں کہ اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ کہ کیا ہم ان (محتاجوں) کی روٹی کا انتظام کریں۔ جنہیں اگر روٹی دینا مقصود ہوتا تو خدا خود روٹی دیتا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۳۶/۴۷)۔ ان سے کہو کہ تم کیسی کھلی ہوئی گمراہی میں ہو جو یہ کہتے ہو کہ جنہیں رزق دیا جانا مقصود ہو، انہیں خدا خود براہِ راست رزق پہنچاتا ہے۔ اس نے صفحۂ ارض پر رزق بکھیر دیا ہے۔ اسے ہر ایک ضرورتمند تک پہنچانا، انسانی معاشرہ کی ذمہ داری ہے۔ جو معاشرہ اس ذمہ داری کو پورا کرتا ہے۔ وہ مشیتِ خداوندی کے مطابق عمل کرتا ہے۔ لہٰذا قرآنِ کریم کی وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ رزق کی بہم رسانی خدا کے ذمے ہے، اس نظامِ مملکت کو اس کی ذمہ داری سے آگاہ کرتی ہیں جو خدا کے نام پر متشکل ہوتا ہے۔

معاشرہ، مملکت، نظام

ہم نے یہاں معاشرہ، مملکت، نظام، افرادِ معاشرہ وغیرہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے، ضروری ہے کہ ان اصطلاحات کا قرآنی مفہوم بھی سمجھ لیا جائے۔ کہ جب تک ان کا صحیح تصور سامنے نہیں آئے گا۔ معاشی مسئلہ اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکے گا۔

اگر آج کوئی غیر مسلم مسلمان ہونا چاہے تو اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ کلمۂ شہادت پڑھ کر اسلام قبول کر لے۔ اس کے بعد وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ (ہم پیدائشی مسلمانوں کے لئے اس کی بھی ضرورت نہیں)۔ لیکن قرآنِ کریم کی رُو سے مسلمان ہونے کے لئے کچھ اور ہی شرط ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ جب آپ کسی انجمن، کسی سوسائٹی، کسی کلب کا ممبر بننا چاہیں تو آپ کو اس کا فارم رکنیت پُر کرنا ہوتا ہے۔ فارم رکنیت

ممبر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس انجمن، اس سوسائٹی کے قواعد وضوابط کی پابندی کا اقرار کرتے ہیں۔ اسلام بھی ایک برادری، ایک سوسائٹی متشکل کرتا ہے۔ اس سوسائٹی کی رکنیت کے لئے ایک معاہدہ ضروری ہے اس معاہدہ کی رُو سے ایک اقرار اس ممبر کی طرف سے ہوتا ہے اور دوسرا اقرار اس سوسائٹی کی طرف سے۔ وہ معاہدہ یہ ہے:۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹/۱۱۱)

اس معاہدہ کی رُو سے اس سوسائٹی کا ممبر اپنا جان اور مال، خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ اور اس کے بدلے میں، خدا اس کی ذمہ داری لیتا ہے کہ وہ اُسے جنت عطا کر دے گا۔

یہ معاہدہ، افراد اور اسلامی مملکت کے درمیان ہوتا ہے جو خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا عہد کرتی ہے۔

"جنت" کے متعلق ہمارے ذہن میں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ یہ مرنے کے بعد، دوسری زندگی میں جاکر ملے گی۔ مرنے کے بعد، دوسری زندگی کی جنت اپنے مقام پر برحق اور اس پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن جنت اور جہنم کی زندگی کا نقشہ اس دنیا میں بھی سامنے آجاتا ہے۔ غلط (غیر قرآنی) معاشرہ، جہنم کا نمونہ ہوتا ہے اور صحیح (قرآنی معاشرہ) میں زندگی جنت بداماں گزرتی ہے۔ اس جنت کے متعلق جو اس دنیا میں متشکل ہوتی ہے اور جس کی ذمہ داری، اسلامی مملکت لیتی ہے۔ کہا گیا ہے۔

إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ۝ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ۝ (۲۰/۱۱۸-۱۱۹)

اس میں تمہیں نہ بھوک کا خوف ہوگا، نہ کپڑوں کی فکر، نہ اس میں پیاس کی تکلیف ہوگی نہ مکان کی تنگی۔

دوسری جگہ ہے کہ اس جنت کی کیفیت یہ ہوگی۔ کہ

وَكُلَا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵)

انسان جہاں سے جی چاہے، نہایت فراوانی سے کھا پی سکے گا۔

آپ نے غور کیا عزیزان! کہ یہ معاشرہ، تمام افرادِ معاشرہ کو ان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی

خوراک، لباس، مکان - وغیرہ) کی ضمانت دیتا ہے۔ جو نظام معاشرہ اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرتا، اسے اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے آپ کو خدا کی طرف منسوب کرے۔ اسی لئے حضور نبی اکرم (صلعم) نے فرمایا تھا کہ

"جس بستی میں کسی شخص نے اس حالت میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا۔ اس بستی سے اللہ تعالیٰ کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہو گیا۔ (مسند امام احمد)

اور حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ

اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مرگیا۔ تو خدا کی قسم عمرؓ سے اس کی بھی بازپرس ہوگی۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم نے رزق کے مسئلہ کو، فرد کی انفرادی ذمہ داری کے بجائے کس طرح معاشرہ کی اجتماعی ذمہ داری بنا دیا؛ حقیقت یہ ہے کہ جس دامن کا ایک ایک تار ہزاروں، لاکھوں انسانوں کے مفاد کے ساتھ بندھا ہو۔ جس کا تانا بانا پورے معاشرے میں باہمدگر پیوست ہو۔ جو معاشرہ کے مختلف النوع مسائل کے ساتھ اس طرح گتھا اور گندھا ہوا ہو۔ کہ کسی ایک کی حرکت باقی تمام عناصر کو متأثر کر دے۔ اس مسئلہ کو انفرادی قرار دینا، حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا ہے۔ قرآن کریم نے اسے اجتماعی مسئلہ قرار دے کر اس کی اصل و بنیاد کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس نے نظامِ معاشرہ کا اولین فریضہ یہ قرار دیدیا کہ وہ تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے۔

ملکیتِ زمین

سوال یہ ہے کہ معاشرہ اپنی اس عظیم ذمہ داری کو پورا کس طرح کرے گا؟ اس کے لئے ایک چیز بالکل واضح اور بدیہی ہے اور وہ یہ کہ معاشرہ اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو نہیں سکتا جب تک وسائلِ پیداوار پر اس کا کنٹرول نہ ہو۔ وسائل و ذرائع پیداوار میں، بنیادی حیثیت زمین کو حاصل ہے (جو اشیائے خورد و نوش کے علاوہ، جملہ مصنوعات کے لئے خام مصالحہ یہیں سے ملتا ہے) اس کے متعلق قرآن کریم نے کہہ دیا۔ کہ اس پر انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا ارشاد ہے کہ۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۝ (۵۵/۱۰)

زمین کو ہم نے تمام مخلوق کی پرورش کے لئے پیدا کیا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جو چیز تمام مخلوق کی پرورش کا ذریعہ بنائی گئی ہو اسے کسی فرد کی ملکیت میں کیسے دیا جاسکتا ہے؟ خدا نے ہوا کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ تمام جانداروں کی زندگی کا ذریعہ بنے۔ اگر ہوا کو انفرادی ملکیت میں دے دیا جائے تو اس سے جس طرح بے شمار مخلوق دم گھٹ گھٹ کر مرجائے گی اس کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ بعینہٖ یہی پوزیشن زمین کی ہے۔ اس لئے اس نے کہا کہ اسے انفرادی ملکیت کے بجائے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ۔ (۴۱/۱۰)۔ رہنا چاہئے۔ یعنی اس کا انتظام ایسا کرنا چاہیئے کہ یہ تمام ضرورتمندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلی رہے۔ یہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ (۵۶/۷۳) ہے۔ یعنی بھوکوں کے لئے متاع حیات۔ اس میں رِزْقًا لِّلْعِبَادِ (۵۰/۱۱) ہے۔ یعنی خدا کے تمام بندوں کے لئے رزق۔

قرآنِ کریم کی انہی آیات کی تشریح کرتے ہوئے نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے، اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے۔ (ابوداؤد)

لہذا، زمین کو ایسی حیثیت دے دینا، جس سے یہ تمام مخلوق کے لئے مشترکہ ذریعہ پرورش رہنے کے بجائے کسی فرد یا افراد کی ملکیت اور جائیداد بن جائے، اس مقصد کے خلاف ہوگا جس کے لئے خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔ یہ معاشرہ کی تحویل میں رہے گی اور معاشرہ ایسا انتظام کرے گا جس سے ہر فرد کو اس کی ضرورت کے مطابق رزق ملتا جائے۔

زمین اور ہوا میں فرق

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ زمین یا ہوا (یا سورج کی روشنی) میں ایک بنیادی فرق ہے۔ ہوا، روشنی وغیرہ فطرت کی طرف سے تیار شدہ حالت میں ملتی ہے۔ لیکن زمین سے، محنت کر کے، رزق حاصل کرنا پڑتا ہے اس لئے اس کی پیداوار، ہوا اور روشنی کی طرح عام نہیں کی جاسکتی۔ قرآن کریم اس سوال کا بھی جواب دیتا ہے اور نہایت شگفتہ اور دلنشین انداز میں دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ ہم محنت کر کے زمین کو قابل کاشت بنا لیتے ہیں۔ اس میں ہل چلاتے ہیں۔ تخم ریزی کرتے ہیں۔ پانی

دیتے ہیں۔ اس طرح اس سے پیداوار ہوتی ہے۔ لہٰذا اس پیداوار کے ہم واحد مالک ہیں۔ اس میں کسی اور کا حصّہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن ذرا غور کرو کہ اس تمام کاروبار میں، تمہارا حصّہ کس قدر ہے اور ہمارا (خدا کا) کس قدر۔ بادنیٰ تدبر یہ بات سامنے آجائے گی کہ یہ تمہارا اور ہمارا مشترکہ کاروبار تھا۔ اس میں سب سے پہلے تو یہ دیکھو کہ پیداوار کا بنیادی ذریعہ (زمین)، ہماری پیدا کردہ تھی۔ تمہاری نہیں تھی۔ اب اس سے آگے بڑھو۔ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ؕ (۵۶ - ۶۳)۔ جو کچھ تم بوتے ہو۔ کیا تم نے اس پر بھی غور کیا ہے؟ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝۔ تم فقط زمین میں بیج ڈالتے ہو۔ کہو کہ اس بیج سے فصل تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ۝ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝ اگر ہمارا قانونِ زراعت ایسا نہ ہوتا تو فصل کا پروان چڑھنا تو ایک طرف یہ خشک ہو کر چورا چورا ہو جاتی۔ اور تم ششدر اور حیران رہ جاتے کہ یہ کیا ہو گیا۔ ہم پر مفت میں چٹی پڑ گئی۔ ہمارا بیج بھی ضائع ہو گیا۔

پھر آگے بڑھو۔ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِىْ تَشْرَبُوْنَ ؕ کیا تم نے اس پانی پر بھی غور کیا ہے۔ جو تمہارے لئے وجہ زیست اور تمہاری کھیتی کے لئے ذریعہ پیداوار ہے ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۝ کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہم برساتے ہیں لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ۝۔ اگر ہمارے نظامِ ربوبیت کا یہ تقاضا نہ ہوتا (کہ نوعِ انسان کی پرورش ضروری ہے)، تو ہم اسے ایسا کھاری بنا دیتے جسے نہ تم پی سکتے۔ نہ اس سے تمہاری کھیتیاں اُگ سکتیں۔ تم اس کے سپاس گذار کیوں نہیں ہوتے۔

اور آگے بڑھو۔ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِىْ تُوْرُوْنَ ؕ کیا تم اس آگ پر غور نہیں کرتے جسے تم روشن کرتے ہو۔ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَاۤ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ۝۔ کیا ان درختوں کو جن سے آگ کا سامان حاصل ہوتا ہے۔ تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں۔

تم ان واضح، بدیہی اور محسوس حقائق پر غور کرو کہ یہ سامانِ زیست، جسے تم اپنی واحد ملکیت تصور کرتے ہو۔ اس میں ہمارا حصّہ کس قدر ہے۔ اور تمہارا کس قدر؟ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً۔ ہم تمہیں اس حقیقت کی یاددہانی کرانا چاہتے ہیں جسے تم فراموش کر چکے ہو۔ اس مشترکہ کاروبار سے جو کچھ حاصل ہوا ہے اس میں سے تم اپنا حصّہ لے لو۔ اور ہمیں ہمارا حصّہ دیدو۔ تم پوچھو گے کہ آپ کا حصّہ کسے دیدیں۔؟ ہمارا جواب یہ ہے

کہ ہم نے اسے مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ٥ (۵۶ / ۷۳) بنایا ہے۔ یعنی اسے بھوکوں کے لئے سامانِ زیست۔ اسے تم ان کے حوالے کر دو۔ یوں ہمارا حصہ ہم تک پہنچ جائے گا۔ علامہ اقبالؒ نے اسی قرآنی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے کس کا یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب
دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں میری نہیں

کمانے کی استعداد میں فرق

قرآنِ کریم نے جو کچھ ان آیات میں زمین کے متعلق کہا ہے، وہی کچھ وہ خود انسانی صلاحیتوں کے متعلق کہتا ہے۔ قارون کو قرآن نے نظامِ سرمایہ داری کے نمایندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے وہ کہتا ہے کہ اس کی ذہنیت یہ تھی کہ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (۲۸ / ۷۸)۔ میری تمام دولت، میری اپنی ہنرمندی اور قابلیت کی بنا پر مجھے ملی ہے۔ اس لئے اس میں کوئی اور دخل نہیں دے سکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۹ / ۴۹)۔ یہ ذہنیت بڑی غلط نگہی اور گمراہی پر مبنی ہے۔ لیکن لوگ اکثر اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ جو کچھ کوئی کماتا ہے وہ اس کی تنہا، واحد قابلیت یا کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اس میں بالواسطہ و بلاواسطہ پورے معاشرہ کی تگ و تاز بھی شامل ہوتی ہے۔ اس میں متعدد عناصر ایسے ہوتے ہیں جن میں اسے انفرادی طور پر کچھ دخل نہیں ہوتا۔ مثلاً اس کی پیدائشی صلاحیتیں، تعلیم و تربیت، ماحول، معاشرہ کا نظم و نسق، مناسب مواقع کا حصول دیگر افراد کا تعاون وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے جو کچھ ایک فرد کماتا ہے وہ کبھی اس کی واحد ملکیت نہیں قرار پا سکتا۔ وہ ماحصل ہوتا ہے

بہت سے دیگر عناصر کا۔ لہذا اسے بھی اسی نسبت سے بٹنا چاہیئے۔ اس نے اسے سورۂ نحل کی ایک آیت میں بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ہم اسے تسلیم کرتے ہیں کہ بعض افراد میں، دوسروں کے مقابلہ میں، اکتسابِ رزق کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے لیکن یہ صلاحیت (بنیادی طور پر) ہماری عطا کردہ ہوتی ہے۔ مگر یہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ چنانچہ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ۔ جن لوگوں کو اکتسابِ رزق کی زیادہ صلاحیت حاصل ہوتی ہے وہ اس فاضلہ کمائی کو ان لوگوں کی طرف نہیں لوٹاتے جو ان کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ درحقیقت انہیں کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ رزق ہوتا ہی ان کا ہے اس لئے اسے ان کی طرف ہی لوٹا دینا چاہیئے۔ لیکن لوگ ایسا نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ؕ۔ واہ! اس طرح تو گدھا گھوڑا سب برابر ہو گئے۔ اگر یہ کمائی انہیں دیدی جائے تو پھر ہم میں اور ان میں فرق کیا رہا؟

اب سنئے ان کے اس اعتراض کا جواب۔ کہا اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ (۱۶/۷۱)۔ یہ لوگ اس سے انکار کرتے ہیں کہ جو کچھ انہیں زائد حاصل ہوا ہے وہ ان اسباب کی وجہ سے ہے جو ان کے پیدا کردہ نہیں، بلکہ انہیں خدا کی طرف سے عطا ہوئے ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ وہ اس کمائی کے واحد مالک ہیں ان کا اس حقیقت سے انکار ہے کہ اس میں کتنا کچھ ایسا ہے جو ان کا اپنا پیدا کردہ نہیں۔ یہ عناصر وہ ہیں جن کے متعلق دوسری جگہ کہا گیا۔ کہ وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (۱۶/۵۳)۔ یاد رکھو! یہ تمام اسباب و ذرائع، انعاماتِ خداوندی ہیں۔ تمہارے پیدا کردہ نہیں۔ اس لئے ان کا ماحصل تمہاری واحد ملکیت نہیں ہو سکتا۔

اصل یہ ہے کہ یہ "کم اور زیادہ کمائی" کا تصور بھی سکے کا پیدا کردہ ہے۔ ایک مزدور اور ایک انجنیئر دن بھر کام کرتے ہیں۔ ہم مزدور کو شام کو تین روپے دیتے ہیں اور انجنیئر کو تیس روپے[1]۔ یوں مزدور کی کمائی

---

[1] مزدور کا معاوضہ تین روپیہ اور انجنیئر کا معاوضہ تیس روپیہ، طلب و رسد (SUPPLY AND DEMAND) کا مقرر کردہ ہے۔ اگر مزدور انجنیئروں کی طرح کمیاب ہوں تو ان کا معاوضہ بھی تیس روپے ہو اور اگر انجنیئر مزدوروں کی طرح عام ہو جائیں تو ان کا معاوضہ تین روپے ہو جائے۔ غلط معاشرہ ایسے حالات پیدا کرتا ہے جس میں مزدور عام رہیں تاکہ سرمایہ دار کو ان کی محنت کا معاوضہ زیادہ نہ دینا پڑے۔

انجنیئر کی کمائی سے کم ہوتی ہے۔ لیکن یہی مزدور اور انجنیئر (دو بھائی) اپنا مکان تعمیر کر رہے ہوں تو اس وقت ان کی کمائی میں کمی اور بیشی کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ دونوں کے ذمے کچھ کام ہوتا ہے اور وہ اس کام کو محنت سے سرانجام دیتے ہیں۔ لہذا کمائی میں کمی اور بیشی اس وقت سامنے آتی ہے جب ہم کام کے معاوضہ کا معیار سکے قرار دیں۔ جب صرف کام سامنے ہو تو کمائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سوال ضروریات کا ہوتا ہے جسے معاشرہ پوری کرتا ہے۔

اسلامی نظام میں معاشرہ پوری کی پوری ملت کا اپنا گھر ہوتا ہے جس کی تعمیر اور تزئین تمام افراد کا فریضہ ہوتا ہے۔ وہ سب اپنے اپنے مفوضہ کام کو فریضہ سمجھ کر سرانجام دیتے ہیں اس لئے ان کے ہاں اس کے معاوضہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یوں قرآن کے معاشی نظام میں، جب وہ اپنی مکمل شکل میں قائم ہو کمائی "کم اور بیش" ہوتی ہی نہیں۔

دولت

عربی زبان میں "دولت" کے معنی گردش کرنے والی چیز کے ہیں۔ اور یہ بیشتر مشتمل ہوتی ہے، سونے اور چاندی کے سکوں (یا ان کے بدل، کرنسی نوٹوں) پر۔ ان سکوں کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ شروع شروع میں، جب انسان کی تمدنی زندگی اس قدر وسیع اور پیچیدہ نہیں تھی، لوگ، اپنی مختلف ضروریات پوری کرنے کے لئے، اشیائے مستعلہ کا تبادلہ کر لیا کرتے تھے۔ (اسے انگریزی زبان میں بارٹر سسٹم سے تعبیر کیا جاتا ہے) بعد میں جب زندگی پھیل گئی اور اشیاء کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا دقت طلب ہو گیا تو سکے رائج کئے گئے۔ یہ تبدیلی کی گئی تھی انسان کی سہولت کی خاطر لیکن مفاد پرست گروہ نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اشیائے مستعلہ کا (جو اس زمانے میں بیشتر کھانے پینے کی چیزوں پر مشتمل ہوتی تھیں) زیادہ عرصہ تک ذخیرہ کرنا مشکل تھا۔ اس لئے وہ بہرحال لوگوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے گردش میں رہتی تھیں۔ لیکن روپیہ پیسہ کو جب تک جی چاہے دبائے رکھا جا سکتا تھا۔ اس طرح اس گروہ نے روپیہ جمع کرنا شروع کر دیا اور دولت، گردش میں رہنے کے بجائے، مالداروں کے دفینوں میں بند ہوتی گئی۔ دولت کی گردش رک جانے سے جو مفاسد پیدا ہو سکتے ہیں ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ دولت کو جس قدر گردش سے روکا جائے گا اسی قدر لوگوں کی ضروریات رکی رہیں گی۔ قرآن کریم نے

دولت جمع کرنے اور روک رکھنے کو سنگین جرم اور تباہی کا موجب قرار دیا ہے۔ اس نے کہا تباہی اور بربادی ہے اُس کے لئے۔

الَّذِی جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ (۱۰۴/۲)

جو مال جمع کرتا ہے اور پھر اس کی ذہنیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ (ننانوے کے پھیر میں پڑ کر) اسے گنتا رہتا ہے۔

اس کے بعد اس نے کہا کہ اس روشِ زر اندوزی سے اس جہنم کی آگ بھڑک اٹھتی ہے جس کے شعلے "دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں" سورۂ معارج میں ہے کہ جہنم اس شخص کو آوازیں دے دے کر بلاتی ہے جس کی کیفیت یہ ہو کہ جَمَعَ فَاَوْعٰی (۷۰/۱۸) وہ دولت جمع کرتا ہے اور پھر اسے روک کر بیٹھ جاتا ہے۔ سورۂ ماعون میں ہے کہ دولت اور دیگر ذرائع رزق کو چشمۂ جاریہ کی طرح بہتے رہنا چاہیئے تاکہ ہر ایک اپنی اپنی ضرورت کے مطابق اس سے بہرہ یاب ہو سکے۔ لیکن لوگ یَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ۔ ان چیزوں کے آگے بند لگا کر بیٹھ جاتے ہیں اور یوں انسانیت کے لئے مشکلات پیدا کرنے کا موجب بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ اگر دیندار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ تو ان کا یہ دعوےٰ جھوٹا ہے۔ یہ دین کی تکذیب کرتے ہیں یہ اگر اپنے آپ کو نمازی کہتے ہیں تو ان کی نمازیں ان کے لئے تباہی کا موجب ہیں۔ (۱۰۷/۱۰۱)۔ اور عذاب جہنم کا باعث۔ سورۂ توبہ میں ہے اَلَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (۹/۳۴)۔ جو لوگ چاندی اور سونے کے سکے جمع کر رکھتے ہیں اور انہیں نوعِ انسان کی بہبود کے لئے کھلا نہیں رکھتے (اے رسول!) ان کے لئے ایک الم انگیز عذاب کا اعلان کر دو۔ یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُکْوٰی بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ ○ (۹/۳۵)

جس دن ان سکوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا۔ اور ان سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشتوں کو داغا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہ سکے ہیں جنہیں تم نے صرف اپنے ذاتی مفاد کی خاطر روک رکھا تھا۔ لہٰذا آج تم اس الم انگیز عذاب کا مزہ چکھو جو تمہاری غلط روش کا فطری نتیجہ ہے۔

واضح رہے کہ قرآنِ کریم نے دولت کے روک رکھنے کے مقابلہ میں "انفاق" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ نَفَقٌ اس سرنگ کو کہتے ہیں جس کے دونوں منہ کھلے ہوں۔ اس سے دولت کے متعلق

قرآنِ کریم کا نقطۂ نگاہ واضح ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس بخل کا لفظ ہے۔ یعنی دولت کو عالمگیر انسانیت کے لئے کھلا رکھنے کے بجائے اپنی ذات کے لئے روک رکھنا۔ جو قوم اپنے ہاں اس قسم کا معاشی نظام رائج کرے جس میں اس روش کو جرم نہ قرار دیا گیا ہو قرآن کہتا ہے کہ وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے وَ یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ (۴۷/۳۸)۔۔۔ اور اس کی جگہ ایسی قوم لے لیتی ہے جو اس جیسی نہیں ہوتی؛ یعنی اس قوم کا معاشی نظام اس قسم کا نہیں ہوتا۔ آپ نے غور کیا کہ قرآنِ کریم کی رو سے قوموں کے عروج و زوال میں ان کے معاشی نظام کا کس قدر بنیادی دخل ہے۔

دولت کی گردش

اتنا ہی نہیں کہ دولت گردش میں رہے۔ بلکہ اس کی گردش ایسی ہو کہ وہ معاشرہ میں اس طرح رواں دواں رہے جس طرح جسم کی رگوں میں خون گردش کرتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اوپر کے طبقہ ہی میں گردش کرتی رہے۔۔۔ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ (۵۹/۷)۔ وہ تم میں سے امیروں کے گھروں میں ہی نہ پھرتی رہے؛

رِبٰوا

دولت کیوں جمع کی جاتی ہے؟ اس لئے کہ انسان کو محنت کر کے کمانا نہ پڑے، بلکہ خود دولت کمائی کا ذریعہ بن جائے۔ یہاں سے وہ سوال سامنے آتا ہے جو نظامِ معیشت کی اصل اور بنیاد ہے۔ یعنی یہ معاوضہ محنت کا ہونا چاہیئے یا سرمایہ کا۔۔۔ قرآنِ کریم اس باب میں کھلے کھلے الفاظ میں کہتا ہے ۔۔ کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۝ (۵۳/۳۹)۔ "انسان صرف اس کا حقدار ہے جس کے لئے وہ محنت کرے"؛ معاوضہ محنت کا ہے۔ سرمایہ کے معاوضہ کو وہ ربٰو سے تعبیر کرتا ہے۔ ہمارے ہاں ربٰو کا ترجمہ عام طور پر سود کیا جاتا ہے اور اس سے پھر اس قسم کی بحثیں چھڑ جاتی ہیں کہ سود کس قسم کا جائز ہے اور کس قسم کا ناجائز۔ سوال سود کا نہیں ربٰو کا ہے اور ربٰو کے معنی ہیں سرمایہ پر بڑھوتی۔ خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے ۔۔۔ یہ ہے ربٰو جسے قرآن نے حرام قرار دیا ہے۔ وَ حَرَّمَ الرِّبٰو۔ (۲/۲۷۵)۔ چونکہ ایسا معاشی نظام جس میں، سرمایہ کا معاوضہ جائز قرار دیا جائے

قرآن کے معاشی نظام کی یکسر نقیض ہے اس لئے قرآن کریم نے اسے اسلامی نظام کے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیا ہے۔ (۲۷۸)۔

بیع (تجارت)

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا (۲۷۵)۔۔۔ خدا نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربوٰا کو حرام۔ اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ بیع (تجارت) میں بھی تو سرمایہ پر منافع لیا جاتا ہے اس لئے یہ کس طرح جائز ہو سکتی ہے۔ اور اگر یہ جائز ہے تو پھر یہ اصول صحیح نہیں کہ قرآنی نظامِ معیشت میں خالی سرمایہ پر منافع جائز نہیں۔ یہ سوال آج کی ذہنیت کا پیدا کردہ نہیں۔ زمانۂ نزولِ قرآن میں بھی ایسے لوگ تھے جو اس ذہنیت کے حامل تھے اور کہتے تھے کہ اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (۲۷۵)۔۔۔ بیع (تجارت) بھی تو ربوٰا ہی کی مثل ہے۔ پھر یہ کیوں ہے کہ بیع حلال ہے ۔۔۔ اور ربوٰا حرام۔

اس سلسلہ میں، پہلے تو بَیْعٌ کے لفظ پر غور کیجئے۔ یہ لفظ خریدنے اور فروخت کرنے، دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ یعنی ایسی شکل جس میں ایک شخص بیک وقت کچھ بیچتا ہے اور کچھ خریدتا ہے۔ یہ شکل (بارٹر سسٹم) ہی میں ممکن العمل ہے۔ اس میں ایک شخص اپنی ایک جنس بیچتا ہے اور اس کے بدلے میں دوسری جنس خریدتا ہے۔ اس سے ایک ہی سودے میں دونوں طرف سے، خرید اور فروخت عمل میں آجاتی ہے۔ جب سکوں کے عوض کسی شے کو خریدا جائے تو خریدار دوسرے کی شے کو خریدتا ہے۔ اس کے ہاتھوں کچھ بیچتا نہیں۔ اس لئے بَیْعٌ (بارٹر سسٹم) میں ربوٰا (سرمایہ پر بڑھوتی) کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔

اب رہی بیع (تجارت) کی موجودہ شکل جس میں کاروبار سکوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ جب قرآنی معیشت کے یہ اصول واضح ہیں کہ

(۱) معاوضہ محنت کا ہے ۔۔۔ اور

(۲) خالی سرمایہ پر منافع حرام ہے۔

تو تجارت کی صرف وہ شکل جائز قرار پائے گی جس میں تاجر اپنی محنت کا معاوضہ لے سکے۔ جو سرمایہ اس نے لگایا ہے اس پر منافع نہ لے۔ یعنی اس میں اصول یہ ہو کہ

قیمت فروخت = لاگت + محنت کا معاوضہ

اور "محنت کا معاوضہ" نظامِ مملکت کی طرف سے متعین ہو۔

کاریگر اور دوکاندار

تجارت کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ کاریگر کوئی چیز بناتا ہے۔ دوکاندار اسے خریدتا ہے اور پھر اپنے منافع کے ساتھ آگے بیچ دیتا ہے۔ غلط نظامِ معیشت میں، دکاندار کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ کاریگر کو کم از کم دے اور گاہک سے زیادہ سے زیادہ لے۔ قرآنِ کریم نے اس ذہنیت کو فاسقانہ اور اس قسم کے نظام کو جس میں یہ روش عام ہو مجرمانہ قرار دیا ہے اور اس کا نتیجہ قوم کے لئے تباہی بتایا ہے۔ وہ کہتا ہے وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ (۸۳/۱) تباہی ہے ایسے لوگوں کے لئے جن کی کیفیت یہ ہو کہ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ (۸۳/۲)۔ جب وہ دوسروں سے لیں تو پورا پورا لیں۔ وَ اِذَا کَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ یُخْسِرُوْنَ (۸۳/۳)۔ اور جب انہیں دیں تو ماپ اور تول میں کمی کر دیں۔

ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم کی عائد کردہ شرائط کو پورا کرنے کے لئے بیع کی وہ شکل زیادہ مناسب ہوگی جس میں اشیائے مستعملہ خود نظامِ مملکت کے زیرِ تحویل تیار ہوں اور وہی ان کی تقسیم کا انتظام کرے۔

فاضلہ دولت

عزیزانِ من! میں نے جو کچھ اس وقت تک کہا ہے وہ ایک صحیح (قرآنی) نظامِ معاشی کے اصول و مبادیات ہیں۔ ورنہ قرآنِ کریم نے، ایک مختصر اور سادہ حکم سے پورے نظامِ سرمایہ داری کو اس کی جڑ اور بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) اگر افرادِ معاشرہ کے پاس فاضل دولت نہ رہے تو نظامِ سرمایہ داری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں سنئے کہ قرآنِ کریم کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ؟ اے رسول! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دولت، دوسروں کی ضروریات کے لئے کھلی رکھیں قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) ان سے کہدو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضرورت سے زائد ہے، سب کی سب۔ آپ نے غور کیا کہ اس ایک حکم سے کس طرح نظامِ سرمایہ داری کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

ضروریات کا تعیّن کون کرے گا؟

اس مقام پر ایک دلچسپ اعتراض سامنے لایا جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ان ضروریات کا تعیّن کون کریگا؟ اگر اسے لوگوں کی اپنی مرضی پر چھوڑ دیا جائے گا تو وہ اپنی ضروریات ہی اتنی بتائیں گے جن کے پورا ہونے کے بعد کچھ باقی نہ بچے۔ اور اگر ان ضروریات کا تعیّن حکومت کی طرف سے ہوگا۔ تو یہ زندگی، جیل خانے کے قیدیوں کی سی ہوگی جس میں ان کی ضروریات کا تعیّن جیل کے قواعد کی رُو سے ہوتا ہے۔

اس قسم کے اعتراضات کی وجہ یہ ہے کہ ہم نظام تو اسلام کا سامنے لاتے ہیں اور اس کا اطلاق اپنے آپ پر کرتے ہیں جن کی حالت یہ ہے کہ نہ ہمارا ذہن قرآنی، اور نہ ماحول قرآنی۔ ظاہر ہے کہ قرآن کے اصول و احکام قرآنی ذہنیت و تصورات کے حامل افراد کے لئے ہیں۔ اور وہ قرآنی ماحول اور نظام کے اندر فٹ ہو سکتے ہیں اگر ہم ان کا اطلاق اپنے آپ پر کرنے لگیں گے۔ تو وہ ایسا ہی ہوگا جیسے کسی ٹیڑھے پاؤں میں سیدھا جوتا پہنانے کی کوشش کی جائے۔ جن مسلمانوں نے اس نظام کو عملاً متشکل کیا تھا، ان کی ضروریات اور ضروریات کے تعین کی کیفیت کیا تھی؟ اس کا اندازہ دو ایک واقعات سے لگائیے۔ جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو سوال یہ پیدا ہوا کہ خلیفہ کا وظیفہ کیا مقرر کیا جائے۔ بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ یہ ہوا کہ اسے خود خلیفہ پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنی ضروریات کے لئے کتنا وظیفہ کافی سمجھتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے دریافت کیا کہ مدینہ میں ایک مزدور کی کم از کم آمدنی کیا ہے۔ وہی آمدنی آپ نے اپنے لئے بطور وظیفہ مقرر کی۔ جب پوچھا گیا کہ اس میں آپ کا گزارہ کیسے ہوگا تو آپ نے فرمایا۔ کہ اتنی آمدنی میں جس طرح اُس مزدور کا گزارہ ہوتا ہے۔ اسی طرح میرا گزارہ ہوگا۔ میں کوشش کروں گا کہ اس مزدور کی آمدنی بڑھتی جائے تاکہ اس طرح میرے وظیفہ میں بھی اضافہ ہوتا جائے۔

اب رہا ضروریات کا تعیّن ـــــ ایک دن کھانے کے بعد آپ نے بیوی سے کہا کہ کوئی میٹھی چیز نہیں؟ اس نے کہا کہ بیت المال سے جو راشن آتا ہے اس میں میٹھی چیز کوئی نہیں ہوتی ـــــ بات آئی گئی ہوئی ـــــ سات آٹھ روز کے بعد آپ نے دیکھا کہ کھانے کے ساتھ دسترخوان پر تھوڑا سا حلوہ بھی رکھا ہے آپ نے اُسے کھایا۔ اور پھر پوچھا کہ یہ حلوہ آج کیسے بن گیا؟ بیوی نے کہا کہ میں نے اُس دن آپ کی خواہش کو محسوس کر کے یہ کیا کہ ہر روز آٹا گوندھتے وقت ایک مٹھی بھر آٹا الگ رکھ لیتی تھی۔ سات آٹھ روز کے بعد

وہ آٹا اتنا ہو گیا کہ بازار سے اس کے عوض تھوڑا سا شیرہ مل گیا۔ اس سے میں نے یہ حلوہ تیار کر لیا۔
آپ گھر سے نکلے اور سیدھے راشن ڈپو پر گئے اور مودی سے کہا کہ ہمارے ہاں جتنا آٹا ہر روز جاتا ہے، آئندہ اس سے ایک مٹھی بھر کم جائے گا کیونکہ تجربہ نے بتایا ہے کہ ہمارا گزارہ مٹھی بھر کم آٹے میں بھی ہو جاتا ہے۔

یہ تھا معیار ان کا، اپنی ضروریات کے تعین کے لئے۔ اپنی ضروریات کا پورا کرنا تو ایک طرف قرآن کریم نے ان کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ يُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۹۹) وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں خواہ خود تنگی میں گزارہ کیوں نہ کرنا پڑے ——اس (دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دینے) کی کیفیت یہ تھی، کہ ایک دن مصر کا گورنر باب خلافت میں آیا۔ اس نے دیکھا، کہ امیر المؤمنین (حضرت عمرؓ) زیتون کے تیل کے ساتھ جو کی روٹی کھا رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ اب تو مصر سے کافی گیہوں آرہا ہے۔ آپ گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے؟ آپ نے کہا کہ اس وقت مجھے یقین ہے کہ مملکت کے ہر فرد کو جو کی روٹی مل جاتی ہے۔ جس دن تم اس کا یقین دلا دو گے کہ مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے اس دن میں بھی گیہوں کی روٹی کھاؤں گا۔

قرآن کا معاشی نظام، قلب و نظر میں کس قسم کی تبدیلی چاہتا ہے —— اس نکتہ کے متعلق میں تفصیل سے ذرا آگے چل کر بیان کروں گا۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلامی معاشرہ میں ضروریات کا تعین اس طرح ہوتا ہے۔

حاصلِ بحث

اس وقت تک میں نے جو کچھ کہا ہے اس سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ قرآنِ کریم کے معاشی نظام کی رو سے:-

(۱) تمام افرادِ مملکت کو ان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانا، مملکت کا فریضہ —— بلکہ اس کی ہستی کی وجۂ جواز ہے، ان بنیادی ضروریات میں، کھانا، پینا، لباس، مکان، علاج، تعلیم وغیرہ سب شامل ہیں انہیں اس طرح پورا کیا جائے گا کہ (REGIMENTATION) کے بجائے افراد کے

ذاتی ذوق کی تسکین بھی ہوتی رہے۔

(۲) مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری سے اسی صورت میں عہدہ برا ہوسکتی ہے کہ ذرائع رزق اس کی تحویل میں رہیں۔ اس لئے قرآنِ کریم کی رُو سے، ذرائع رزق پر کسی کی انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سب نظامِ معاشرہ کے کنٹرول میں رہیں گے۔ ملکیت اس پر کسی کی بھی نہیں ہوگی۔

(۳) ہر فرد اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرے گا۔ اس سے مستثنیٰ وہی ہوں گے جو کسی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہ رہیں۔ معذور ہوں۔ کام کی تقسیم، افراد کی صلاحیت اور امکانی استعداد کے مطابق ہوگی۔

(۴) اگر ہم قرآن کے اصولوں کو دورِ حاضر کے معاشی تصورات کی روشنی میں سمجھنا چاہیں تو کہا جائیگا۔ کہ اس میں معاوضہ محنت کا ہوگا سرمایہ کا نہیں ہوگا۔ خالی سرمایہ پر ہر قسم کا منافع ممنوع ہوگا۔ فاضلہ دولت کسی کے پاس نہ رہے گی اور جب فاضلہ دولت ہی نہ ہوگی تو روپیہ جمع کرنے یا جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

کمیونزم اور اسلام

میں یہ کہہ رہا ہوں، اور میری نگاہیں اس سوال کو بھانپ رہی ہیں جو آپ کے افقِ قلبی سے اٹھ اٹھ کر آپ کے ذہن کو متاثر کر رہا ہے۔ آپ کے دل میں سوال یہ پیدا ہو رہا ہے کہ یہ تو پھر کمیونزم ہوگیا۔ اس سوال کا جواب ضروری ہے اسے غور سے سنئے:۔

پہلے تو یہ دیکھئے کہ اگر قرآن کا معاشی نظام اور کمیونزم کا معاشی نظام ایک ہی ہیں یا ان دونوں میں مماثلت ہے تو آپ کو خوش ہونا چاہیئے کہ دنیا کی کسی قوم نے اسلام کے معاشی نظام کو اپنا یا ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ نظام چودہ سو سال پہلے دیا تھا اور کمیونزم کا نظام بیسویں صدی کی پیداوار ہے، اس لئے یہی کہا جائے گا کہ کمیونزم نے یہ نظام، اسلام سے لیا ہے نہ یہ کہ اسلام اس نظام کو کمیونزم سے مستعار لے رہا ہے۔

دوسری بات یہ ہے (اور مجھے اس کا اکثر تجربہ ہوتا رہتا ہے) کہ جو لوگ موافقاً یا مخالفاً کہتے ہیں کہ اسلام اور کمیونزم ایک ہی ہے، وہ نہ اسلام کو سمجھتے ہیں نہ کمیونزم کو۔ کمیونزم اس معاشی نظام ہی کا نام نہیں جو روس یا چین میں رائج ہے۔ کمیونزم ایک مخصوص فلسفۂ زندگی یا نظریۂ حیات ہے جس پر

اس کے معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلام بھی کسی معاشی یا سیاسی نظام کا نام نہیں۔ یہ ایک فلسفۂ زندگی اور نظریۂ حیات ہے جس کی بنیادوں پر اس کے تمام نظام استوار ہوتے ہیں۔ کمیونزم کا فلسفۂ زندگی یا نظریۂ حیات، اسلام کے فلسفۂ زندگی یا نظریۂ حیات کی یکسر نقیض ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ وقت نہیں کہ میں آپ کو تفصیل سے بتا سکوں کہ اسلام کا فلسفۂ حیات کیا ہے اور کمیونزم کا فلسفۂ زندگی کیا۔ اس وقت میں ان کے صرف نمایاں اصولوں پر اکتفا کروں گا۔ کمیونزم کا فلسفۂ زندگی یہ ہے کہ

(۱) زندگی صرف یہی طبیعی زندگی ہے جو انسانوں اور حیوانوں دونوں میں مشترک ہے۔ انسان طبیعی قوانین کے ماتحت زندہ رہتا ہے اور انہی کے مطابق اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اور جب یہ مر جاتا ہے تو اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح ایک حیوان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

(۲) دنیا میں ایک نظام وجود میں آتا ہے۔ وہ بڑھتا، پھولتا، پھلتا ہے۔ جب وہ اپنے شباب تک پہنچتا ہے تو اس پر زوال آنا شروع ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک اور نظام برآمد ہونا شروع ہو جاتا ہے جو پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ شروع سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ جب پوچھا جائے کہ وہ کون سی قوت ہے جس سے یہ گردشِ دولابی اس طرح جاری ہے تو اس کے جواب میں کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ سب تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کی رو سے ہوتا ہے۔ اس سے پہلے نظام سرمایہ داری کا دور تھا۔ اب اس کی جگہ (اس کی ضد) اشتراکی نظام کی باری ہے (اس فلسفہ کی رُو سے، اشتراکی نظام کے بعد پھر نظام سرمایہ داری کا دور آ جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی شکل سابقہ نظام سرمایہ داری سے قدرے مختلف ہو گی۔

(۳) اس نظام کی تشکیل اور انسانی زندگی کے دیگر معاملات کے متعلق، ہر فیصلہ مملکت کی مصلحت کے تقاضوں کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں کوئی ایسے مستقل اصول و اقدار نہیں جن کی پابندی ضروری ہو۔

(۴) اس فلسفۂ زندگی کو ماننے والے، نہ خدا کے وجود کے قائل ہوتے ہیں نہ وحی کے، نہ (طبیعی جسم سے ماوراء) انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) کو تسلیم کرتے ہیں نہ حیاتِ آخرت کو۔ ان کے نزدیک

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب موت کیا ہے؟ انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

اس کے برعکس، قرآن کا عطا کردہ فلسفۂ زندگی ہے جس کی رُو سے:۔

(۱) انسانی زندگی، محض طبیعی جسم کی زندگی کا نام نہیں۔ انسان میں طبیعی جسم کے علاوہ، ایک اور شئے بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔

(۲) انسانی زندگی کا مقصد، انسانی ذات کی نشو ونما ہے۔ نشو نمایافتہ ذات، فرد کی موت کے بعد، زندہ رہتی ہے اور زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔

(۳) انسانی ذات کی نشو ونما ان مستقل اقدار کی پابندی سے ہوتی ہے جو انسان کو وحی کی رُو سے عطا ہوئی ہیں۔ ان اقدار میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔

(۴) چونکہ زندگی کی موجودہ سطح پر، انسانی ذات کی نشو ونما جسم کے اندر رہتے ہوئے ہو سکتی ہے اس لئے انسانی جسم کی پرورش نہایت ضروری ہے۔ اس کے لئے ایک ایسا معاشی نظام دیا گیا ہے جس میں جسم انسان کی پرورش اس انداز سے ہوتی چلی جاتی ہے کہ حصولِ رزق کی جدوجہد، انسانی ذات کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتی، بلکہ یہ اس کے نشو ونما کے لئے ممد و معاون ہوتی ہے۔ یوں کہئے کہ یہ نظام، افرادِ معاشرہ کو روٹی کی فکر سے آزاد کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو بلند مقاصد حیات کے حصول کے لئے وقف کر سکیں۔ ان مقاصد کے حصول کی جدّ و جہد سے انسانی ذات کی نشو ونما ہوتی ہے۔

جذبۂ محرکہ

اس مقام پر شاید آپ کہہ دیں کہ کسی فلسفۂ زندگی کا معاشی نظام سے کیا تعلق ہے؟ اس کا تعلق بڑا گہرا ہے۔ یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ انسان کا ہر عمل، اس کے جذبۂ محرکہ کا رہین ہوتا ہے۔ جذبۂ محرکہ کے بغیر عمل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ (۱) انسان کے سامنے ایک مقصد ہوتا ہے (۲) اس مقصد کے حصول کے لئے اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے۔ (۳) جب وہ خواہش، مستحکم اور شدید ہو جاتی ہے تو وہ ارادے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسی کو جذبۂ محرکہ کہتے ہیں۔ اور (۴) جب یہ جذبہ، انسان کی طبیعی توتوں کی رو سے، محسوس شکل میں سامنے آتا ہے تو اسے انسان کا عمل کہا جاتا ہے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ انسان کے عمل کی بنیاد اُس کے پیشِ نظر مقصد پر ہوتی ہے۔ اور

مقصد کا تعین، وہ فلسفۂ حیات کرتا ہے جسے انسان بطور ایمان اپنے لئے اختیار کرتا ہے ـــ "ایمان" کے معنی یہ ہیں کہ انسان اس فلسفۂ زندگی کو اس قدر سچا اور گراں بہا سمجھتا ہے کہ وہ اس کی خاطر ہر قربانی کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔

یہ ہے فلسفۂ حیات (آئیڈیالوجی) کا تعلق معاشی نظام کے ساتھ۔ اب آپ پوچھیں گے کہ کمیونزم کے فلسفۂ حیات میں وہ کیا خرابی ہے جس کی بنا پر اسے انسان کے معاشی نظام کی بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ نکتہ بھی اچھی طرح سمجھنے کے قابل ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ صحیح معاشی نظام کی بنیاد اس اصل الاصول پر ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اپنی رکم از کم) ضروریات کے بعد، جو کچھ فاضلہ ہو اسے دوسروں کی ضروریات کے لئے عام کر دے۔ سوال یہ ہے کہ انسان ایسا کیوں کرے؟ وہ کیوں زیادہ سے زیادہ محنت کر کے کمائے اور اس محنت کے ماحصل کو دوسروں کے لئے عام کر دے؟ دوسرے یہ کہ اگر کسی انسان کو اس کا یقین ہو کہ اس کی بنیادی ضروریات بہر نوع پوری ہوتی رہیں گی تو وہ کام ہی کیوں کرے گا۔ اور اگر وہ کام کرے گا تو بڑی بے دلی سے کرے گا۔ جان مار کر کبھی نہیں کرے گا بالخصوص جبکہ اسے معلوم ہے کہ اس کی زائد از ضروریات کمائی دوسرے لوگ لے جائیں گے ـــ کمیونزم کے فلسفۂ حیات کی رُو سے، اس سوال کا کوئی جواب نہیں[1]۔ آپ زیادہ سے زیادہ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی ہمدردی کا تقاضا ہے کہ جو زیادہ کما سکتا ہے وہ اپنی فاضلہ کمائی ان لوگوں کو دیدے جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے مکتفی نہیں ہو سکتی ـــ لیکن یہ تو خالص جذباتی دلیل ہے۔ اس کا تعلق کمیونزم کے فلسفۂ حیات سے کچھ نہیں۔ کمیونزم کا فلسفۂ حیات اس قسم کا جذبۂ محرکہ پیدا کر ہی نہیں سکتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس فلسفۂ حیات کی وجہ سے کمیونزم کے ساتھ ہوا کیا ہے؟ روس نے مظلوم و مقہور مزدوروں کو آواز دی کہ اٹھو اور ان دولتمندوں کو لوٹ کر انہیں ختم کر دو۔ وہ اٹھے اور انہیں ختم کر دیا۔ انکا یہ عمل انتقام کے جذبہ کی پیداوار تھا۔ جب وہ دولتمند طبقہ باقی نہ رہا۔ تو جذبۂ انتقام بھی باقی نہ رہا۔ اور جب یہ جذبہ ہی باقی نہ رہا تو اس پر اٹھی ہوئی عمارت کس طرح قائم رہتی؟

---

[1] کمیونزم کے فلسفۂ حیات کی رو سے جب یہ مان لیا جائے کہ سابقہ نظامِ سرمایہ داری کی جگہ اب (تاریخی وجوب کی قوت سے) نظامِ اشتراکیت آ کر رہنا ہے اور اسے کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ تو اس نظام کے قیام و استحکام کے لئے کسی کوشش اور سعی و کاوش کی بھی ضرورت نہیں بنتی۔ اس نظام نے تو بہر حال آ کر رہنا ہے خواہ اس کے لئے کچھ کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

نتیجہ یہ کہ لینن کے زمانہ تک تو کمیونزم کا معاشی نظام چلا۔ اس کے بعد، اسٹیلن کو، اسے چلانے کے لئے ڈنڈے کی ضرورت پڑی۔ لیکن ڈنڈے کے زور پر کوئی نظام زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اسٹیلن کے بعد اس کی گاڑی رُک گئی۔ اور روس کو اس نظام میں خاصا رد و بدل کرنا پڑا۔ اس وقت چین اور روس میں جو نزاع چل رہی ہے وہ یہی ہے کہ روس میں یہ نظام اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہا اور چین اس پر مُصر ہے کہ اسے اُس شکل میں باقی رکھا جائے۔ چین میں یہ نظام اپنی اصلی شکل میں اس لئے قائم ہے کہ اس وقت ان کے ہاں، وہ پارٹی موجود ہے جس کے ہاتھوں یہ انقلاب عمل میں آیا تھا۔ اس اعتبار سے، چین اس وقت اس مقام پر ہے جس مقام پر روس، لینن کے زمانہ تک تھا۔ جب چین کی موجودہ نسل کے بعد، اگلی نسل آئے گی تو ان کے سینوں میں بھی وہ جذبہ باقی نہیں رہے گا جو اس نظام کے قیام کے لئے اس قدر قربانی چاہتا ہے۔ اس وقت وہاں بھی پہلے اسٹیلن کے ڈنڈے کی ضرورت پڑے گی۔ اور اس کے بعد اس نظام کی گاڑی آگے چلنے سے رک جائے گی۔

یہ ہے بنیادی نقص، کمیونزم کے فلسفۂ حیات کا جس کی وجہ سے ان کا معاشی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔

اسلام کا فلسفۂ حیات

اس کے برعکس، اسلام کے فلسفۂ حیات کو لیجئے۔ میں نے بتایا ہے کہ اسلام کے فلسفۂ حیات کی رُو سے انسانی زندگی کا مقصود، انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ اور یہ نشوونما ان مستقل اقدار کی پابندی سے ہوسکتی ہے جو انسان کو وحی کی رو سے عطا ہوئی ہیں۔ ان اقدار میں ایک بنیادی قدر یہ ہے کہ اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی ۝ (۹۲/۱۸)۔ جو شخص اپنی کمائی دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دیدیتا ہے، اس کی ذات کی نشوونما ہو جاتی ہے۔ اب آپ دیکھئے کہ قرآن کے فلسفۂ حیات کی رو سے:-

(۱) انسانی زندگی کا مقصد ٹھیرا، انسانی ذات کی نشوونما۔۔ اور

(۲) انسانی ذات کی نشوونما اس طرح ہوتی ہے کہ انسان پوری محنت سے کمائے اور زیادہ سے زیادہ دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بطیب خاطر دیدے۔

جس شخص کا اس فلسفۂ حیات پر ایمان (یقین) ہوگا اس سے کام کرانے کے لئے نہ کسی ڈنڈے کی ضرورت پڑے گی اور نہ ہی اس کی زائد کمائی کو اس سے زبردستی چھیننے کی حاجت۔ وہ خود اپنی ذات کی بھلائی کے لئے زیادہ سے زیادہ محنت کرے گا اور اس میں سے کم از کم اپنے لئے رکھ کر باقی سب، اپنے دل کی کامل رضامندی سے، دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے دیدے گا۔ یہ ہے کمیونزم کے فلسفۂ حیات اور اسلام کے فلسفۂ حیات کا اثر ان کے معاشی نظام پر۔ پروفیسر ہاٹرے (HAWTREY) نے لکھا ہے کہ

> جو چیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے متمیز کرتی ہے یہ ہے کہ اس نظام میں وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جو لوگوں کو کام پر آمادہ کرتا ہے۔

اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ (جزئیات میں اس قدر مماثلت کے باوجود) قرآن کا معاشی نظام کمیونزم کے معاشی نظام سے کس قدر متمیز ہے۔ کمیونزم کے معاشی نظام کے پاس وہ بنیاد نہیں جس پر اس قدر عظیم عمارت قائم رہ سکے۔ اور قرآن کا معاشی نظام ایسی محکم بنیادوں پر استوار ہے کہ لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ وہ کبھی منہدم ہی نہیں ہوسکتی۔ یہی وہ حقیقت کبریٰ ہے جس کی طرف علامہ اقبالؒ نے روس کی توجہ خاص طور پر مبذول کرائی تھی۔ انہوں نے پہلے کمیونزم کے فلسفۂ حیات کا تجزیہ کیا اور بتایا کہ

کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ
لا سلاطیں۔ لا کلیسا۔ لا اِلٰہ

یعنی ان کا جذبۂ محرکہ سارے کا سارا تخریبی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب آپ کسی غلط نظام کہنہ کی جگہ دوسرا نظام لانا چاہیں گے تو آپ کو (سب سے پہلے) اس نظام کو اوپر سے نیچے تک منہدم کرنا پڑے گا۔ یہ عمل یکسر تخریبی ہوگا۔ لیکن یہ اس پروگرام کی پہلی کڑی ہوگی۔ اس تخریب کے بعد تعمیر شروع ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ

در مقام لا نیاساید حیات
سوئے اِلّا می خرامد کائنات

لَا (تخریب) کے بعد اِلّا (تعمیر) لاینفک ہے۔ اگر اِلّا (تعمیر) نہ ہو تو زندگی کو کبھی اطمینان نصیب نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد انہوں نے روس کو مخاطب کر کے کہا کہ

کردۂ کار خداوندان تمام بگذر از لا جانب اِلّا خرام

تونے باطل کے ہر خدا کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔ تُو نے ملوکیت کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیا۔ تُو نے نظامِ سرمایہ دار کا جنازہ نکال دیا۔ تو نے مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ کر دیا — تو نے یہ کچھ تو کر دیا — اور یہ بہت بڑا کارنامہ ہے جو تیرے ہاتھوں سر انجام پایا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے بعد، وہ مثبت بنیاد کونسی ہے جس پہ تو اپنے نظامِ نو کی عمارت استوار کرنا چاہتا ہے۔

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے
جستہ ادرا اساسِ محکمے!

یہ اساسِ محکم، جو نظامِ سرمایہ داری کی شکست و ریخت کے بعد، ایک صحیح معاشی نظام کی بنیاد بن سکنے کے قابل ہے، صرف قرآن کے عطا کردہ فلسفۂ حیات سے مل سکتی ہے۔ اسی لئے انہوں نے ۱۹۳۱ء میں، سر فرانسس ینگ کے نام، اپنے خط میں لکھا تھا کہ

(BOLSHEVISM PLUS GOD IS ALMOST IDENTICAL WITH ISLAM.)

اگر بالشوزم کے ساتھ خدا کو شامل کر دیا جائے تو وہ اسلام کے مماثل ہو جاتا ہے۔ "خدا کو شامل کرنے" سے ان کی مراد یہی تھی کہ اس نظام کو خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار کی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ انہیں امید تھی کہ روس جب اپنے جذباتی بحران سے نکل جائے گا تو اس "اساسِ محکم" کی تلاش ضرور کرے گا۔ لیکن روس نے اپنا مقام ہی چھوڑ دیا۔ اب وہی پوزیشن چین کی ہے۔ اس نے بھی ملوکیت۔ سرمایہ داری۔ اور مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ لیکن اس حصہ لا کے بعد، حصہ اِلّا اس کے پاس بھی نہیں۔ اے کاش! آج کوئی اقبالؔ، چین کو بتا سکے کہ وہ اساسِ محکم کونسی ہے جس پر اس کے نظام کی عمارت استوار ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا، تو ظاہر ہے کہ جو کچھ روس کے ساتھ ہوا ہے۔ وہی کچھ (ایک نسل کے بعد) چین کے ساتھ بھی ہوگا۔ اور اگر ایسا ہوا تو یہ دنیا کی انتہائی بدقسمتی ہوگی۔ دنیا کی قسمت کے ستارے تو قرآن کے سراجاً منیراً ہی سے جگمگا سکتے ہیں۔

ایک اعتراض

نظامِ سرمایہ داری کے حامیوں کی طرف سے اعتراض کیا جاتا ہے (اور یہی اعتراض اس نظام کے حق

میں بطور دلیلِ محکم پیش کیا جاتا ہے) کہ ذاتی مفاد ہی وہ جذبۂ محرکہ ہے جس کے ماتحت انسان محنت و مشقت کرتا ہے اگر اس جذبہ کو نکال دیا جائے تو کوئی شخص جان مار کر محنت نہیں کرتا۔ اس اعتراض کو پیش کیا جاتا ہے اور پھر روس کی مثال دے کر کہا جاتا ہے کہ دیکھ لیجئے! اس جذبہ کو نکال دینے سے اشتراکی نظام کس طرح ناکام رہ گیا۔

یہ اعتراض کمیونزم کے فلسفۂ حیات کے پیشِ نظر واقعی بڑا وقیع ہے اور جیسا کہ میں نے ابھی ابھی بتایا ہے۔ روس کے ناکام تجربہ نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ اس فلسفہ کی رُو سے انسان کے لئے کام کرنے کا جذبۂ محرکہ کوئی نہیں رہتا۔ لیکن قرآن کریم کی آئیڈیا لوجی کے مطابق اس اعتراض کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہتی ــــ یہ درست ہے کہ انسان اپنے ذاتی مفاد کو کبھی نہیں چھوڑتا۔ اور ذاتی مفاد ہی کام کے لئے جذبۂ محرکہ پیدا کرتا ہے۔ لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ انسان بڑے فائدے کی خاطر چھوٹے فائدے کو قربان کر دیتا ہے۔ (مثلاً) انسان مال سے محبت رکھتا ہے اسے محنت سے کماتا اور بڑی احتیاط سے جمع کرتا ہے، لیکن جب وہ بیمار ہو جاتا ہے تو اپنی جان بچانے کے لئے بے دریغ مال خرچ کر دیتا ہے (وہ ایسا نہیں کرتا اس پر سب لعن طعن کرتے ہیں) ۔ یہ اس لئے کہ اس کے نزدیک، اس کی جان کی قیمت مال کی قیمت سے زیادہ ہے۔ وہ زیادہ قیمتی متاع کو بچانے کی خاطر، کم قیمت کی متاع صرف کر دیتا ہے۔

قرآنی آئیڈیا لوجی کی رُو سے، مال کی بھی ایک قیمت ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ قیمت انسانی ذات کی ہے۔ لہٰذا، جب وہ اپنی ذات کے استحکام کی خاطر، مال دوسروں کو دیتا ہے تو وہ اپنے بڑے فائدے کی خاطر چھوٹے فائدے کو قربان کر دیتا ہے اور اسے نفع کا سودا سمجھتا ہے۔ لہٰذا، اس فلسفۂ حیات کے مطابق۔ انسان اپنے فائدے کو چھوڑتا نہیں بلکہ کم فائدے کو چھوڑ کر، زیادہ فائدے کی طرف لپکتا ہے۔ اس لئے نظامِ سرمایہ داری کے حامیوں کی طرف سے جو اعتراض کیا جاتا ہے، اس کا جواب کمیونزم کے فلسفۂ حیات کی رو سے تو واقعی نہیں مل سکتا۔ لیکن قرآنی نظریۂ زندگی کی رُو سے اس اعتراض کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہتی۔ اور اس کا اعتراف تو خود اس نظام کے علمبردار بھی کرتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کے مجسمے نصب اور ان کی یادگاریں قائم کرتے ہیں جنہوں نے بڑی محنت سے مال کمایا اور اسے نوعِ انسان کی بہبود کی خاطر وقف کر دیا۔ دنیا میں آج تک کسی شخص یا کسی قوم نے کسی ایسے آدمی کی یادگار قائم نہیں کی جس نے

کروڑوں روپے کمائے لیکن اس دولت کو اپنے یا اپنی اولاد کے لئے مخصوص رکھا اور اسی حالت میں مرگیا۔ دنیا نے ایسے افراد پر ہمیشہ لعنت بھیجی ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے بقا اور دوام کا اصول یہ ہے کہ

مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷)

دنیا میں باقی وہی رہتا ہے جو عالمگیر انسانیت کیلئے منفعت بخش ہو۔

دیگر اقوام میں اس قسم کے افراد مستثنیات میں سے ہوتے ہیں، قرآن کریم ہر مومن کو اسی خصوصیت کا حامل بناتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک سوسائٹی کی تشکیل کرتا ہے جس کی ممبرشپ (رکنیت) کی اولین شرط وہ معاہدہ ہے جس کا ذکر میں نے شروع میں کیا ہے یعنی — إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹/۱۱۱)۔ وہ عہد کرتا ہے کہ میں نے اپنا مال حتیٰ کہ اپنی جان اس نظام کے ہاتھوں فروخت کر دی ہے جو نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے قوانینِ خداوندی کے مطابق قائم ہوا ہے — اس معاہدہ کے بعد ایک شخص، اسلامک سوسائٹی کا ممبر بنتا ہے۔ اسے مسلمان کہتے ہیں لہٰذا مسلمان کی تو کوئی شے بھی ذاتی ملکیت کی نہیں ہوتی۔ وہ دن رات محنت کرتا ہے اور اس کے ماحصل کو اس نظامِ خداوندی کی تحویل میں دیدیتا ہے۔ اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے اور عند الضرورت اپنی جان تک بھی اس مقصدِ عظیم کی خاطر قربان کر دیتا ہے — يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ (۹/۱۱۱)۔ وہ "خدا کی راہ" میں جنگ کرنے کی خاطر سربکف میدان میں نکل آتے ہیں۔ پھر یا تو فاتح و منصور واپس آتے ہیں اور یا میدان میں سر دیدیتے ہیں۔ یوں وہ ایک بڑے فائدے کی خاطر کم فائدے کو قربان کر دیتے ہیں۔ یہ ہے وہ سوسائٹی جو دنیا میں اس معاشی نظام کو قائم کرتی ہے جس کی تفاصیل ہم نے (قرآن کریم کی آیات کی رُو سے) آپ کے سامنے پیش کی ہیں۔ اس قسم کا نظام، یہی سوسائٹی قائم کر سکتی ہے۔ اس سوسائٹی نے عہدِ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ میں اس نظام کو قائم کر کے دکھا دیا۔

اور یہی ہے وہ نظام جو دنیا میں آخر الامر قائم ہو کر رہے گا خواہ ملوکیت۔ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کی قوتیں اس کے راستے میں کتنی ہی رکاوٹیں کیوں نہ پیدا کریں۔ قرآن کریم کو قیامت تک محفوظ ہی اس لئے رکھا گیا ہے کہ اسے نوعِ انسان کا عالمگیر ضابطہ حیات بننا ہے۔ جس قوم نے بھی اسے اپنا ضابطۂ حیات بنا لیا، اس کے ہاتھوں یہ نظام قائم ہوگا۔

واضح رہے کہ قرآن کریم اس نظام کے قیام کے لئے ذرائع بھی کوئی ایسے استعمال نہیں کرنے دیتا

جو مستقل اقدار کے خلاف ہوں۔ اس کے نزدیک جس طرح غلط راستہ صحیح منزل تک نہیں پہنچا سکتا اسی طرح غلط ذریعہ سے صحیح مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ ذریعہ اور مقصد میں فرق ہی نہیں کرتا۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے یوگوسلاویہ کے مشہور اشتراکی، ڈاکٹر جیلاس نے (جسے اسی اختلاف کی بنا پر وہاں کے اشتراکیوں نے قید کر دیا تھا) ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

> تاریخ میں کسی ایسے مثالی معاشرہ کی مثال نہیں ملتی جو غیر مثالی اور غیر فطری طریقوں سے حاصل کیا گیا ہو، بالکل ایسے ہی جیسے غلاموں نے کبھی کوئی آزاد معاشرہ قائم نہیں کیا۔ نصب العین کی عظمت اور حقیقت کا اظہار صرف اس سے ہوتا ہے کہ اس کے حصول کے لئے طریقے کیا اختیار کئے گئے ہیں۔

آپ قرآن کریم پر غور کیجئے۔ وہ "صحیح راستہ" کا سراغ دیتا ہے۔ وہ صراطِ مستقیم کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ ہدایت یعنی "راہ نمائی" عطا کرتا ہے۔ وہ "سبیل اللہ" (خدا کی طرف لیجانے والے راستہ) کو اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ کہ جس نے صحیح راستہ اختیار کر لیا وہ صحیح منزل تک ضرور پہنچ جائے گا لیکن جب راستہ ہی غلط ہو تو پھر صحیح منزل کیسے سامنے آئے گی؟

یہ ہے عزیزانِ من! میری بصیرت کے مطابق قرآن کریم کا معاشی نظام۔

سوالات

(خطاب کے بعد سامعین کی طرف سے بعض نکات کی وضاحت کے لئے کچھ سوالات کئے گئے۔ ان میں سے دو ایک سوالات کے جواب تو اسی وقت دیدیئے گئے لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے باقی دعدہ فردا پر رکھ دیئے گئے۔ ان میں سے اہم سوالات اور ان کے جوابات درج ذیل ہیں۔ ان سے نفس مضمون کے ضروری مقامات کی تشریح ہو جاتی ہے)۔

پہلا سوال —— اقوامِ مغرب

آپ نے کہا ہے کہ جس کی اس دنیا کی زندگی ذلت اور پستی کی ہوگی اس کی عاقبت بھی خراب ہوگی۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ جس کی اس دنیا کی زندگی خوش حالی کی ہوگی وہ عاقبت میں بھی سرخرو ہوگا۔ اقوامِ مغرب کی اس دنیا کی زندگی بڑی خوش حالی کی زندگی ہے۔ کیا وہ آخرت میں جنت میں جائیں گی ؟

جواب

میرے عزیز! میں نے جو کچھ کہا ہے اور آپ نے اس سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے، اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ میں کہتا ہوں کہ جو طالب العلم اپنی کلاس (ATTEND) نہیں کرے گا وہ امتحان میں کامیاب نہیں ہوگا۔ اس پر آپ کہتے ہیں کہ [اس کے یہ معنی ہوئے کہ] جو طالب علم کلاس میں حاضر رہے گا وہ امتحان میں کامیاب ہو جائے گا ـــــ آپ نے غور کیا کہ آپ کا یہ نتیجہ کس قدر غلط ہے ـــــ جو طالب علم کلاس میں حاضر ہوگا اسے امتحان میں کامیابی کے لئے کچھ اور بھی کرنا ہوگا ـــــ جو کچھ پڑھایا جائے اسے غور و فکر سے سننا اور سمجھنا۔ اسے یاد رکھنا۔ اس کے اظہار کی قابلیت پیدا کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔ جو طالب العلم ان تمام شرائط کو پورا کرے گا وہ امتحان میں کامیاب ہوگا، نہ کہ وہ طالب العلم جو کلاس میں حاضر تو رہے لیکن دیگر شرائط کو پورا نہ کرے۔

دین وہ پروگرام دیتا ہے جس سے انسان کی اس دنیا کی زندگی کامیابی و کامرانی کی زندگی ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی سرفرازی و سرخروئی کی زندگی۔ اگر ایک فقرہ میں کہنا چاہیں تو اس کا پروگرام یہ ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے سے اس دنیا کی زندگی، مرفہ الحالی کی زندگی ہو جاتی ہے۔ اور ان قوتوں کے ماحصل کو مستقل اقدار کے مطابق صرف کرنے سے عاقبت سنور جاتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو دنیا میں تین قسم کی قومیں ملیں گی۔

(۱) وہ قوم جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف کرے۔ اس قوم کی اس دنیا کی زندگی بھی درخشندہ ہوگی اور عاقبت بھی تابندہ۔ اسے جماعتِ مومنین کہا جاتا ہے۔

(۲) وہ قوم جو فطرت کی قوتوں کو تو مسخر کر لے لیکن انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف نہ کرے۔ اس قوم کو اس دنیا میں مرفہ الحالی نصیب ہو جائے گی لیکن اس کی عاقبت تاریک رہے گی۔ اور

(۳) وہ قوم جو فطرت کی قوتوں کو مسخر نہیں کرتی اس کی اس دنیا کی زندگی پستی اور ذلت کی ہوگی۔ اور جب وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر ہی نہیں کرتی۔ تو ان قوتوں کو مستقل اقدار کے مطابق صرف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ اس لئے اس قوم کا آخرت کی زندگی میں کیا حصہ ہو سکتا ہے ؟ یہ قوم کونسی ہے؟

اس کے متعلق آپ خود ہی اندازہ کر لیجئے ۔۔۔

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی،

دوسرا سوال ۔۔۔ مغرب کے خدا پرست

مغرب کی جمہوری قومیں خدا پر ایمان رکھتی ہیں۔ اور روس اور چین کے کمیونسٹ خدا کے منکر (دھریئے) ہیں۔ آپ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے ان دونوں میں سے کسے ترجیح دیں گے۔

جواب

جہاں تک قرآنی نقطۂ نگاہ سے خدا کو ماننے کا تعلق ہے، مغرب کے (مزعومہ) خدا پرست اور روس اور چین کے دھریئے۔ دونوں ایک جیسے ہیں۔ قرآنِ کریم کی رو سے خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اس کی متعین کردہ اقدار، اصول و احکام کو اپنے معاملات کے فیصلوں کا معیار اور حکم بنایا جائے۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ اس کے نزدیک خدا پرست نہیں کافر ہے۔ اس کا واضح اعلان ہے کہ

وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو کتاب اللہ کے مطابق (زندگی کے معاملات کے) فیصلے نہیں کرتا۔ تو یہی لوگ کافر ہیں۔

لہذا، قرآنی فلسفۂ زندگی کے مطابق، مغرب کی قوموں اور روس و چین میں کوئی فرق نہیں۔ البتہ جہاں تک ان کے معاشی نظام کا تعلق ہے، مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام، قرآن کے معاشی نظام کی یکسر نقیض ہے اور اشتراکی نظام قرآن کے معاشی نظام سے ملتا جلتا ہے ۔۔۔ اشتراکی نظام میں اگر (بقول اقبالؒ) خدا شامل کر لیا جائے تو اسلامی نظام ہو سکتا ہے۔ لیکن مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام میں خدا کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں۔

یہ انسانیت کی بدقسمتی تھی کہ کارل مارکس کے سامنے جو خدا آیا وہ مذہبی پیشوائیت کا تراشیدہ خدا تھا۔ اس خدا کا تصور (آقائی نظامِ ملوکیت و سرمایہ داری کا پیدا کردہ اور عوام کے لئے "افیون" تھا۔ وہ اس خدا سے انکار نہ کرتا تو کیا کرتا؟ اگر اس کے سامنے کہیں قرآن کے پیش کردہ خدا کا تصور ہوتا تو وہ اسے اپنا ہادی و مرشد مانتا۔ مارکس زیادہ سے زیادہ یہاں تک پہنچا تھا کہ ذرائع پیداوار کسی کی انفرادی ملکیت نہیں ہو سکتے۔ اور قرآن کے خدا کا اعلان ہے کہ کائنات کی کسی شے پر بھی کسی انسان کی

ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ سوچئے کہ اس خدا کو ماننے والے سے بڑا "کمیونسٹ" اور کون ہو سکتا ہے۔
کارل مارکس درحقیقت اس مذہبی پیشوائیت کا انکار کرنا چاہتا تھا جس کے ہاتھوں انسانیت اس قدر زار و نالاں تھی۔ لیکن چونکہ مذہبی پیشوائیت اپنے آپ کو خدا کا نمائندہ قرار دیتی تھی اس لئے اُسے اس خدا سے بھی انکار کرنا پڑا۔ اس کے دلِ دردمند کی یہی وہ ذہنی لغزش تھی جس کی بنا پر اقبالؔ اسے کبھی "پیغمبرِ بے جبرئیل" کہتا ہے اور کبھی "قلب او مومن دماغش کافر است" سے تعبیر کرتا ہے (جاوید نامہ صفحہ ۹۲)۔ کبھی اسے "کلیم بے تجلی" کہتا ہے اور کبھی "مسیح بے صلیب" ــــ اور ــــ "نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب" سے اس کے نظام کی تعریف اور اس کے فلسفہ کی تردید کرتا ہے۔ (ارمغان حجاز صفحہ ۲۱۹)۔ مغرب کی سرمایہ پرست قوموں نے مارکس کی اس اجتہادی غلطی سے فائدہ اٹھایا اور "دنیا کے خدا پرستو! اکٹھے ہو جاؤ" کے نعرے سے اشتراکیت کی مخالفت کے لئے ایک "مقدس متحدہ محاذ" قائم کر لیا اور اس کا ہراول دستہ خود مسلمانوں کو بنایا ــــ ان مسلمانوں کو جن کا دین، سرمایہ پرستی کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ یہ ہے مغرب کی وہ ابلیسی سیاست جو خدا کا نقاب اوڑھ کر وجہ فریبِ عالم بن رہی ہے اور بھولا بھالا (بلکہ یوں کہئے کہ خود فراموش) مسلمان اس کا سب سے پہلا شکار ہو رہا ہے۔

تیسرا سوال ــــ مسلمانوں کے ہاں یہ تبدیلی کیسے پیدا ہوئی

آپ نے کہا ہے کہ عہدِ نبی کریمؐ اور صحابہؓ میں قرآن کا یہ معاشی نظام قائم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ان کی گاڑی اس پٹری سے ہٹ گئی اور سرمایہ دارانہ نظام ان کے ہاں در آیا۔ یہ کیسے ہوا اور کب ہوا؟

جواب

یہ اس وقت ہوا جب مسلمانوں میں ملوکیت آ گئی ــــ واضح رہے کہ ملوکیت کے معنی وراثتی بادشاہت ہی نہیں۔ اسلام کی رُو سے کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ حکومت کا حق صرف خدا کو ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی ایک انسان یا انسانوں کی جماعت کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ اپنی طرف سے قوانین مرتب کر کے ان کی اطاعت دوسروں سے کرائے۔ انسانوں کی اطاعت کے لئے قوانین داقدار خدا نے مقرر کر دی ہیں۔ حکومت اس ایجنسی کا نام ہے جو ان قوانین کو نافذ

میں نافذ کرتی ہے۔ اس ایجنسی کو "خلافت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ملوکیت اس انداز حکومت کو کہتے ہیں جس میں انسانوں کو قانون سازی کا حق حاصل ہوتا ہے ۔۔ اسلام نے ملوکیت کو مٹایا اور اس کی جگہ خدا کی حکومت کو قائم کیا تھا۔ خدا کی حکومت میں نظامِ سرمایہ داری باقی نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے تو ابوجہل نے اپنے خداؤں کے ہاں فریاد کرتے ہوئے، کہا تھا کہ ۔۔۔ خوب می دانم کہ سلماں مزدکی است ۔۔۔ (جاوید نامہ) جب مسلمانوں میں ملوکیت آگئی تو اس کا فطری نتیجہ سرمایہ داری اور جاگیرداری کا نظام تھا۔ ملوکیت، عالمگیر انسانیت کے مفاد کا نہیں بلکہ ایک خاص گروہ کے مفاد کا تحفظ کرتی ہے ۔۔ لیکن اتنی بڑی تبدیلی "خدائی سند" کے بغیر کیسے پیدا کی جاسکتی تھی؟۔ یہ خدائی سند مذہبی پیشوائیت نے اپنی خود تراشیدہ شریعت کی رو سے بہم پہنچادی ۔۔ ملوکیت۔ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کا گٹھ جوڑ شروع سے چلا آرہا ہے۔ اسی لئے تو قرآن کریم نے فرعون کے ساتھ قارون اور ہامان کو بھی ایک ہی صف میں کھڑا کیا ہے ۔۔ وہ دن اور آج کا دن ۔ ملوکیت سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت، اسلام کے اقنوم ثلاثہ بنے ہوئے ہیں۔ یہی وہ نظام ہے جو آج اسلام کے نام سے پیش کیا جارہا ہے۔ قرآن کریم نے بنصِ صریح دولت جمع کرنے کو جہنم کا عذاب بتایا۔ رسول اللہؐ نے تمام عمر ایک پائی بھی جمع نہ کی۔ حتیٰ کہ وفات کے وقت حضورؐ کو معلوم ہوا کہ گھر میں کہیں سے سات دینار آئے ہیں۔ "آپ نے انہیں اسی وقت بیت المال بھجوادیا" یہ فرماتے ہوئے کہ میں خدا کے سامنے اس حالت میں نہیں جانا چاہتا کہ میرے گھر میں چاندی اور سونے کے ٹکڑے ہوں ۔۔ یہ تھا وہ اسلام جسے خدا نے انسانوں کے لئے تجویز کیا اور جس پر اس کے رسولؐ نے عمل کر کے دکھایا۔ لیکن اب ان حضرات کی طرف سے جو اسلام پیش کیا جاتا ہے اس کا فیصلہ یہ ہے کہ

> جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس کے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد و نہایت رکھی جاسکتی ہے۔ روپیہ۔ پیسہ۔ جانور۔ استعمالی اشیاء مکانات۔ سواری۔ غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں[1]۔

حالت اب یہ ہے کہ یہ حضرات اسے تو بہ شد و مد بیان کریں گے کہ پاجامہ ٹخنوں سے نیچے رکھنا خلافِ سنت ہے لیکن یہ کبھی نہیں بتائیں گے کہ گھر میں چاندی سونے کے سکے جمع رکھنا خلافِ حکمِ خداوندی اور خلافِ

---

[1] "مسئلہ ملکیت زمین" از سید ابوالاعلیٰ مودودی (صفحہ ۵۰)

سنت رسول اللہؐ ہے۔ یہ اڑھائی فی صد کے حساب سے زکوٰۃ نکال دینے کے بعد باقی کروڑوں روپوں کو پاک اور صاف قرار دیدیں گے لیکن اسے کبھی نہیں بیان کریں گے کہ رسول اللہؐ نے ساری عمر زکوٰۃ ادا نہیں کی کیونکہ آپ نے کبھی روپیہ جمع ہی نہیں کیا تھا۔ یہ حضرات اس اہم مسئلہ پر تو گھنٹوں بحث کریں گے کہ یتیم پوتے کو اس کے دادا کے ترکہ سے حصہ نہیں مل سکتا۔ (کیونکہ وہ یتیم ہے!) لیکن یہ کبھی نہیں بتائیں گے کہ حضور نبی اکرمؐ نے خود کوئی ترکہ کیوں نہیں چھوڑا تھا اور جو اشیائے مستعملہ چھوڑی تھیں اس کے متعلق یہ کیوں فرمایا تھا کہ یہ کسی کو وراثت میں نہیں مل سکتیں۔ اس کے لئے یہ حضرات یہ کہہ دیتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ ہم گروہ انبیاءؑ کا ترکہ وراثت میں تقسیم نہیں ہو سکتا۔ گویا ان حضرات کے نزدیک حضرات انبیائے کرامؑ کے لئے اسلام کوئی اور ہوتا تھا اور ان کی امت کے لئے کوئی اور[1]۔ (یا للعجب!) یہ حضرات سرقہ (چوری) کے نصاب کے متعلق تو پہروں گفتگو فرمائیں گے لیکن یہ نہیں بتائیں گے کہ حضرت عمرؓ نے ان غلاموں کو چوری کا مجرم کیوں قرار نہیں دیا تھا جنہوں نے بھوک سے مجبور ہو کر کھانے کی چیزوں کی چوری کی تھی اور ان کی جگہ ان کے مالک کو یہ کہہ کر سزا دی تھی کہ تم نے انہیں بھوکا کیوں رکھا جس کی وجہ سے یہ چوری کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ اس لئے نہیں بتائیں گے کہ اس سے ان کے پیش کردہ معاشی نظام (سرمایہ داری) کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے آگرتی ہے۔

وہ تھا اسلام جسے خدا نے انسانوں کے لئے تجویز کیا اور جس پر اس کے رسولؐ اور حضورؐ کے متبعین نے عمل کر کے دکھایا۔ اور یہ ہے وہ اسلام جو ہمارے دورِ ملوکیت کا پیدا کردہ ہے۔

چوتھا سوال ــــ ترکہ - صدقہ - زکوٰۃ کے احکام

لیکن قرآن مجید میں صدقہ - وراثت - زکوٰۃ وغیرہ کے احکام بھی تو ہیں۔ اگر روپیہ جمع نہیں کیا جا سکتا تو ان احکام کے معنی کیا ہوں گے۔

جواب

جس طرح اسلامی مملکت کا قیام ایک دن میں عمل میں نہیں آسکتا تھا۔ یہ بتدریج عمل میں آئی تھی

---

[1] قرآن کریم میں بعض احکام کے متعلق یہ آیا ہے کہ وہ رسول اللہؐ کی ذات کے لئے مخصوص تھے (جیسے حضورؐ کی ازواج مطہرات کے ساتھ کسی اور کا نکاح نہیں ہو سکتا تھا) لیکن معاشی نظام کے سلسلہ میں کوئی ایسا حکم نہیں ہے جسے حضورؐ کی ذات کے لئے مخصوص کیا گیا ہو۔

اسی طرح، اس کا معاشی نظام بھی شب بھر وجود میں نہیں آسکتا تھا۔ اسے بھی بتدریج ہی عمل میں لایا جاسکتا تھا۔ قرآنِ کریم نے اسی تدریجی پروگرام کے مطابق اپنے احکام دیئے ہیں۔ صدقہ۔ وراثت وغیرہ احکام اُس دَور سے متعلق ہیں جب یہ نظام ہنوز اپنی آخری شکل میں قائم نہیں ہوا تھا لیکن اسے بتدریج عمل میں لایا جارہا تھا۔ ان احکام پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان کی رُو سے بھی ہر قدم اس منزل کی طرف اٹھتا ہے جو قرآنی نظام کا منتہیٰ ہے۔ یعنی ان کی رُو سے دولت، افراد کے ہاں مرتکز رہنے کے بجائے معاشرہ میں بکھرتی جاتی ہے۔ عبوری دور میں یہ احکام نافذ العمل رہے تاآنکہ یہ نظام قائم ہو گیا جس میں یہ کہدیا گیا کہ۔ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) یہ پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال دوسروں کی ضروریات کے لئے دیدیں ان سے کہدو کہ جس قدر ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔ واضح رہے کہ رسولؐ اپنی امت کو بتدریج اس منتہیٰ کی طرف لاتا ہے لیکن اس کی اپنی زندگی شروع ہی سے اس آئیڈیل (منتہیٰ) کے مطابق ہوتی ہے تاکہ وہ لوگوں کے لئے نمونہ بنے۔ یہ وجہ ہے کہ حضورؐ نے ساری عمر نہ مال جمع کیا۔ نہ کوئی جائیداد بنائی۔ اور اس لئے نہ ہی کچھ ترکہ میں چھوڑا (بجز چند مستعملہ اشیاء کے) اور ان کے متعلق کہدیا کہ وہ وراثت میں تقسیم نہیں ہوں گی۔ حضورؐ کا یہ فیصلہ اپنی ذات (یا عرفِ انبیاء کرامؑ) کے لئے نہیں تھا۔ یہ قرآن کے پیش کردہ مثالی معاشرہ کا آئینہ دار تھا جس تک دوسروں کو بتدریج پہنچنا تھا۔

جب ملوکیت آگئی تو اسلام کا معاشی نظام نگاہوں سے اوجھل کر دیا گیا اور یہ عبوری دور کے احکام، مستقل احکام بنا دیئے گئے۔ اب یہی احکام ہماری شریعت ہیں ۔۔ یعنی سفر بلا منزل۔

اساسِ محکم

(شائع شدہ ستمبر ۱۹۶۶ء)

کمیونزم اور اسلام سے متعلق عنوان میں ہم نے کہا یہ تھا کہ روس میں کمیونزم اس لئے ناکام ہوگئی ہے کہ ان کے پاس وہ اساسِ محکم نہیں جس پر یہ عمارت استوار کی گئی تھی۔ اور چونکہ چین کے ہاں بھی اس اساس کا فقدان ہے اس لئے وہاں بھی یہ کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ اس سلسلے میں ہم سے پوچھا گیا ہے کہ وہ اساسِ محکم کیا ہے جس کی عدم موجودگی سے ان کا اس قدر انقلابی پروگرام کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ اور اسلام وہ کونسی اساس مہیا کرتا ہے جس سے اس کا عالمگیر معاشی پروگرام کامیاب ہو سکتا ہے؟ یہ سوال بڑا اہم اور ضروری ہے۔ لیکن ہم نے اس عنوان میں اس کی وضاحت اس لئے نہیں کی تھی کہ اس موضوع پر طلوعِ اسلام میں بڑی شرح و بسط سے بہ اصرار و تکرار لکھا جا چکا ہے۔ پرویز صاحب کے مقالات، خطبات اور تشریحات، اور اس موضوع پر ان کی مستقل تصنیف "نظامِ ربوبیت" میں اس سوال کو بڑی وضاحت سے سامنے لایا گیا ہے۔ لیکن چونکہ طلوعِ اسلام کے قارئین کا حلقہ دن بدن وسیع ہو رہا ہے اس لئے ان نوواردان کی طرف سے اس قسم کے استفسارات فطری اور لابدی ہیں۔ بنا بریں ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ اس نکتہ کی مزید وضاحت کر دی جائے۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ مسئلہ زیرِ نظر ہے کیا؟ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کمیونزم محض ایک معاشی نظام کا نام ہے، جسے کبھی سوشلزم اور کبھی کمیونزم کہا جاتا ہے۔ یہ خیال غلط ہے۔ مارکس نے ایک فلسفۂ زندگی دیا تھا جس پر ایک معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ یہ معاشی نظام اپنی ابتدائی

اسٹیج میں سوشلزم کہلاتا ہے اور اس کی انتہائی شکل کا نام کمیونزم ہے۔ سوشلزم اور کمیونزم میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ وسائلِ پیداوار افراد کی ملکیت میں رہنے کے بجائے مملکت کی ملکیت میں رہتے ہیں جو مزدوروں اور کاشتکاروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان میں فرق یہ ہے کہ سوشلزم میں:

ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جاتا ہے اور کام کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔

اور کمیونزم میں

ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جاتا ہے اور اس کی ضروریات کے مطابق دیا جاتا ہے۔

جہاں تک سوشلزم کا تعلق ہے، اس میں بنیادی سوال یہ سامنے آتا ہے کہ "کام کا معاوضہ متعین کرنے کا معیار کیا ہے؟ سرمایہ دار ملکوں میں بھی مزدور کو اس کے کام کی اجرت ملتی ہے اور انجینئر کو اس کے کام کی اُجرت۔ یہی کچھ سوشلزم میں ہو رہا ہے پھر سوشلزم میں جو کچھ کسی کی ضروریات سے زاید ہوتا ہے وہ اس کی ملکیت میں رہتا ہے۔ یہی کیفیت سرمایہ داری نظام میں ہوتی ہے۔ سوشلسٹ نظام میں البتہ اس فاضلہ دولت سے جائیدادیں نہیں کھڑی کی جا سکتیں، روزمرہ کی اشیائے مستعملہ خریدی جا سکتی ہیں۔ نظامِ سرمایہ داری کے حامیوں کا اس کے خلاف اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی کو جائیدادیں بنانے (یعنی وسائلِ پیداوار کو اپنی ملکیت میں لینے) کی اجازت نہ ہو تو اس کے لئے کام کرنے کا جذبۂ محرکہ (INCENTIVE) نہیں رہتا۔ یہ اعتراض کمیونزم کے نظام میں اور بھی شدید ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں کام ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق لیا جاتا ہے، لیکن دیا جاتا ہے انہیں ان کی ضروریات کے بقدر۔ ظاہر ہے کہ ـــــ اس معاشرہ میں کام کرنے والا طبقہ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائے گا ـــــ ایک وہ جن کے کام کا ماحصل ان کی ضروریات سے زاید ہو ـــــ اور دوسرا وہ جن کی محنت کی پیداوار ان کی ضروریات پوری نہ کر سکیں۔

کمیونزم کے نظام کی رو سے، اوّل الذکر طبقہ کی زائد از ضروریات کمائی ثانی الذکر طبقہ کی ضروریات پوری کرنے کے کام میں لائی جائے گی اور یوں معاشرہ کی ناہمواریاں دور کر دی جائیں گی۔ اس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ (اوّل طبقہ کے افراد میں سے) جب یہ معلوم ہو کہ وہ خواہ کتنا ہی کام کیوں نہ کرے اسے اس کی ضروریات سے زاید کچھ نہیں مل سکے گا ـــــ اور ثانی الذکر طبقہ کو اس کا علم ہو کہ وہ کتنی ہی کم محنت

کیوں نہ کریں، ان کی ضروریات بہرحال پوری ہوتی رہیں گی، تو وہ جذبۂ محرکہ کیا ہوگا جس سے یہ سب جان مار کر پوری پوری محنت کریں گے۔ یہ ہے اصل سوال! یہ ہے وہ نقطۂ ماسکہ جس کے گرد اس نظام کی پوری مشینری گردش کرتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جذبۂ محرکہ اس فلسفۂ حیات، اس نظریۂ زندگی سے پیدا ہوتا ہے جس پر انسان کو ایمان ہو۔ نظامِ سرمایہ داری میں نظریۂ زندگی یہ ہے کہ تم جس قدر کمائی کرو وہ سب کی سب تمہاری ملکیت ہوگی۔ تمہیں اس سے غرض نہیں کہ معاشرہ میں دوسروں پر کیا گزرتی ہے۔ یہ نظریہ وہ جذبۂ محرکہ پیدا کرتا ہے جس سے انسان زیادہ سے زیادہ محنت کرتا اور سب کچھ اپنے لئے رکھتا ہے۔ لیکن کمیونزم کا نظام نصب العین یہ پیش کرتا ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ محنت کرو لیکن تمہیں ملے گا اتنا ہی جس سے تمہاری ضروریات پوری ہو سکیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ جو فلسفۂ حیات وہ پیش کرتا ہے وہ انسان کے اندر یہ جذبہ پیدا کر سکتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرکے اپنی ضروریات سے زائد سب کا سب، دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دیدے؟

کمیونزم کا فلسفۂ حیات خالص مادی (MATERIALISTIC) ہے اس فلسفۂ زندگی کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کی زندگی، دیگر حیوانات کی طرح، محض طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) ہے۔ جس میں جذبات محرکہ محض حیوانی تقاضے (ANIMAL INSTINCTS) ہوتے ہیں۔ یہ تقاضے جیسا کہ اربابِ علم و تحقیق کو معلوم ہے (i) تحفظِ خویش (SELF - PRESERVATION) اس مقصد کے لئے (ii) غلبۂ خویش (SELF AGGRESSION) اور افزائشِ نسل (SELF REPRODUCTION) ہیں۔ ان میں، نہ تو کسی دوسرے کی ضروریات پورا کرنے کا تصور پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی تحفظِ خویش کے لئے "جائز اور ناجائز" کی تمیز کا سوال ابھرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، مادی نظریۂ زندگی میں، بلند اقدار (HIGHER VALUES) کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ اس میں معاشرہ کا ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے، معاشرتی قوانین و ضوابط کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ یہ چیز وہی ہے جسے حیوانات میں (HERD INSTINCT) کہا جاتا ہے یعنی جب ایک فرد محسوس کرتا ہے کہ گروہ کے ساتھ رہنے میں وہ زیادہ محفوظ رہ سکتا ہے تو وہ گروہ کے عاید کردہ قواعد و ضوابط کی پابندی کرتا ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں نظریۂ حیات مادی (MATERIALISTIC) کارفرما ہے جس کا نتیجہ

یہ ہے کہ یہ خطۂ ارض، انسانوں کی بستی نہیں، درندوں کا بھٹ بن کر رہ گیا ہے۔ اس وقت زمین پر بسنے والے انسان، حیوانی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا جذبۂ محرکہ احساسِ قومیت (NATIONALISM) ہے۔ یعنی (HERD INSTINCT)۔ بلند انسانی اقدار کا تصور کہیں نہیں۔ نظامِ سرمایہ داری، اس تصورِ حیات کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس فلسفۂ حیات کے تابع کوئی دوسرا نظام بروئے کار آ ہی نہیں سکتا۔

لیکن کمیونزم، اس قسم کے خالص مادی نظریۂ حیات کے تابع، وہ معاشی نظام قائم کرنا چاہتا ہے جس کی اس نظریہ کے اندر گنجائش ہی نہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، مادی نظریۂ حیات (یعنی حیوانی سطح زندگی) میں، دوسروں کی ضروریات کے احساس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور کمیونزم کے معاشی نظام کی بنیاد یہ ہے کہ انسان، اپنا خون پسینہ ایک کرکے، زیادہ سے زیادہ کام کرے، اور اس کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے رکھ کر باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیدے۔ یہ اجتماع ضدین ہے۔ یہ جمع بین النقیضین ہے۔ یہ تصورر (SELF CONTRADICTORY) ہے۔ یہ نار مولا ناقابلِ عمل ہے۔ مادی نظریۂ زندگی اس قابل ہی نہیں کہ انسان کو حیوانی سطح زندگی سے بلند لے جا کر اس کے سینے میں کسی بلند انسانی قدر کا احساس پیدا کر دے۔ لہذا، جب کمیونزم کے نظریۂ حیات کی رُو سے بلند انسانی قدر پیدا ہی نہیں ہو سکتی تو وہ نظام جس کی قوتِ محرکہ بلند انسانی اقدار ہیں، چل کس طرح سکتا ہے۔

کمیونزم جو ہنگامی انقلاب لاتی ہے (اسے "انقلاب" کی بجائے، انتشار کہنا زیادہ مناسب ہے) اس کا جذبہ محرکہ نفرت اور انتقام ہوتا ہے۔ یعنی وہ غریبوں اور محنت کشوں سے کہتی ہے کہ دیکھو! یہ سرمایہ دار تمہاری محنت کی کمائی کو کس طرح لوٹ کھسوٹ کر لئے جا رہے ہیں۔ تم اٹھو اور ان سے اپنی غصب شدہ دولت چھین لو۔ اس سے ان کے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں اور وہ اٹھ کر ان سے اسباب پیدا وار چھین لیتے ہیں۔ جب تک یہ طبقہ باقی رہتا ہے ان کے خلاف نفرت اور انتقام کے جذبات بھی ابھرتے رہتے ہیں۔ جب اس کا خاتمہ ہو کر کمیونزم کا اپنا نظام قائم ہو جاتا ہے تو یہ جذبات (نفرت و انتقام بھی) ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد انہی (سابقہ) مزدوروں اور محنت کشوں سے کہا جاتا ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ محنت کرو۔ لیکن اس میں سے تمہیں صرف بقدر تمہاری ضروریات کے ملے گا۔ اس سے زیادہ نہیں ملے گا۔ وہ

سوچتے ہیں کہ اس نظام میں، اور نظامِ سرمایہ داری میں، فرق کیا ہے؟ نظامِ سرمایہ داری میں بھی ہم زیادہ سے زیادہ محنت کرتے تھے اور اس میں سے ہمیں بقدر اپنی ضروریات ہی کے ملا کرتا تھا (بلکہ بعض اوقات اس سے کچھ زیادہ ہی مل جاتا تھا) اور اب بھی ہم سے یہی کہا جا رہا ہے؟ نتیجہ اس کا یہ کہ اس انقلاب کی السابقون الاوّلون (PIONEERS) کی جماعت کے بعد، وہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا جو اس انقلاب کو قائم رکھ سکے۔ اس سے ان کی اگلی نسل مجبور ہو جاتی ہے کہ اس نظامِ سرمایہ داری سے سمجھوتہ کرے جو ان کے فلسفۂ حیات کا لازمی نتیجہ ہے۔ ایک آدھ نسل، محض پندارِ نفس کی بنا پر، اس قسم کا سمجھوتہ کرتی ہے اور اس کے بعد پھر وہی نظامِ سرمایہ داری قائم ہو جاتا ہے۔ مادی نظریۂ حیات کے ماتحت اس نظام سے مختلف کوئی دوسرا نظام قائم رہ نہیں سکتا۔ آپ اس نظریۂ حیات کے مدعی (اشتراکی) سے کہیئے کہ آپ کہتے ہیں کہ میں جان مار کر محنت کروں اور اس میں سے پھر بقدر اپنی ضرورت کے رکھ کر باقی سب دوسروں کو دیدوں ۔۔۔ میں ایسا کیوں کروں؟ آپ دیکھیں گے کہ اس "کیوں" کا اس کے پاس کوئی تسلی بخش جواب نہیں ہوگا۔ اسے مجبوراً یہ کہنا پڑے گا کہ ایسا کرنا انسانی ہمدردی کا تقاضا ہے۔ لیکن ایسا کہنے سے اس نے کمیونزم کے نظریۂ حیات کو خیر باد کہہ دیا۔ کمیونزم کا نظریۂ حیات صرف طبعی قوانین (PHYSICAL LAWS) کو تسلیم کرتا ہے، اور طبعی قوانین میں کسی سے ہمدردی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا "ہمدردی" ایک انسانی جذبہ ہے، فطرت کا طبعی قانون نہیں۔ ایک بیوہ ماں جس کے جوان بیٹے کے کپڑوں میں آگ لگ جائے وہ آگ کی ہزار منتیں کرے کہ اس بچے کے مرجانے سے میں تباہ و برباد ہو جاؤں گی۔ میرا دنیا میں کوئی نہیں رہے گا۔ اسے مت جلاؤ۔ وہ آگ اس کی ایک نہیں سنے گی۔ اس کے سینے میں ہمدردی کی رمق تک پیدا نہیں ہوگی ۔۔۔ چارہ کھانے والا بیل، بھوکے بیل کو اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتا۔ یہ طبعی قانون کا فطری نتیجہ ہے۔ لیکن اگر کسی کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا بھی ہو جائے، تو یہ فلسفۂ زندگی نہیں بن سکتا۔ اس لئے اسے کسی مستقل انقلاب کی اساس قرار نہیں دیا جا سکتا۔ آج دنیا میں جو انسانی ہمدردی اس طرح مفقود ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ دنیا میں مادی نظریۂ حیات کا دور دورہ ہے۔ لہٰذا مادی نظریۂ حیات کی قائل (بلکہ پرستار) کمیونزم، انسانی ہمدردی کا واسطہ کس طرح دلا سکتی ہے؟ اور اگر وہ اس جذبہ کو اپیل بھی کرے تو یہ اس قدر عظیم انقلاب کی اساس کیسے بن سکتی ہے۔ انقلاب کی اساس سطحی جذبات نہیں بن سکتے، کوئی محکم فلسفۂ زندگی ہی بن سکتا ہے۔

کیمونزم کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ وہ ایمان رکھتی ہے مادی نظریہ حیات پر جس میں بلند انسانی اقدار کا تصور ہی ناپید ہوتا ہے اور نظام قائم کرنا چاہتی ہے وہ جس کی بنیاد ہی بلند انسانی اقدار بن سکتی ہیں یہ

منکر مے بودن و ہمرنگ مستاں زیستن

کی زندگی دو قدم بھی نہیں چل سکتی۔ یہ ہے مطلب ہمارے اس کہنے کا کہ کیمونزم کے پاس وہ اساسِ محکم نہیں جس پر اس کے اسقدر بلند آہنگ معاشی نظام کی سرِ فلک عمارت قائم ہو سکے۔

یہ اساسِ محکم، قرآن کریم مہیا کرتا ہے۔ اس کا پیش کردہ تصورِ حیات یہ ہے کہ انسانی زندگی، حیوانات کی طرح محض طبیعی زندگی نہیں۔ وہ طبیعی جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی رکھتا ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) - یا نفس (SELF) - یا خودی کہا جاتا ہے۔ انسان کا جسم تو طبیعی قوانین کے تابع زندہ رہتا اور انہی کے مطابق ایک دن مردہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی ذات، نہ تو اپنی طبیعی کے تابع ہوتی ہے، نہ ہی جسم کی موت سے فنا ہو جاتی ہے۔ یہ جسمانی موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے اور اگر اس کی مناسب نشو و نما ہو چکی ہو تو یہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو کر حیات جاودانی حاصل کر سکتی ہے۔ انسانی جسم کی نشو و نما، طبیعی قوانین کے مطابق ہوتی ہے، لیکن انسانی ذات کی نشو و نما ان بلند انسانی اقدار کی پابندی سے ہوتی ہے، جو عقل انسانی کی پیداوار نہیں ہوتیں، بلکہ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتی ہیں ان کا سرچشمہ خارجی (OBJECTIVE) ہوتا ہے داخلی (SUBJECTIVE) نہیں

ان اقدار (VALUES) میں ایک بنیادی قدر یہ ہے کہ انسان جس قدر دوسروں کی ضروریات کے لئے دے، اسی قدر اس کی اپنی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے۔ ان اقدار پر ایمان، انسان کے اندر یہ جذبۂ محرکہ بیدار کرتا ہے کہ وہ جان مار کر زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اس میں سے کم از کم اپنی ضروریات کے لئے رکھ کر زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشو و نما کے لئے کھلا چھوڑ دے، تاکہ اس کی اپنی ذات کی زیادہ سے زیادہ نشو و نما ہو سکے — ان اقدار پر ایمان وہ اساسِ محکم ہے جو اس قدر عظیم معاشی نظام کی بلند و بالا عمارت کا بوجھ برداشت کرنے کی متحمل ہو سکتی ہے۔

کیمونزم اپنے نظام کو دو مراحل میں سے گزارتی ہے۔ مرحلۂ اول کو سوشلزم کہا جاتا ہے۔ اور مرحلہ دوم کو کیمونزم۔ پہلے مرحلہ میں اصول یہ ہوتا ہے کہ

ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام لو اور کام کے مطابق معاوضہ دو۔

دوسرے مرحلہ میں اصول یہ کارفرما ہوتا ہے کہ

ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام لو اور اس کی ضروریات کے مطابق اُسے دو۔

[ابھی اشتراکی ممالک مرحلہ اوّل ہی سے گزر رہے ہیں۔ مرحلہ دوم تک ان میں سے کوئی نہیں پہنچا۔]

اوران کے نظام کی شکست وریخت مرحلہ اوّل ہی میں ہونے لگ گئی ہے۔ اس مرحلہ کو قابلِ عمل بنانے کے لئے ضروری تھا کہ وسائلِ پیداوار مملکت کی تحویل میں چلے جائیں۔ جذبہ محرکہ نہ ہونے کی وجہ سے، لوگ اسے بھی برداشت نہیں کر رہے کہ وسائلِ پیداوار ان کی ملکیت میں نہ رہیں (روس اس وقت اسی بحران سے دوچار ہے۔ اور جب مرحلہ اوّل ہی میں یہ حالت ہے تو یہ ظاہر ہے کہ مرحلہ دوم میں قدم تک رکھنا بھی اس نظام کی قسمت میں نہیں ہو سکتا)

قرآنِ کریم بھی اپنے معاشی نظام کی انتہائی منزل تک بتدریج لے جاتا ہے۔۔۔ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ ۔۔۔ (۱۶/۹۰)۔ اس کا بنیادی مسلک ہے۔ عدل کا تعلق مرحلہ اوّل سے ہے جس میں ہر ایک کو اس کے کام کا پورا پورا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ لیکن پورا معاوضہ لے کر یہ لوگ (مومن) اس مال و دولت پر سانپ بن کر نہیں بیٹھ جاتے کیونکہ انہیں ساتھ ہی "فحشاء و المنکر" سے روکا گیا ہے۔ یعنی بخل اور عقل فریب کار کی حیلہ جوئیوں سے جو انسان کو صرف مفادِ خویش کا تحفظ سکھاتی ہے۔

اس مرحلہ میں افرادِ معاشرہ، دیگر ضرورتمندوں کی مدد کرنے کا کام انفرادی طور پر کرتے ہیں۔

اس ٹریننگ کے بعد قرآنِ کریم، اس کاروان کو دوسری منزل میں لیجاتا ہے جہاں یہ اجتماعی طور پر احسان پر کاربند ہوتے ہیں۔ احسان کے معنی ہیں دوسرے کی کمی کو پورا کر کے اس کے توازن کو برقرار رکھنا۔ یہاں ان کا مسلک یہ ہوتا ہے کہ ۔۔۔ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۔۔۔ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹)۔ یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم دوسروں کی ضروریات کے لئے کہاں تک کھلا رکھیں۔ ان سے کہدو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہو، سب کا سب۔" چونکہ ان کے اس عمل کی بنیاد ان کے اس ایمان پر ہوتی ہے کہ ہم جس قدر دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دیدیں گے اسی قدر ہماری اپنی ذات کی نشوونما ہوتی جائے گی، اس لئے وہ اس حد سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں اور ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹)۔ وہ خود تنگی میں گذارہ

کر لیتے ہیں اور دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں ‘‘ اور چونکہ وہ یہ سب ایثار اپنی ذات کی نشوونما کے لئے کرتے ہیں، اس لئے وہ جن کی مدد کرتے ہیں ان سے کہدیتے ہیں کہ ۔۔۔ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا ۔ (۷۶) ہم تم سے اس کا کوئی بدلہ نہیں چاہتے ۔ حتٰی کہ ہم شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں‘‘ واضح رہے کہ یہ ذہنیت اور اندازِ زیست جماعتِ مومنین کے مستثنیٰ افراد (EXCEPTIONAL INDIVIDUALS) کا نہیں بلکہ اس پوری کی پوری جماعت کا ہوتا ہے جس کے ہاتھوں یہ انقلاب رونما اور یہ نظام متشکل ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے ہر مومن کا اندازِ نگاہ، اور نہجِ زندگی یہی ہوتا ہے ۔ اس کے نزدیک، جو شخص مسلمان ہونا چاہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک معاہدہ پر دستخط کرے ۔ یعنی اس معاہدہ پر جس میں کہا گیا ہے کہ

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۔ (۹/۱۱۱)

یہ، مسلمان ہونے والا فرد، معاہدہ کرتا ہے کہ میں نے اپنا جان اور مال بیچ دیا ہے اور اس کے بدلے میں جنت خریدلی ہے ۔ ان افراد کے مجموعہ کا نام ہے وہ جماعتِ مومنین، جو اس نظام کو قائم کرتی ہے ۔ یہ نظام اس قسم کے افراد کے علاوہ، اور کسی کے ہاتھوں قائم نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ اس کے لئے جس جذبۂ محرکہ کی ضرورت ہے وہ اس ایمان کے علاوہ اور کسی صورت میں پیدا نہیں ہو سکتا ۔ اس معاہدہ کی رُو سے ذاتی ملکیت کا تصور ہی ختم ہو جاتا ہے ۔

تصریحاتِ بالا سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آگئیں ۔

(۱) مادی نظریۂ حیات کا لازمی نتیجہ، نظامِ سرمایہ داری ہے ۔ جو معاشرہ اس نظریۂ حیات کا حامل ہوگا اس میں سرمایہ داری کے علاوہ کوئی دوسرا نظام چل نہیں سکتا ۔ کمیونزم کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ یہ نظریۂ حیات تو رکھتی ہے مادی، اور نظام قائم کرنا چاہتی ہے ایسا جو سرمایہ داری کے نظام کی ضد ہے ۔ یہ اجتماعِ ضدین ناممکن ہے ۔

(۲) قرآن کریم مادی نظریۂ حیات کا مخالف ہے ۔ اس لئے یہ نظامِ سرمایہ داری کا بھی مخالف ہے یہ جس نظریۂ زندگی کا پیامبر ہے، اس کی رو سے، ہر فرد، دوسروں کی ضروریات پورا

کرنے میں خود اپنی ذات کا فائدہ دیکھتا ہے۔ اس لئے اس قسم کا معاشی نظام صرف آپ
ایمان کی بنیادوں پر قائم ہو سکتا ہے۔

کمیونزم کے پروگرام میں صرف حصہ لَا ہوتا ہے۔ یعنی ملوکیت۔ نظامِ سرمایہ داری ــــ مذہبی پیشوائیت کو مٹانا ــــ انہیں مٹانے کے بعد، وہ سمجھ لیتی ہے کہ بس اب میدان مار لیا۔ اب ہمارا نظام خود بخود قائم ہو جائیگا ــــ لیکن کوئی نظام، خود بخود قائم نہیں ہوا کرتا ــــ نظام کے قیام کے لئے، مخالفتوں کو مٹانا، بیشک ضروری ہوتا ہے، لیکن اس کے بعد، ایک مثبت اساس کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس پر اس جدید نظام کی عمارت استوار کی جا سکے۔ قرآن کریم نے لَآ اِلٰہَ ــــ اِلَّا اللّٰہُ کے عظیم انقلابی فارمولا سے ایک مکمل پروگرام عطا کیا ہے۔ دیکھئے۔ وہ لَآ اِلٰہَ کی منزل سر کر لینے کے بعد، کہ جب تمام مخالفتوں کو راستے سے ہٹا دیا جائے کس طرح اس حقیقت کو اجاگر کر کے سامنے لاتا ہے کہ اس سے تم کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ بس اب کرنے کا کام ختم ہوا۔ اب اس فتح و کامرانی کے ثمرات کو اطمینان سے بیٹھ کر کھاؤ۔ وہ کہتا ہے کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَ الْفَتْحُ ۙ وَ رَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا۔ جب فتح و کامرانی تمہارے قدم چومے۔ جب مخالفتیں سب سرنگوں ہو جائیں۔ جب لوگ فوج در فوج، تمہارے نظام میں داخل ہونا شروع ہو جائیں۔ تو اس وقت یہ نہ سمجھ لو کہ تمہارا پروگرام مکمل ہو گیا۔ تم نے کامیابی حاصل کر لی۔ بالکل نہیں اس کے بعد تمہارے پروگرام کا نیا مرحلہ شروع ہوگا ــــ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَ اسْتَغْفِرْہُ ــــ اس کے بعد تمہیں اس نظام کے مستحقِ حمد و ستائش بنانے کے لئے اور بھی زیادہ سرگرمِ عمل ہونا پڑے گا۔ اور قدم قدم پر اپنی حفاظت کا سامان طلب کرتے رہنا ہوگا ــــ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا (۱۱۰/۳) ــــ یہ ہے وہ طریقِ کار جس سے "خدا تمہاری طرف لوٹ کر آئے گا"۔ حصہ لَآ سے تم نے اس کے آنے کے لئے صرف راستہ صاف کیا ہے، اسے "لاتے" کے لئے ابھی بہت کچھ اور کرنا ہوگا۔

دوسری جگہ نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ "جس بوجھ نے تمہاری کمر توڑ رکھی تھی وہ بوجھ اٹھ گیا ہے۔ مشکلات کے بعد آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تمہارا پروگرام بھی ختم ہو گیا ہے۔ بالکل نہیں۔ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ــــ جب تو اس حصہ لَآ سے فارغ ہو گیا ہے، تو پروگرام کے دوسرے حصے کی تکمیل کے لئے جم کر کھڑا ہو جا۔ اور وہ پروگرام یہ ہے کہ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ۔ (۹۴/۸)۔ اپنی تمام توجہات، خدا کے نظامِ ربوبیت کے متشکل اور مستحکم کرنے کے

مرکوز کردے۔ یہ ہے اِلَّا اللہ کا مرحلہ، یعنی مخالفتوں کے ہجوم سے فارغ ہوجانے کے بعد "خدا کی طرف متوجہ ہوجانے" کا پروگرام —!

یہ ہے وہ پیغام، جس کے متعلق ہم نے کہا تھا کہ اگر اسے چین کے ارباب حل وعقد اور کمیونزم کے اربابِ فکر و نظر تک پہنچا دیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس پر غور کر کے، اپنے نظام کو انسانیت کی ان بلند اقدار پر متشکل کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں جس سے نوع انسان اس عذاب سے محفوظ رہ سکے جو ان کے موجودہ نظام کی ناکامی کے بعد، اس پر مسلط ہونے والا ہے، اس لئے کہ اس کے بعد، نظام سرمایہ داری پورے جذبۂ انتقام کے ساتھ ابھرے گا اور جن جن رستوں سے اس نے دیکھا تھا کہ اس کی مخالف قوتوں نے سر نکالا تھا، انہیں اس طرح بند کرے گا کہ اُدھر سے دوبارہ داخل ہونے کا کسی کو یارا نہ رہے۔

کہا جائے گا کہ جو اساس، قرآنِ کریم تجویز کرتا ہے اس کے لئے ماورائے عقل انسانی سرچشمۂ علم (وحی) پر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے۔ اور کمیونزم کے حامی کسی ایسے ذریعۂ علم کے وجود کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں اس لئے وہ کس طرح وحی کی عطا کردہ اقدار کے تصور کو قابلِ اعتنا قرار دیں گے۔؟ یہ اعتراض بظاہر بڑا وزنی نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کمیونزم کے حامی ہی نہیں، بلکہ مادی نظریۂ حیات کے ماننے والے، سب کے سب خارج از عقلِ انسانی سرچشمۂ قوانین پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ قوانینِ فطرت کو مانتے ہیں اور ان قوانین کی کیفیت یہ ہے کہ یہ نہ تو عقلِ انسانی کے پیدا کردہ ہیں اور نہ ہی عقلِ انسانی ان کی کوئی توجیہہ پیش کر سکتی ہے۔ مثلاً یہ قانون کہ پانی اتنے درجۂ حرارت پر پہنچ کر کھولنے لگ جاتا ہے، عقلِ انسانی کا پیدا کردہ نہیں۔ اور نہ ہی انسانی عقل یہ بتا سکتی ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کے باوجود، مادی نظریۂ حیات کے قائلین ان قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ نظریہ قائم ہی اس بنیاد پر ہے کہ فطرت کے قوانین اٹل ہیں اور عقلِ انسانی کے پیدا کردہ نہیں —!

اور کمیونزم کے حامی تو صرف فطرت کے طبیعی قوانین ہی کو خارجی (OBJECTIVE) نہیں جانتے، وہ اپنے معاشی نظام کے اصولوں کو بھی خارجی تسلیم کرتے ہیں۔ مارکس کا نظریۂ تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) عقلِ انسانی کا پیدا کردہ نہیں۔ اس کا وجود خارجی ہے، اسی بنا پر ماؤزے تنگ نے کہا ہے کہ

طبقاتی جنگ ایک خارجی حقیقت ہے جس کا مدار لوگوں کے چاہنے یا نہ چاہنے پر نہیں۔

ریکنگ ریویو۔ مورخہ ۵۴ء۔ صفہ)

اور اس پر اس اخبار کا مدیر اپنے مقالہ افتتاحیہ میں تبصرہ کرتا ہوا لکھتا ہے۔ کہ

کہ یہ امر بالکل معمول کے مطابق اور خارجی توانین (OBJECTIVE LAWS) کے موافق ہے کہ (ایسا ہو)

اب ظاہر ہے کہ جو لوگ (OBJECTIVE LAWS) کے قائل ہوں انہیں یہ سمجھانا ناممکن نہیں ہو سکتا۔ کہ بلند اقدار انسانیت، خارج سے ملتی ہیں (اسی کو وحی کہا جاتا ہے) ان لوگوں نے وحی کا انکار اس لئے نہیں کیا تھا کہ ان کے نزدیک ماورائے عقل انسانی کسی سرچشمۂ توانین کا ماننا عقلاً ناممکن تھا۔ انہوں نے اس سے اس لئے انکار کیا تھا کہ ان کے سامنے جو کچھ وحی کہہ کر پیش کیا جاتا تھا (یعنی عیسائیت کے عقائد) انہیں ان کی عقل صحیح تسلیم نہیں کرتی تھی۔ اس لئے انہوں نے کہہ دیا کہ اگر وحی کی تعلیم یہی ہے تو یہ وحی تمہیں مبارک۔ ہم اسے تسلیم کرنے سے باز آئے۔ اگر ان کے سامنے وہ وحی پیش کی جائے جس نے معاشی نظام تو اسی قسم کا پیش کیا ہے جس قسم کا نظام کمیونزم کا منتہائے نگاہ ہے اور اس کے لئے بنیاد ایسی مہیا کی ہے جس کا کمیونزم میں فقدان ہے۔ اور جس کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک میری بات عقل و فکر کی رُو سے سمجھ نہ جائے، اسے مت قبول کرو، ہو نہیں سکتا کہ وہ اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھیں۔

کہا یہ جائے گا۔ (اور یہ اعتراض عام طور پر کیا جاتا ہے) کہ اگر قرآن کریم نے اس قسم کا معاشی نظام دیا تھا، اور اس کے لئے ایسی اساسِ محکم بھی مہیا کر دی تھی تو وہ نظام (تھوڑے سے عرصہ کے بعد) آگے کیوں نہ چلا؟ یہ اعتراض بڑا سطح بینی پر مبنی ہے۔ ایک ڈاکٹر کسی مریض کے لئے ایک نسخہ تجویز کرتا ہے، وہ اُسے چند دنوں تک استعمال کرتا ہے۔ اسے اس سے فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ اس کا استعمال چھوڑ دیتا ہے اور اس طرح اس کا مرض دور نہیں ہوتا بلکہ اور بڑھ جاتا ہے۔ تو اس کے بعد کیا آپ کہیں گے کہ اگر وہ نسخہ واقعی شفا بخش تھا تو اس سے اس مریض کا مرض دور کیوں نہ ہوا؟

اگر وہ اس نسخہ کو متواتر استعمال کرتا رہتا اور اس کے باوجود مرض دور نہ ہوتا، تو ہم کہہ سکتے تھے کہ اس نسخہ میں شفا بخشی کی صلاحیت نہیں تھی۔ لیکن اسے ترک کر دینے کے بعد تو اس پر یہ اعتراض وارد نہیں کیا جا سکتا۔ وہ نسخہ آج بھی موجود ہے اور اس کا دعوےٰ ہے کہ اس میں آج بھی اس کی صلاحیت ہے

کہ وہ اس مرض کو دور کر دے۔ اس کے دعوے کے کذب و صداقت کو پرکھنے کا طریق یہ ہے کہ اسے استعمال کر کے دیکھا جائے۔

اور ہم چین کے ارباب بست و کشاد تک یہ پیغام اس لئے پہنچانا چاہتے ہیں کہ انہوں نے اس منزل کا آدھا سفر طے کر لیا ہوا ہے۔ یعنی وہ اس کے حصۂ "لا" پر عمل پیرا ہو چکے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے منزل مقصود تک پہنچنا دوسروں کی نسبت زیادہ آسان ہے۔ ان تک اگر یہ آواز پہنچا دی جائے، تو چہ عجب کہ اقبال نے جو کہا تھا کہ ع

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانوں سے

وہ حقیقت دنیا کے سامنے ایک بار پھر آجائے۔

چینی عوام کے سامنے اس وقت جذبۂ محرکہ صرف ماؤزے تنگ کی شخصیت ہے۔ وہ اس کی پرستش کرتے ہیں۔ اس کی خاطر سب کچھ لٹا دینے کے لئے تیار ہیں۔ وہ بڑی سے بڑی صبر آزما قربانی کے لئے محض اس لئے آمادہ رہتے ہیں کہ اس سے ماؤ خوش ہو گا۔ ان کی تمام توجہات کا نقطۂ ماسکہ، ان کی سعی و عمل کا مرکز، ان کی تمام محنت و مشقت کا محور، ماؤ کی ذات ہے۔ لیکن ماؤ تو بہر حال ایک فانی انسان ہے۔ اس نے زود یا بدیر مر جانا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کے بعد، چین کے پاس جذبۂ محرکہ کیا ہو گا؟ جو لوگ چین سے ہو کر آتے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ چین کے ارباب حل و عقد کو خود، اس امر کا احساس ہے اور وہ اس مشکل ترین سوال کا حل دریافت کرنے کے لئے بے حد متفکر اور مشوش ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس مشکل کا حل انہیں مل نہیں سکتا۔ شخصیتیں بہر حال آنے جانے والی ہوتی ہیں۔ جو نظام شخصیات کے سہارے قائم ہو گا وہ ناپائیدار ہو گا۔ پائندگی تو نظریۂ حیات اور فلسفۂ زندگی ہی کے لئے ہو سکتی ہے بشرطیکہ اس میں زمانے کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت ہو۔ اور یہ نظریۂ حیات کمیونزم کے ہاں ہے نہیں۔ اس لئے چین کے ارباب فکر و نظر کی ہزار تمناؤں اور صد ہزار کاوشوں کے باوجود، انہیں اس مشکل کا حل مل نہیں سکتا۔

یہ سوال خود قرآن کریم کے بھی پیش نظر تھا جس کا حل اس نے یہ کہہ کر پیش کر دیا کہ یاد رکھو:۔

وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ (۳/۱۴۳)۔

محمد بجز ایں نیست، اللہ کا ایک رسول ہے۔ اس سے پہلے بہت سے رسول آئے اور اپنے

فرائض سرانجام دے کر دنیا سے) چلے گئے تو کیا یہ اگر کل کو وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو تم (یہ سمجھ کر کہ یہ نظام اس کی ذات سے وابستہ تھا، اس لئے اس کی وفات سے ختم ہو گیا) پھر اپنے نظامِ کہن کی طرف پلٹ جاؤ گے؟

اور یہی تھی وہ حقیقتِ کبریٰ جس کا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس وقت اعلان کیا جب نبی اکرمؐ کی وفات سے بعض قلوب میں یہ خیال ابھرا کہ اب کیا ہو گا؟ اس خیال کو رفع کرنے کے لئے جناب صدیق اکبرؓ نے منبر پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ اے جماعتِ مومنین! اس حقیقت کو سمجھ لو کہ تم میں سے جو شخص محمدؐ کی عبودیت اختیار کئے ہوئے تھا اس کا معبود واقعی وفات پا گیا ہے۔ لیکن جو خدا کی عبودیت اختیار کئے ہوئے تھا، اس کو جان لینا چاہیئے کہ اس کا معبود زندہ و پائندہ ہے۔ اس اعلانِ عظیم سے آپ نے، شخصیات اور نظریۂ زندگی کے فرق کو نمایاں کر کے بتا دیا اور اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ اسلام خدا کے عطا کردہ اس نظریۂ زندگی کا نام ہے جو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہے گا[1]۔ اس کی بقا شخصیتوں سے وابستہ نہیں۔ اس لئے کہ شخصیتیں آنی اور فانی ہوتی ہیں۔ خدا کا عطا کردہ نظریۂ حیات زندہ و پائندہ ہے۔ یہ نظریۂ حیات آج بھی اسی طرح قائم و دائم ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس پر جب بھی عمل کیا جائے گا۔ یہ اپنے نتائج سامنے لے آئے گا۔ برعکس اس کے، چین کا موجودہ نظام ماؤزے تنگ کی ذات سے وابستہ ہے۔ اس کی بنیاد کسی ایسے فلسفۂ حیات پر نہیں جو ماؤ (یا اُن کے دیگر زعماء) کی وفات کے بعد بھی باقی رہے۔ برعکس اس کے۔ ان کا فلسفۂ حیات وہ ہے جس پر اس نظام کی عمارت قائم رہ نہیں سکتی۔

یہ ہے وہ حقیقت جس کے پیشِ نظر ہم نے کہا ہے کہ اگر آج کوئی شخص، چین کے اربابِ فکر و نظر کے سامنے قرآن کریم کا فلسفۂ حیات پیش کر کے، ان پر اس کی اہمیت واضح کر دے، تو وہ نوعِ انسان کا بہت بڑا محسن ہو گا۔

---

[1] ہم نے اس مقالہ میں اس نکتہ سے بحث نہیں کی کہ ہیگل کے فلسفہ میں، جس پر مارکس کے تخیل کی عمارت استوار ہوتی ہے، ثبات (PERMANENCE) کا تصور ہی نہیں۔ اس کی بنیاد تغیر (CHANGE) پر ہے، اس لئے اس کی رُو سے مستقل اقدار کا تصور ہی غلط ہے۔ اس کے برعکس، قرآن کا فلسفۂ حیات، مستقل اور غیر متبدل اقدار کا حامل ہے، جو نہ شخصیات سے وابستہ ہیں، نہ تاریخی وجوب کے بدل جانے سے قابلِ تغیر۔ اس نکتہ کی وضاحت اس مقالہ میں کی گئی ہے جس کا عنوان ہے ـــ "ماؤزے تنگ اور قرآن ـــ"

ماؤزے تنگ

اور

قرآن

(پرویز)

اسلام ایک دین ہے۔ دین کے معنی ہیں ایسا نظامِ زندگی جس کی بنیاد کسی فلسفۂ حیات (IDEOLOGY) پر ہو۔ وہ کوئی مذہب (RELIGION) نہیں۔ مذہب کا تعلق نظامِ زندگی سے ہوتا ہی نہیں۔ وہ دنیادی کاروبار سے الگ تھلگ رہنا سکھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی مذہب نے کسی نظامِ حیات کو جنم نہیں دیا۔ یہودیت، عیسائیت، مجوسیت، ہندومت، بدھ مت وغیرہ مذاہب ہیں جو انسان کو مکتی یا نجات کے طور طریق سکھاتے ہیں۔ کوئی نظامِ زندگی عطا نہیں کرتے۔ دوسری طرف، (اسلام کے علاوہ) کوئی نظامِ زندگی ایسا نہیں جس کی بنیاد آئیڈیالوجی پر ہو۔ اسلام کے بعد، کمیونزم ایک ایسا نظامِ زندگی ہے جو ایک فلسفۂ حیات پر متفرع ہے۔ بالفاظِ دیگر، صرف کمیونزم ایک "دین" کی حیثیت سے اسلام کے مدمقابل آیا ہے۔ اس لئے اسلام کو ایک دین ماننے والوں کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ کمیونزم کا اس نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کریں۔ اور پھر دیکھیں کہ ان میں سے کون سا نظامِ زندگی ایسا ہے جو انسانی زندگی کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے اور اس میں باقی رہنے اور آگے چلنے کی صلاحیت ہے۔ ہمارے ہاں مشکل یہ ہے کہ مسلمانوں نے بالعموم اسلام کو ایک مذہب سمجھ رکھا ہے۔ اس لئے وہ اس کا مقابلہ مذاہبِ عالم سے

کرتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف، کمیونسٹوں کو بھی بالعموم اتنا ہی معلوم ہے کہ کمیونزم ایک معاشی نظام کا نام ہے۔ حالانکہ (جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے) یہ ایک نظامِ زندگی ہے جو ایک خاص فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر استوار کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے عصرِ حاضر میں 'انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے مستقبل کے متعلق کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے اسلام اور کمیونزم کا تقابلی مطالعہ ناگزیر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت دنیا میں اس سے زیادہ اہم موضوع کوئی ہے ہی نہیں۔ میں اس حقیقت کو اس سے پہلے بھی کئی بار پیش کر چکا ہوں۔ کہ

(۱) ایک چیز ہے کمیونزم کا فلسفۂ حیات اور دوسری چیز ہے اس کا معاشی نظام جسے وہ اس فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر استوار کرنے کا مدعی ہے۔

(۲) جہاں تک کمیونزم کے معاشی نظام کا تعلق ہے، وہ قرآن کریم کے تجویز کردہ معاشی نظام کے مماثل ہے لیکن کمیونزم کا فلسفۂ زندگی اور قرآن کا فلسفۂ حیات، ایک حد تک ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلنے کے باوجود اصل و بنیاد کی رو سے ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔

(۳) کمیونزم کا فلسفۂ حیات بنیادی طور پر اس قدر کمزور ہے کہ اس کے پیش کردہ معاشی نظام کی عمارت اس کی بنیادوں پر قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کے برعکس،

(۴) اس معاشی نظام کی عمارت صرف اس فلسفۂ حیات پر قائم ہو سکتی اور برقرار رہ سکتی ہے جسے قرآن کریم پیش کرتا ہے۔

میں نے متعدد مقامات پر ان ہر دو فلسفہ ہائے زندگی کے اصولی خطوط کو سامنے لا کر بتایا ہے کہ کس طرح باہمگر متضاد ہیں لیکن عصرِ حاضر کے اس اہم ترین مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والے احباب کا تقاضا ہے کہ تفصیل سے بتایا جائے کہ یہ دونوں فلسفے کیا ہیں، کس حد تک ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور کہاں سے ان کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ احباب کے اس تقاضے سے قطع نظر، مجھے خود اس کا احساس ہے کہ یہ موضوع تفصیلی گفتگو کا محتاج و مستحق ہے۔ لیکن اس قدر پیچیدہ فلسفیانہ بحث کو عام فہم انداز میں پیش کرنے اور اسے ایک مقالہ میں سمٹانے کی دِقّت میری عناں گیر رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے مباحث کے لئے موزوں یہی ہوتا ہے کہ یا تو اُسے متعدد خطبات کی شکل میں درسًا درسًا سامنے لایا جائے اور یا انہیں مبسوط تصنیف کی صورت میں پیش کیا جائے۔ لیکن چونکہ ان باتوں کا سردست امکان نہیں، اس لئے میں نے (بحالاتِ موجودہ) یہی مناسب سمجھا ہے کہ اسے مختصر الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش

کروں اور تفصیل کو کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھوں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

کمیونزم کا فلسفہ

کمیونزم کے فلسفہ حیات کی ابتداء ہیگل سے کرنی چاہیئے اور پھر مارکس اور لینن کو ساتھ لیتے ہوئے ماؤزے تنگ تک پہنچ جانا چاہیئے۔ لیکن یہ راستہ طول طویل بھی ہے اور (ذہنی اعتبار سے) دشوار گزار بھی۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ ہیگل اور مارکس کے تصورات کے متعلق سرسری اشارات پر اکتفا کیا جائے اور ماؤزے تنگ کے تصور کو تفصیل سے پیش کیا جائے، بالخصوص اس لئے کہ وہی اس دور میں اس فلسفہ کا عظیم علمبردار، اس کے پیدا کردہ انقلاب کا قائد، اور اس کی بنیادوں پر استوار معاشی نظام کا سب سے بڑا داعی و معمار ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ فکر و عمل کے امتزاج کی رو سے دیکھا جائے تو اس وقت دنیا میں اس کا ہمسر کہیں نظر نہیں آئے گا۔

ہیگل نے کہا کہ دنیا میں ایک تصور (IDEA) وجود میں آتا ہے۔ وہ بڑھتا، پھولتا، پھلتا ہے۔ جب وہ اپنے شباب پر پہنچ جاتا ہے۔ تو اس میں سے، اس کی ضد ایک اور تصور پھوٹتا ہے۔ وہ بھی اسی طرح پروان چڑھتا ہے، تو پھر ایک تیسرا تصور ایسا پیدا ہوتا ہے جو ان دونوں باہمدگر متصادم تصورات کی صفات کو لئے ہوئے ابھرتا ہے۔ اس طرح یہ سلسلۂ تصورات آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ روحِ عصر (SPIRIT OF THE AGE) اس عملِ پیہم کی محرک ہوتی ہے۔

مارکس اسی مکتبِ فکر سے متعلق تھا۔ لیکن اس نے کہا کہ یہ تضاد و تغیر تصورات میں نہیں، بلکہ انسانی زندگی کے معاشی نظام میں ہوتا رہتا ہے اور تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) اس کی قوتِ متحرکہ ہے۔

ماؤزے تنگ بھی اصولی طور پر اسی فلسفۂ اضداد کا مؤید ہے۔ لیکن وہ ہیگل (بلکہ مارکس سے بھی ایک حد تک) اختلاف رکھتا ہے۔ اس کا فلسفہ، اس کے مجموعۂ تحریرات (WORKS) میں مختلف مقامات میں بکھرا ہوا ہے، اور اس کی اصل و بنیاد قانونِ اضداد (LAW OF CONTRADICTION) ہے۔ اس کے ماحصل کو ذیل کے الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) کائنات کی نشوونما کے سلسلہ میں، شروع ہی سے دو تصورات شانہ بشانہ چلے آتے نظر آتے ہیں جو ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ ایک تصور وہ ہے جسے عام طور پر ماوراء الطبیعاتی (METAPHYSICAL) کہا جاتا ہے اور دوسرے کو مادی جدلیت (DIALECTIC MATERIALISM) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۲) ماوراء الطبیعاتی فلسفہ کی رُو سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ کائنات کی ہر شے ایک مستقل وجود رکھتی ہے وہ دیگر اشیائے کائنات سے بالکل لاتعلق اور الگ تھلگ ہوتی ہے اور شروع سے آخر تک وہی شے رہتی ہے۔ اس کی ذات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ وہ کچھ اور بن ہی نہیں سکتی۔ خارجی عناصر اس پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں لیکن اس سے اس کے صرف مظاہر میں تبدیلی آتی ہے، اس کی اصل و بنیاد میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یعنی اس کی تبدیلی کمیت (QUANTITATIVE) کی ہوتی ہے۔ کیفیت کی (QUALITATIVE) نہیں ہوتی۔ جن اشیاء میں کچھ پیدا کرنے کی صلاحیت ہے، وہ اپنے جیسی چیز ہی پیدا کر سکتی ہیں۔ جیسے آم کی گٹھلی سے آم پیدا ہو جاتا ہے اور بکری کا بچہ، آخر کار بکری بن سکتا ہے، کچھ اور نہیں۔ اسی سلسلہ میں نظریہ ارتقاء کے حاملین (یعنے ڈارون کے متبعین) بھی اتنا ہی بتا سکے ہیں، کہ ارتقاء کی رُو سے، اشیائے کائنات کی شکل و صورت ہی میں فرق پیدا ہوتا ہے، ان کی ذات (ESSENCE) ویسی کی ویسی ہی رہتی ہے۔ لہذا، کائنات میں تخلیق کا عمل، گردشِ دولابی (REPETITION) سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہی اصول، اشیائے کائنات میں کارفرما ہے اور یہی قانون، انسانی فکر و تصورات کی دنیا میں ــــ جس کے اعتبار سے تبدیلی نہ ان میں ہوتی ہے، نہ ان میں۔

(۳) اس کے برعکس، جدلیاتی فلسفہ کی رو سے کائناتی نشوونما کا تصور یہ ہے کہ

(ل) کائنات کی ہر شے کے اندر، شروع سے اخیر تک، ہمیشہ دو متضاد عناصر موجود ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے ہیں۔ ان کے اس باہمی تصادم یا ٹکراؤ کی جہت سے اس فلسفہ کو جدلیاتی (DIALECTIC) کہا جاتا ہے۔

(ب) ان متضاد عناصر میں سے ایک وقت میں ایک عنصر غالب رہتا ہے۔ اسے (PRINCIPAL) کہا جاتا ہے اور دوسرا مغلوب ــ جسے (SECONDARY) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی ان میں سے ایک کا پلڑا بھاری رہتا ہے اور دوسرے کا ہلکا ــ بھاری یا غالب عنصر کی جو کیفیات ہوں، ان کی نسبت سے وہ شے متعارف ہوتی ہے۔

(ج) باہمی تصادم سے، کچھ وقت کے بعد، مغلوب عنصر، غالب ہوجاتا ہے اور غالب عنصر، مغلوب اور چونکہ ہر شے کا تشخص، غالب عنصر کی نسبت سے متعین ہوتا ہے اس لئے اس تبدیلی سے وہ شے خود ایک دوسری شے میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ شکل و صورت کے اعتبار ہی سے نہیں بلکہ اصل و بنیاد کی رُو سے بھی بالکل جدید شے۔ اس قانون کو وحدتِ تضادات (UNITY OF OPPOSITES) سے تعبیر کیا جاتا ہے، جو ماؤزے تنگ کے نزدیک عالمگیر اور بنیادی قانونِ کائنات ہے۔

اس مقام پر ایک ابہام ہے جس کی وضاحت، ماؤزے تنگ کی تحریروں میں مجھے نہیں مل سکی۔ بعض مقامات پر اس نے کہا ہے کہ اس طریق میں غالب عنصر، مغلوب ہوجاتا ہے اور مغلوب، غالب آجاتا ہے۔ یعنی دونوں عناصر موجود تو رہتے ہیں، صرف ان کی پوزیشن بدل جاتی ہے۔ اس اعتبار سے بات یوں نظر آتی ہے کہ یہ متضاد عناصر، شروع سے آخیر تک اس شے میں موجود رہتے ہیں۔ اگر عنصر (الف) غالب ہوتا ہے تو وہ شے (الف) بن جاتی ہے اور جب عنصر (ب) غالب آجاتا ہے تو وہ شے (ب) میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ یہ گردشِ دولابی (CYCLIC PROCESS) اسی طرح جاری رہتا ہے اور اس طرح وہ شے (الف) یا (ب) بنتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور نہیں بن سکتی۔

لیکن بعض مقامات پر اس نے کہا ہے کہ غالب عنصر آہستہ آہستہ کمزور ہو کر مغلوب عنصر میں تبدیل یا مدغم ہوجاتا ہے اور اس طرح اس کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ اس نے کئی جگہ اسے اس کی موت سے تعبیر کیا ہے۔ اس طرح اس شے میں ایک نیا عنصر وجود میں آجاتا ہے جس کی حیثیت عنصرِ غالب کی ہوتی ہے اور اس کے مدِمقابل ایک نیا مغلوب عنصر وجود میں آجاتا ہے۔ یوں وہ شے (الف) اور (ب) میں ہی تبدیل نہیں ہوتی رہتی بلکہ وہ ارتقائی طور پر کچھ اور بن جاتی ہے جو پہلی شے سے ارفع ہوتی ہے۔ اسے تضادات میں توافق کہا جاتا ہے۔

(د) اس عملِ تغیر کی رو سے ایک شے، ایک ہی وقت میں، وہ شے بھی ہوتی ہے اور کچھ اور شے بن بھی رہی ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، اشیائے کائنات، ہمیشہ وجود کوشی (BECOMING) کے مرحلہ میں رہتی ہیں، انیت (BeinG) کے مقام تک کبھی نہیں پہنچتیں۔

(س) ایک شے کے اندر دونوں متضاد عناصر ایک دوسرے کی ضد (OPPOSITE) ہونے کے باوجود، ایک دوسرے کے وجود کا سبب (COMPLEMENTARY) بھی ہوتے ہیں۔ یعنی اگر ان میں سے

ایک کا وجود نہ ہو، تو دوسرا بھی موجود نہیں ہو سکتا۔ جیسے تاریکی نہ ہو تو روشنی بھی نہیں ہو سکتی۔ موت نہ ہو تو زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔۔۔ نیز یہ ایک دوسرے کی تکمیل موجب بھی ہوتے ہیں۔۔۔ یعنی عنصر غالب آہستہ آہستہ مغلوب میں تبدیل ہو کر اسے غالب بنا دیتا ہے۔

(ش) یہ طریق تصادم و تخلیق۔۔۔ یا یوں کہیئے کہ اشیاء میں استبدال و استخلاف کا عمل متواتر۔۔۔ شروع سے ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ یہ سلسلہ لامتناہی ہے، کبھی ختم نہیں ہوگا۔

(ص) یہ طریق عمل صرف اشیاء (THINGS) کے اندر کارفرما نہیں بلکہ انسانی فکر اور معاشرتی و معاشی نظامِ زندگی بھی اسی قانونِ اضداد کے تابع ہیں۔ ان میں بھی اسی طرح باہمی تصادم اور سلسلۂ تغیرات جاری و ساری رہتا ہے۔

ماؤزے تنگ نے انسانی فکر کے متعلق تو یہ کہا ہے لیکن خود انسان کے متعلق اس نے بصراحت کچھ نہیں کہا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ چونکہ اس کے نزدیک (بلکہ مادی تصورِ حیات کی رو سے) کائنات میں مادہ کے علاوہ کسی اور شے کا وجود ہی نہیں، اس لئے انسان کا شمار بھی اشیاء (THINGS) میں ہوتا ہے اسی لئے شاید اس کے متعلق کسی جداگانہ بحث کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ لہٰذا یوں سمجھنا چاہیئے کہ جو کچھ دیگر اشیاء کے ساتھ ہوتا ہے، وہی کچھ انسان کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ (یہ نکتہ بڑا اہم ہے۔ اسے خاص طور پر ذہن میں رکھئے۔)

ایک اہم استثناء

یہاں تک آپ نے دیکھ لیا کہ جدلیاتی فلسفہ کی رو سے، اشیائے کائنات ہوں یا انسانی فکر و تصورات، ان میں سے کوئی بھی غیر متبدل نہیں۔ ہر ایک تغیر پذیر ہے۔ لیکن خود یہ قانون (LAW OF CONTRADICTION) جس کی رو سے یہ تمام تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں، غیر متغیر اور غیر متبدل ہے۔ ماؤزے تنگ کے اپنے الفاظ میں۔

یہ ایک عالمگیر صداقت ہے جو زمان اور مکان کی حدود سے ماوراء ہے۔ اس میں کوئی استثناء نہیں ہو سکتی۔ یہ کائنات کا عمومی، ابدی اور غیر متبدل قانون ہے۔

دوسرے مقام پر ماؤزے تنگ نے اسے معروضی قانون (OBJECTIVE LAW) کہا ہے۔ یعنی ایسا قانون جو نہ اشیائے کائنات کا پیدا کردہ ہے نہ ذہنِ انسانی کی تخلیق ہے۔ بلکہ موجود فی الخارج ہے۔ چونکہ یہ قانون، تمام کائنات میں جاری و ساری ہے، اس لئے جب اسے موجود فی الخارج کہا جائے گا تو اس کا سرچشمہ لامحالہ کائنات (UNIVERSE) سے ماوراء قرار دیا جائے گا۔ اس نکتہ کا

ذہن میں رکھنا بھی ضروری ہے۔

علم کسے کہتے ہیں؟

ماوزے تنگ نے علم (KNOWLEDGE) کے متعلق کہا ہے کہ:

(۱) علم ذہنی عمل ہے جسے حواس کے ذریعے حاصل کیا جائے۔ اسے (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) کہا جاتا ہے۔

(۲) انسانی فکر چونکہ معاشرہ کے خارجی عناصر سے بھی متاثر ہوتی ہے، اس لئے کسی ایک زمانے میں انسان صداقت (TRUTH) کا صرف اضافی اور جزوی علم حاصل کر سکتا ہے۔ اس طرح انسان کا جزوی علم بڑھتے بڑھتے ایک دن حقیقی اور کلی علم بن جاتا ہے یعنی وہ صداقت مطلقہ (ABSOLUTE TRUTH) تک پہنچ جاتا ہے۔

صداقتِ مطلقہ سے مراد قوانینِ فطرت ہیں۔

(۳) یہ دیکھنے کے لئے، کہ انسان نے جو علم حاصل کیا ہے وہ صداقت ہے یا نہیں، اس علم کو عمل میں لانا ضروری ہے۔ اگر مثلاً اس کا نتیجہ وہی ہو جو اس کا دعوے ہے تو وہ علم سچا ہے، ورنہ جھوٹا اور غلط۔ یعنی علم کی صداقت کی پرکھ (PRAGMETIC TEST) کی رو سے ہو سکتی ہے۔

(۴) انسان کا جو عمل، قوانینِ فطرت کے مطابق ہوگا، وہی صحیح نتیجہ پیدا کر سکے گا۔

(۵) ظاہر ہے کہ اس طریق کی رو سے۔ انسان کوئی صداقت (TRUTH) یا قانون (LAW) بناتا نہیں۔ جو صداقتیں یا قوانین کائنات میں موجود ہیں، انہیں صرف دریافت (DISCOVER) کرتا ہے۔

(۶) مختصر الفاظ میں صداقت کے انکشاف کا طریقہ یہ ہے کہ ایک نظریہ (THEORY) کو عمل میں لایا جائے۔ اس سے جو نتیجہ مرتب ہو اسے پھر نظریہ (یا CONCEPT) تصور کر کے اس پر عمل کیا جائے۔ اس طرح ہر عمل کے بعد علم کی سطح بلند ہوتی جائے گی۔ اس طریق کار کو مسلسل جاری رکھا جائے ـــــ اور اس طرح انسان کی داخلی اور خارجی دنیا میں انقلاب پیدا کیا جائے۔ جو عناصر اس انقلاب کی راہ میں روک بن کر کھڑے ہوں گے، شروع شروع میں بہ جبر انہیں راستے سے ہٹایا جائے گا۔ لیکن رفتہ رفتہ ایسا مرحلہ آجائے گا جہاں دنیا کمیونزم کے نظام کو بطیب خاطر قبول کرے گی۔ داخلی انقلاب کے بغیر خارج میں کوئی انقلاب نہیں آسکتا۔ خارجی

عناصر اس پر اثر انداز ضرور ہوتے ہیں لیکن انقلاب کی اساس داخلی تبدیلی ہی ہوتی ہے۔
یہ ہے اس فلسفہ کی رو سے علم کا تصوّر اور علم و عمل کا باہمی تعلق۔

اس فلسفہ کا جائزہ

ہم نے دیکھا یہ ہے کہ فلسفۂ جدلیت کا بنیادی دعوےٰ یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے (THING) کے اندر دو متضاد عناصر ہر وقت مصروف جدل و پیکار رہتے ہیں اور اسی تصادم کے نتیجہ میں وہ شے کچھ عرصہ کے بعد بالکل نئی شے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک "شے" ایک جامع اصطلاح ہے جس میں غیر جاندار اشیاء، جاندار مخلوق، خود انسان، انسانی فکر اور انسانی تمدنی اور معاشی نظام سب شامل ہیں — جہاں تک غیر جاندار اشیاء یا (انسان کے علاوہ دیگر) جاندار مخلوق کا تعلق ہے، ان میں عمل نشو و نما کا سوال ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لئے ہم اس پر بحث نہیں کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ مادی اشیاء کی نشو و نما کے اصول و طریق کے سوال کا تعلق طبیعی علوم (PHYSICAL SCIENCES) سے ہے اسے فلسفہ کے دائرے میں آنا ہی نہیں چاہیئے (اگرچہ آجکل یہ رجحان بھی فروغ پا رہا ہے کہ طبیعی سائنس کی بنیاد بھی فلسفہ ہی پر رکھ دی جائے) بہر حال، یہ سوال ہمارے موضوع سے متعلق نہیں، اس لئے ہم اس پر تفصیلی بحث نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارا تعلق خود انسان سے ہے اور اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے سوال کو سامنے لانا چاہتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، انسان کے طریق نشو و نما کے متعلق، ماؤزے تنگ نے بصراحت الگ بحث نہیں کی۔ اس کے نزدیک جس اصول یا طریق عمل کا اطلاق اشیائے کائنات پر ہوتا ہے، اسی کے مطابق انسان کی نشو و نما بھی عمل میں آتی ہے۔ یا یوں کہیئے، کہ وہی قانون اضداد خود انسان پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

اس فلسفہ کی رو سے کہا یہ گیا ہے کہ

(۱) متضاد عناصر کے باہمی تصادم کا سلسلہ لامتناہی ہے۔

(۲) اس تصادم کے سلسلہ میں، ہر نئی شے جو وجود میں آتی ہے، پہلی شے سے بہتر اور ارفع ہوتی

ہے۔

(۳) اس قانونِ ارتقاء میں رجعت (واپس لوٹنا) نہیں۔ آگے بڑھنا ہی ہے۔

یہاں سے ایک اہم سوال سامنے آتا ہے۔ جامد مادہ، اس طریق جدلیت کی رو سے، رفتہ رفتہ پیکرِ انسانی میں تبدیل ہو گیا۔ اس میں نئی چیز اس کی فکر اور شعور ــــ بلکہ شعور خویش (SELF-CONSCIOUS-NESS) ــــ ہے۔ اس لحاظ سے، یہ سابقہ کڑیوں سے بلند اور اعلیٰ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جدلیت کے لاانتہای سلسلہ کی رو سے، اس کے بعد، کیا ہو گا؟ ــــ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ موت کے بعد انسانی جسم، بے جان مادہ رہ جاتا ہے۔ جو کچھ عرصہ کے بعد منتشر (DE-COMPOSE) ہو کر مختلف کیمیائی اجزاء میں تبدیل ہو جاتا ہے ــــ لوہا، چونا، فاسفورس وغیرہ۔ اگر انسان اسی جسم کا نام تھا تو اس کی یہ تبدیلی، اسے آگے لے جانے کے بجائے، جامد مادہ کی اسی پہلی کڑی میں لے گئی جہاں سے سلسلۂ ارتقاء کی ابتدا ہوئی تھی۔ یہ ارتقاء نہیں، رجعت ہے اور رجعت بھی ایسی کہ جدلیت کی کشمکش نے جو منازل ہزارہا سال میں طے کئے تھے، موت کی ایک ضرب کاری نے ان سب کو خاک میں ملا کر رکھ دیا اور بات جہاں سے چلی تھی پھر وہیں پہنچ گئی۔ قرآن کی مثال میں، بڑھیا نے جو سوت دن بھر کی محنت سے کاتا تھا، شام کو اسے خود اپنے ہی ہاتھوں سے تار تار کر کے رکھ دیا۔ اور دوسرے دن پھر وہ چرخہ لے کر بیٹھ گئی۔

اگر یہ کہا جائے کہ موت سے ایک فرد کا تو خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن نوعِ انسانی (HUMAN Species) باقی رہتی ہے ــــ مرنے والا، اپنے جیسا انسان پیدا کر دیتا ہے ــــ تو اس سے بھی اس فلسفہ کی تغلیط ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس سے وہ شے (یعنی انسان) کسی دوسری شے میں تبدیل نہیں ہوتی۔ ویسے کی ویسی ہی رہتی ہے۔ لہٰذا، یہ ترقی (PROGRESS) نہیں۔ اعادہ (REPETITION) ہے۔ یہ خطِ مستقیم پر آگے بڑھنا نہیں، ایک دائرہ کے چکر میں گھومنا ہے۔

دوسرے یہ کہ ایک فرد، بجائے خویش ایک "شے" ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس فرد میں کیا تبدیلی آتی ہے؟ ــــ فلسفۂ اضداد کی رو سے، اسے اپنی موجودہ ہیئت سے مختلف اور ارفع صورت میں تبدیل ہونا چاہیئے۔ نسلِ انسانی کی بقا سے وہ فرد تو باقی نہیں رہتا، نہ ہی کسی اعلیٰ پیکر میں تبدیل ہوتا ہے۔ اس کا جسم مادی اجزاء میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس طرح اس کا بہ حیثیتِ فردِ انسانیہ، خاتمہ ہو جاتا ہے۔

دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ وہ کون سے دو متضاد عناصر ہیں جو ایک فرد میں باہمد گر مصروفِ پیکار

رہتے ہیں؟ —— یہ ٹھیک ہے کہ جسم انسانی کے اندر، ہرآن تعمیر و تخریب (ANABOLISM & KATABOLISM) کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس کے پرانے جرثومے (CELLS) ہر وقت فنا، اور ان کی جگہ نئے جرثومے وجود پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اس سے اس کا جسم ہرآن ایک نئے جسم میں تبدیل ہوتا رہتا ہے، حتیٰ کہ کچھ عمر کے بعد وہ ایک بالکل نیا جسم بن جاتا ہے۔ لیکن یہ سلسلۂ تصادم تو موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ اس سے آگے نہیں چلتا — اور فلسفۂ جدلیت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ سلسلۂ تصادم لامتناہی ہے۔ لہٰذا انسان اگر عبارت ہے اس کے طبیعی جسم سے تو اس سے اس فلسفہ کی ساری عمارت نیچے آگرتی ہے۔

اگر انسان کے اندر یہ تصادم، اس کے جرثوموں کا نہیں، تو پھر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ وہ کون سے دو متضاد عناصر ہیں جن میں ہرآن کشمکش جاری رہتی ہے۔ ان میں سے ایک عنصر اس کا جسم ہے جو ہمارے سامنے ہے، دوسرے عنصر کو جسم کی ضد (OPPOSITE) ہونا چاہیئے۔ وہ کیا ہے؟ پھر ان دونوں میں سے اس وقت کونسا عنصر غالب یا بنیادی (PRINCIPAL) ہے اور کونسا مغلوب یا ثانوی (SECONDARY)۔ اور جب، کچھ عرصہ کے بعد، ان عناصر میں باہمی تبادلہ ہو جائے گا یا ایک عنصر ختم ہو جائیگا تو انسان کیا بن جائے گا۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ وہ اس وقت بنے گا اس کی نوبت موت کے بعد ہی آئے گی۔ اس سے واضح ہے کہ (فلسفۂ جدلیت کی رُو سے بھی) موت سے انسان کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ اس کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔

یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب فلسفۂ جدلیت یا ماؤزے تنگ کی فکر سے نہیں ملتا۔

دوسرا اہم نکتہ

فلسفۂ جدلیت کی رُو سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ کائنات میں ایک ایسی شے بھی ہے جو ——

(۱) خود اشیاء کے اندر موجود نہیں۔

(۲) عمل تضاد و تصادم کی پیدا کردہ نہیں۔

(۳) ازلی وابدی اور غیر متبدل ہے۔

(۴) ذہن انسانی کی پیدا کردہ نہیں۔

(۵) موجود فی الخارج ہے۔

(۶) عالمگیر حقیقت اور صداقت مطلقہ ہے۔

(۷) ذہنِ انسانی صرف اس کا انکشاف کرسکتا ہے، اس کی تخلیق نہیں کرسکتا۔

اور یہ شے ہے خود قانونِ اضداد (LAW OF CONTRADICTION)

مادی فلسفۂ حیات کی رُو سے اس قسم کی شے کا وجود ناممکنات میں سے تھا۔ لیکن جب اس کے وجود کا امکان تسلیم کر لیا گیا ہے، تو پھر اگر کوئی یہ کہے کہ اس قسم کا صرف ایک قانون (قانونِ اضداد ہی نہیں، اور بھی کئی قوانین ایسے ہیں، تو اس فلسفہ کے حامیوں کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ایسے قوانین سے انکار کریں۔ یا اس تصور کے خلاف اعتراض کریں۔ اگر کوئی شخص خود اس معیار کے مطابق جو فلسفۂ جدلیت کے حامی کسی دعوے کی صداقت کو پرکھنے کے لئے تجویز کرتے ہیں۔ یعنی (PRAGMATIC TEST) کی رُو سے کسی اور قانون کو بھی صحیح ثابت کردے، تو ان حضرات پر لازم آئے گا کہ اس قانون کو بھی مطلق حقیقت (ABSOLUTE TRUTH) تسلیم کریں۔ یہ ان کے اپنے دعوے کا منطقی نتیجہ ہے۔

تیسرا نکتہ ماؤزے تنگ نے اپنے "اقوال" میں ایک جگہ کہا ہے کہ

کمیونزم تاریخ انسانیت میں، مکمل ترین، ترقی پذیر، انقلابی اور معقول نظام ہے۔

یہ تصور فلسفۂ اضداد کے خلاف ہے۔ اس فلسفہ کی رُو سے کوئی شے، کوئی تصور، کوئی نظام کسی وقت بھی مکمل نہیں ہوتا۔ وہ تغیر پذیر ہوتا ہے اور ہر آن بدلتا رہتا ہے اور تغیرات کا یہ عمل لامتناہی ہوتا ہے۔

چوتھا نکتہ ماؤزے تنگ نے یہ بھی لکھا ہے کہ

ملوکیت یا استعماریت کا نظام اب، زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا کیونکہ یہ شرانگیز کام (EVIL THINGS) کرتا ہے۔

یہ خیال بھی فلسفۂ اضداد کے خلاف ہے۔ اس فلسفہ کی رُو سے، کسی نظام کے باقی رہنے یا مٹنے کا یہ اصول نہیں، کہ جو نظام، تعمیری کام کرے گا وہ باقی رہے گا اور جو تخریبی کام کرے گا، مٹ جائے گا۔ اس فلسفہ کی رُو سے، اضداد کا قانون از خود کارفرما ہے۔ اس کے مطابق، ایک نظام وجود میں آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی ضد، دوسرا نظام موجود ہوتا ہے۔ ان دونوں میں باہمی تصادم ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد مغلوب نظام غالب آجاتا ہے۔ اس کے بعد، پھر یہ چکر جاری ہوجاتا ہے۔ نہ ہی کوئی نظام اس لئے وجود میں آتا ہے

کہ اُس نے اچھے کام کئے تھے، نہ ہی وہ اس لئے مٹتا ہے کہ کہ اس سے خراب کام سرزد ہوئے تھے ـــ وہ نظام کیسا ہو اور خواہ کسی قسم کے کام کرے، اسے اپنی باری پر بہرحال، مٹنا ہے ـــ تاریخی وجوب یا قانون اضداد کی اندھی قوتیں، نہ اچھے کو دیکھتی ہیں نہ بُرے کو ـــ انہوں نے تو ایک کو مٹانا ہے اور اس کی جگہ اس کی ضد دوسرے کو لانا ۔۔ انسان ہزار چاہے اور اس کے لئے لاکھ کوشش کرے کہ اچھا نظام مٹے نہیں قائم رہے وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ تغیرات لانے والی یہ قوتیں انسان کے نفع یا نقصان کی پرواہ ہی نہیں کرتیں۔ انسان، ان کی گردش دولابی کی مشین میں ایک بےبس پرزے کی طرح ہے کہ جس قسم کا نظام وہ لائے، یہ اس کے تابع زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں مارزے تنگ کا پیش کردہ قانونِ اضداد ـــ اس قانون کا جو تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اس سے مقصود نکتہ چینی نہیں ـــ یہ قرآنی فلسفۂ حیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ کے لئے ناگزیر تھا۔

باب دوم

قرآنی فلسفۂ حیات

کائنات کے متعلق جو فلسفہ (یا تصور)، قرآن کریم پیش کرتا ہے، وہ ایک حد تک فلسفۂ جدلیت کے دوش بدوش چلتا ہے۔ لیکن جو اسقام فلسفۂ جدلیت میں ہیں، قرآنی تصور ان سے مبرا ہے۔ اور جس مقام پر وہ فلسفہ رک جاتا ہے، قرآنی تصور انسان کو اس سے آگے لے جاتا ہے۔ آئندہ صفحات میں قرآنی تصور کو مختصر الفاظ میں پیش کیا جائے گا۔ یہ بحث حسب ذیل گوشوں میں منقسم ہوگی۔

۱ـــ قرآن کا انداز افہام و تفہیم۔

۲ـــ تخلیق کائنات۔

۳ـــ انسان کی تخلیق۔

۴۔ انسانی زندگی کی کشمکش۔

۵۔ قانونِ اضداد

۶۔ کائنات میں غیر متبدل کیا ہے۔

۷۔ مستقل اقدار۔

۸۔ کشمکش حق و باطل۔

۹۔ اضداد میں توافق۔

۱۰۔ علم کا تصور۔

۱۔ قرآن کا طریق افہام و تفہیم

قرآنِ کریم کا ایک انداز افہام و تفہیم یہ ہے کہ وہ ایک شے یا نظریہ کی ضد کو اس کے سامنے لا کر اس کی وضاحت کرتا ہے۔ مثلاً ۔۔ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۔۔ اندھا اور آنکھوں والا کبھی برابر نہیں ہوسکتے ۔۔ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ ۔۔ نہ ہی تاریکی اور روشنی ایک جیسی ہوسکتی ہے ۔۔ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ ۔۔ نہ ہی دھوپ اور سایہ یکساں ہوسکتے ہیں۔ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ۔ (۳۵/۱۹-۲۲)۔ نہ ہی مُردے اور زندہ برابر ہو سکتے ہیں۔ اسی نظریات اور تصورات کے سلسلہ میں وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر، ہدایت کے مقابلہ میں ضلالت۔ حق کے مقابلہ میں باطل، کلمۂ طیبہ کے مقابلہ میں کلمہ خبیثہ لا کر اپنے مطالب و معانی کی وضاحت کرتا ہے (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ۔۔ ماوزے تنگ اسی قسم کی مثالیں پیش کرنے کے بعد کہتا ہے کہ ان متضاد اشیاء میں سے ایک کے بغیر دوسرے کا وجود نہیں ہوتا) لیکن قرآنِ کریم ان اضداد کو معانی و مطالب کی وضاحت کے لئے پیش کرتا ہے۔ وہ یہ تصور پیش نہیں کرتا کہ یہ متضاد اشیاء از خود ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ یہ تصور درحقیقت مجوسیت (MAGISM) نے پیش کیا تھا۔ قرآنِ کریم نے اپنے آپ کو كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ (۳۹/۲۳) کہا ہے۔ یعنی وہ کتاب جس کی تعلیم شروع سے آخیر تک، مربوط اور آپس میں ملتی جلتی ہے۔ اس میں کہیں تخالف نہیں، تضاد نہیں،

لیکن یہ اپنے مفہوم کی وضاحت، متضاد اشیاء کو ایک دوسرے کے بالمقابل لا کر کرتی ہے (تصادم اور ٹکراؤ کے متعلق ہم آگے چل کر بات کریں گے)۔

قرآن کریم اشیائے فطرت کے اختلاف کو مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ (نشانات خداوندی) میں شمار کرتا ہے مثلاً وہ کہتا ہے کہ — اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّھَارِ .... لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ — (۲/۱۶۴)۔ یعنی تخلیق ارض و سما اور اختلاف لیل و نہار میں ان لوگوں کے لئے نشاناتِ راہ ہیں جو عقل و فکر سے کام لیتے ہیں۔ دوسرے مقام پر ہے۔

وَ مِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَ اَلْوَانِکُمْ (۳۰/۲۲)۔

ارض و سما کی تخلیق اور انسانوں کے رنگ اور زبان کا اختلاف بھی آیاتِ خداوندی میں سے ہے۔

لیکن وہ نسلوں اور زبانوں کے اس اختلاف کے باوجود، تمام نوعِ انسانی کو، آئیڈیالوجی کے اشتراک کی بنا پر ایک برادری (امت واحدہ) بنانا چاہتا ہے۔ یہ ہے اس کے نزدیک توافق اضداد (UNITY - OF OPPOSITES) کا طریق۔

۲۔ تخلیقِ کائنات

عملِ تخلیق کے متعلق قرآنِ کریم کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ کائنات کو بیک جنبش، مکمل شکل میں پیدا نہیں کر دیا گیا۔ بلکہ یہ بتدریج، عملِ ارتقاء کی رُو سے تکمیل تک پہنچ رہی ہے۔ واضح رہے کہ عربی زبان (اور خود قرآنِ کریم کی رو سے) ایک عمل ہے فطرؔ کا اور دوسرا ہے خلقؔ کا۔ فطر کے معنی ہیں کسی شے کو پہلی بار عدم سے وجود میں لانا۔ اور خلقؔ کے معنی ہیں' مختلف عناصر میں توازن و ترتیب سے نئی نئی چیزیں پیدا کرنا۔ (یہ لفظ عام طور پر انہی معانی میں استعمال ہوتا ہے اگرچہ بعض اوقات اسے فطر کے مفہوم میں بھی استعمال کر لیا جاتا ہے) خدا کے عملِ فطرت کے متعلق تو قرآن کریم کوئی تشریح پیش نہیں کرتا کیونکہ "عدم سے وجود میں آنے" کا سوال، انسان کے شعور کی موجودہ سطح پر، اس کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ لیکن عملِ تخلیق

کے متعلق وہ وضاحت سے بات کرتا ہے[1]۔ وہ کہتا ہے کہ۔۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ۔۔ ایک شے کی تخلیق کی اسکیم، عالمِ امر کی بلندیوں میں طے پاتی ہے۔ پھر اس اسکیم کا عملی آغاز زمین کی پست ترین سطح سے ہوتا ہے۔ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ○ (۳۲/۵)۔ اس نقطۂ آغاز سے وہ، بتدریج بلندیوں کی طرف ابھرتی ہے تاکہ اس اسکیم کے مطابق اپنی تکمیل تک پہنچ جائے۔ یہ تدریجی مراحل وہ "ایک ایک دن" میں طے کرتی ہے جس کی مقدار تمہارے حساب و شمار سے، ہزار ہزار سال کی ہوتی ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں پچاس پچاس ہزار سال کی۔ (۷۰/۴)۔

ان تخلیقی مدارج کے متعلق وہ دوسری جگہ کہتا ہے کہ۔۔ وَالَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ○ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۔ (۸۷/۲-۳)۔۔ خدا وہ ہے جو اشیاء کی کائنات کی تخلیق کا آغاز کرتا ہے۔ ان میں سے حشو و زوائد کو الگ کر کے، انہیں ایک خاص اعتدال پر لاتا ہے۔ پھر ان کا ایک مقامِ تکمیل (DESTINY) مقرر کرتا ہے اور اس مقام تک پہنچنے کے لئے انہیں راستہ دکھا دیتا ہے۔ اسی عمل ارتقا کو اس نے دو لفظوں میں یوں بیان کیا ہے

اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ (۱۰/۴)

خدا وہ ہے جو ہر شے کی تخلیق کا آغاز کرتا ہے۔ پھر اسے گردشیں دیتا ہوا مختلف مراحل میں سے گزارتا ہے۔

مثلاً اس نے زمین اور اجرام فلکی کے تخلیقی مراحل کے متعلق کہا ہے کہ

۱۔۔ یہ تمام اجرام، ابتداءً ایک ہیولیٰ (NEBULAE) کی شکل میں ایک ہی تھے۔ پھر الگ الگ ہوئے۔ (۲۱/۳۰)۔

---

[1] اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآنِ کریم کوئی سائنس کی کتاب نہیں کہ وہ طبیعی امور کے متعلق تفصیلی گفتگو کرے۔ اس کا موضوع انسانی زندگی کے مسائل کو سلجھانے کے لئے راہ نمائی عطا کرتا ہے۔ وہ طبیعی امور کے متعلق محض ضمناً بات کرتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ اس خدا کی طرف سے ہے جو خالقِ کائنات ہے اس لئے ہو نہیں سکتا کہ وہ ضمناً بھی کسی بات کے متعلق کچھ کہے تو وہ حقیقت کے خلاف ہو۔

۲۔ یہ ہیولے گیس کی شکل میں تھا۔ (۴۱/۱۱)۔

۳۔ زمین اس ہیولے سے یوں الگ ہوئی جیسے گوپیے سے پتھر پھینکا جاتا ہے۔ (۷۹/۴۹)۔

۴۔ ان اجرام کو چھ مختلف مراحل میں سے گذارا۔ (۱/۳)

۵۔ زمین بھی اس ہیولیٰ سے الگ ہونے کے بعد، دو مراحل میں سے گزر کر اس قابل ہوئی کہ اس پر زندگی کی نمود ہو سکے۔ (۴۱/۹)۔

۶۔ زندگی کی نمود پانی سے ہوئی۔ (۲۱/۳۰)۔ اور اس طرح بتدریج، جانداروں کی تخلیق ہوئی ــــ یعنی رینگنے والے، دو پاؤں پر چلنے والے، چار پاؤں پر چلنے والے۔ (۲۴/۴۵)۔

اس تمام عمل (PROCESS) میں خدا کی ربوبیت کارفرما ہوتی ہے۔ ربوبیت کے معنی ہیں ایک شئے کو اس کے نقطۂ آغاز سے بتدریج مقام تکمیل تک پہنچنے کے لئے سامان نشوونما عطا کرنا۔ ان مراحل میں سے گذرتی ہوئی ایک شئے، کچھ وقت کے لئے ایک مقام میں ٹھہرتی ہے۔ اس کے بعد وہ اگلی منزل کی طرف چل دیتی ہے۔ قرآن کریم نے اسے، ان اشیاء کا "مستقر و مستودع" کہہ کر پکارا ہے (۶/۹۸) یعنی کسی شے کی عارضی قرارگاہ اور اس کے بعد وہ اگلی منزل" جس کے سپرد اس امانت کو کر دیا جائے"۔ اس نئی منزل میں پہنچ کر وہ شے، کچھ اور ہی بن جاتی ہے۔ اسے وہ، اس شئے کی نشاۃ الآخرۃ سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی اس کی دوسری پیدائش۔ سورۂ عنکبوت میں ہے۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۲۹/۲۰)۔

ان سے کہو کہ دنیا میں چلو پھرو۔ اور دیکھو کہ خدا کس طرح ایک شے کی تخلیق کا آغاز کرتا ہے۔ اور پھر اسے کس طرح ایک نئی (دوسری پیدائش) عطا کرتا ہے۔ یہ سب کچھ ان پیمانوں کے مطابق ہوتا ہے۔ جو اس نے اشیائے کائنات کے لئے مقرر کر رکھے ہیں اور جن پر اسے پورا پورا کنٹرول حاصل ہے۔

یہ تغیر کائنات کی ہر شے میں ہر آن رونما ہوتا رہتا ہے ــــ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۔ (۵۵/۲۶) کائنات کی ہر شے، ہر آن تغیر پذیر ہوتی رہتی ہے۔ اور ہر نئے مرحلہ میں اس کی نشوونما کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں اور خدا کی صفت ربوبیت اس کے تقاضوں کے مطابق سامان نشوونما عطا کئے جاتی ہے يَسْئَلُهُ مَنْ

فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ۔ (۵۵/۲۹)۔ کائنات کی ہر شے ہر آن، ایک نئی ہیئت میں ہوتی ہے اور اپنی نشو و نما کے لئے خدا کی شانِ ربوبیت کی محتاج۔ یوں وہ شے نشو و نما پاکر ایک نئی شے بن جاتی ہے۔ اس طرح کائنات میں نت نئے تخلیقی اضافے ہوتے رہتے ہیں۔

يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (۳۵/۱)۔

وہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق مخلوق میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔

غالب کے الفاظ میں۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز؛
رہتا ہے آئینہ ابھی دائم نقاب میں

ان تخلیقی تبدیلیوں کے سلسلہ میں وہ یہاں تک بھی کہتا ہے کہ اس طرح یہ تمام کارگہ کائنات رفتہ رفتہ، ایک اور قالب میں ڈھل جائے گی۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ۔ (۱۴/۴۸)

جس مرحلہ میں یہ ارض کسی اور ارض میں تبدیل ہو جائے گی اور اسی طرح سماوات بھی۔[1]

اس لئے کہ هُوَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ۔ (۱۷/۹۹)۔ وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اس کائنات کی مثل دوسری کائنات بنا دے؛

لیکن جس طرح یہ سلسلۂ کائنات ازلی نہیں یعنی ایسا نہیں کہ اس کی ابتدا کوئی نہ ہو، اسی طرح یہ ابدی بھی نہیں کہ اس کی انتہا کوئی نہ ہو۔ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى۔ (۳۵/۱۳)۔ یہ سلسلہ ایک نشان کردہ مدت تک کے لئے رواں دواں چل رہا ہے۔

ان اشیاء میں سے جو شے (خارجی اثرات کے تابع) آگے بڑھنے کی صلاحیت کھو دیتی ہے۔ اسکی

---

[1] اس تبدیلی سے مراد وہ عالمگیر انقلاب عظیم بھی ہو سکتا ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہ عالمِ انسانیت میں رونما ہوگا۔ اور کائنات کی طبیعی تبدیلی بھی۔

ترقی رُک جاتی ہے پھر وہ یا تو معدوم ہو جاتی ہے اور یا اسی مقام پر گردش کرتی رہتی ہے۔ جس طرح آم کی گٹھلی سے اسی طرح آم کا درخت پیدا ہو جاتا ہے، بکری اپنے جیسا بچہ پیدا کر دیتی ہے۔ یہ گردشِ دولابی (REPETITION) یا تولید (REPRODUCTION) ہے۔ ارتقاء (آگے بڑھنا) نہیں۔

۳۔ انسان کی تخلیق

انسان بھی کائنات ہی کا ایک جزو ہے۔ اس لئے ایک خاص منزل تک یہ بھی اپنی تخلیقی مراحل میں سے گزرتا ہے جن سے دیگر اشیائے کائنات اور جاندار مخلوق گذرتی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ۔ (۳۲/۷)۔ انسانی تخلیق کی ابتدا بے جان مادہ (INORGANIC - MATTER) سے ہوئی۔ جامد مادہ میں، زندگی کی نمود نہیں ہوتی۔ لیکن جب اس میں پانی کی آمیزش ہوتی ہے، تو حیاتِ خوابیدہ، آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھتی ہے۔ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ۔ (۲۱/۳۰) ہر شے کو زندگی پانی سے عطا ہوئی ہے۔ مٹی اور پانی کے امتزاج سے (جسے قرآن نے طین لازب کہا ہے یعنی چپچپی مٹی) زندگی کا اولین جرثومہ (LIFE - CELL) وجود میں آیا جس میں نر و مادہ کا امتیاز نہیں تھا۔ یعنی زندگی کا آغاز (UNI - CELLULAR) طریق سے ہوا۔ اسے قرآن نے، "نفسِ واحدہ" سے تعبیر کیا ہے۔ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ۔ (۴/۱)۔ "خدا نے تمہیں نفسِ واحد سے پیدا کیا" یہ جرثومۂ حیات، جوشِ نمو سے پھٹ کر دو ٹکڑوں (SISTER CELLS) میں تقسیم ہو گیا اور یوں نر و مادہ کی تفریق و تمیز وجود میں آگئی — وَ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا۔ (۴/۱)۔ "اور اس طرح اس جرثومۂ واحدہ سے اس کا جوڑا پیدا کیا"

قرآنِ کریم نے "جوڑے" کے لئے لفظ "زوج" استعمال کیا ہے۔ اس کے معنی ایسے جوڑے کے ہیں جس کے ایک جزو کے بغیر دوسرے جزو کی تکمیل نہ ہو سکے۔ یعنی وہ دونوں اجزاء ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود، ایک دوسرے کی تکمیل کا موجب (COMPLEMENTARY TO EACH OTHER) ہوتے ہیں۔ یہ جوڑے صرف جانداروں میں نہیں، ہر شے میں ہوتے ہیں۔ وَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا۔ (۴۳/۱۲)۔ اُس نے ہر شئے کے جوڑے پیدا کئے جو ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی

تسکین کا باعث ہیں۔

مختلف اشیائے کائنات میں، ازواج کا اختلاط کس طرح ہوتا ہے؟ یہ سوال ہمارے زیرِ نظر موضوع سے خارج ہے۔ جہاں تک انسانی تخلیق کا تعلق ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ (دیگر حیوانات کی طرح) نر اور مادہ (عورت اور مرد) کے جنسی اختلاط سے، رحمِ مادر میں انسانی بچے کی تخلیق کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ بچہ (جنین) ۔۔۔ دیگر حیوانات ہی کی طرح ۔ رحم میں مختلف منازل سے گزرتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ۔ استقرارِ حمل کے بعد۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً یہ جرثومہ آہستہ آہستہ کچھ لٹکنے والی سی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔۔ فَجَعَلْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً۔ پھر وہ گوشت کا لوتھڑا سا بن جاتا ہے ۔۔ فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا۔ پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچہ سا ابھر آتا ہے۔ فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا۔ پھر اس ڈھانچے پر گوشت کی تہ سی چڑھ جاتی ہے۔ (۲۳/۱۲ ـــ ۱۴)

یہاں تک انسان اور دیگر حیوانات کے بچے یکساں مراحل سے گذرتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ایک مقامِ امتیاز آجاتا ہے جو درحقیقت مادی تصورِ حیات اور قرآنی نظریۂ زندگی کا نقطۂ تفریق ہے۔ اس سے ان کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر قرآن نے کہا ہے کہ

ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (۲۳/۱۴)

پھر ہم اسے ایک نئی مخلوق بنا دیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ وہ کون سی تبدیلی ہے جس سے انسان، دیگر حیوانات سے مختص اور متمیز ہو کر ایک "نئی مخلوق" بن جاتا ہے؟ اس کے متعلق قرآن نے کہا ہے۔ کہ

وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (۳۲/۹)

اس میں خدا اپنی روح (توانائی) کا ایک شمہ ڈال دیتا ہے۔

یہ الوہیاتی توانائی (DIVINE ENERGY) ہے جس کے اضافہ سے انسان، دیگر مخلوقات سے بالکل الگ اور ممتاز مخلوق بن جاتا ہے۔ یہ "نفخ روحِ خداوندی" انسان کے علاوہ کسی اور مخلوق کے حصے میں نہیں آیا۔ اسی کو انسانی ذات (HUMAN - PERSONALITY) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہی ہے، جسے "میں" کہا جاتا ہے۔ یہ أنا (I - AM - NESS) ہے جو اس حیوان کو انسان میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اسی کے احساس کو شعورِ خویش (SELF - CONSCIOUSNESS) کہا جاتا ہے۔ اسی سے

انسان اپنے ہر ارادہ، فیصلہ اور عمل کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ اسی سے یہ اس قابل ہوتا ہے کہ اسے "تو" کہہ کر پکارا جائے۔ اس تبدیلی کو قرآن کریم نے بڑے، بلیغ، لطیف اور حسین انداز سے بیان کیا ہے، وہ انسانی تخلیق کے مختلف مراحل کا ذکر کرتے ہوئے، اسے صیغۂ واحد غائب (THIRD PERSON) سے پکارتا چلا جاتا ہے۔ (خَلَقَهُ نَسْلَهُ سَوّٰهُ)۔ لیکن اس کے بعد، جب اس میں "نفخ روح" ہو جاتا ہے تو اس صیغۂ غائب کو یک لخت صیغۂ مخاطب (SECOND PERSON) میں تبدیل کر کے کہتا ہے۔

وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـئِدَةَ۔ (۳۲/۹)

پھر خدا نے تمہیں سماعت و بصارت اور قلب عطا کر دیئے۔

یعنی اس طرح وہ مخلوق (انسان) اس قابل ہو جاتی ہے کہ اسے "تو" کہہ کر پکارا جائے۔

یہ ہے وہ مقام جہاں مادی تصور حیات اور قرآنی نظریۂ تخلیقِ انسانی میں وہ فرق نمودار ہوتا ہے جس کے بعد ان کے راستے بالکل الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ مادی تصورِ حیات کی رو سے، انسان محض اس کے طبیعی جسم سے عبارت ہے۔ طبیعی قوانین کے مطابق دیگر حیوانات کی طرح اس کی پیدائش ہوتی ہے۔ طبیعی قوانین کے ماتحت اس کی نشو و نما ہوتی ہے اور جب طبیعی قوانین کے ماتحت اس کے جسم کی مشینری حرکت کرنے سے رک جاتی ہے تو اسے موت آجاتی ہے اور یوں اس فرد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

لیکن قرآن کہتا ہے کہ "نفخِ روحِ خداوندی" کے بعد جب انسان، ایک خلق جدید (نئی مخلوق) میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس میں ایک ایسی شے کی نمود ہو جاتی ہے جو نہ طبیعی قوانین کی پیدا کردہ ہے، نہ طبیعی قوانین کے مطابق اس کی نشو و نما ہوتی ہے اور نہ ہی جسم کی موت کے ساتھ اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ وہ انسان کی موت کے بعد زندہ رہتی اور زندگی کے مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کے لئے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

وَ قَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا (۱۴/۷۱)

خدا نے تمہیں مختلف مدارج میں سے گذارتے ہوئے پیدا کیا۔

ان مدارج و مراحل میں، ہر نیا درجہ اور مرحلہ، سابقہ درجہ اور مرحلہ سے بلند تھا۔ یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو سکتا۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ۔ (۸۴/۱۹)

تم اسی طرح طبقاً طبقاً، درجہ بدرجہ بلند ہوتے چلے جاؤ گے۔

موت سے تمہارے جسم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ تمہارا نہیں۔ تم ایک نئی زندگی (فِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ۳۲) میں داخل ہو جاتے ہو۔ موت تو اس بات کا ٹسٹ (TEST) کرنے کے لئے ہے کہ تم میں آگے بڑھنے کی کس قدر صلاحیت پیدا ہو چکی ہے۔

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۚ (۶۷)

موت اور حیات اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ اس کا ٹسٹ ہو جائے کہ تم نے اپنے اعمال سے اپنے اندر کس قدر حسن و توازن پیدا کر لیا ہے۔

تم سمجھتے ہو کہ جب جسم انسانی کے اجزاء منتشر ہو کر پھر سے لوہا اور پتھر بن گئے تو انہیں حیات نو کس طرح مل سکتی ہے؟ یہ تمہاری بھول ہے۔ ان اجزاء سے تمہارا جسم مرکب تھا۔ "تم" ان کے مجموعہ یا امتزاج کا نام نہیں تھے۔ اس لئے جسم کے پھر سے بے جان مادہ بن جانے سے "تم" فنا نہیں ہو جاتے۔

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ

(۵۰-۵۱/۱۷)

ان سے کہو کہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا، یا کوئی اور شے، جس کے متعلق تمہارے ذہن میں ہو کہ اس کا زندہ ہونا ناممکن ہے۔

اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ تم ایک ایسی "نئی مخلوق" بن چکے ہو جو طبیعی قوانین کی زد میں نہیں آتی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مادی جدلیت کا پیش کردہ نظریہ یہ ہے کہ بے جان مادہ، عمل ارتقاء سے بڑھتا بڑھتا پیکر آدمیت تک آ گیا۔ اب اس کے بعد، ارتقاء کی بجائے رجعت ہو گی۔ انسان، مرنے کے بعد، پھر انہی اجزاء میں تبدیل ہو جائے گا۔ جن کے ارتقاء سے وہ اس مقام تک پہنچا تھا۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ ارتقاء میں رجعت ہو ہی نہیں سکتی۔ زندگی کی ندی کا جو پانی آگے بڑھ گیا وہ لوٹ کر پیچھے نہیں آ سکتا۔ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ اس زندگی میں جن لوگوں کی انسانی صلاحیتوں کی صحیح نشو و نما نہیں ہوئی ہو گی وہ مرنے کے وقت کہیں گے کہ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ۔ اے میرے نشو و نما دینے والے! زندگی کے دھارے کا رخ ایک بار پیچھے کی طرف موڑ دے، کہ جو مواقع میں نے پہلے کھو دیئے تھے وہ پھر حاصل ہو جائیں، تو میں ایسے کام کروں جن سے میری صلاحیتوں کی نشو و نما ہو جائے۔ اس کے جواب میں کہا جائے گا — كَلَّا (۹۹-۱۰۰/۲۳) نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔

زندگی کا دھارا پیچھے کی طرف نہیں لوٹا کرتا۔ عملِ ارتقا میں رجعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں یا آگے بڑھنا ہے یا ایک مقام پر رُک جانا۔ پیچھے مڑنا نہیں۔ (آگے بڑھنے کا نام، قرآن کی اصطلاح میں جنت کی زندگی ہے۔ رُک جانے کا نام جہنم۔ اور یہ سلسلۂ ارتقا، جنت کی زندگی میں بھی بدستور جاری رہتا ہے۔ (ان نکات کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔ اس لئے اس وقت انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے)۔

آپ نے غور کیا کہ جس مقام پر آکر فلسفۂ اضداد رُک ہی نہیں جاتا بلکہ اس کی تمام عمارت نیچے گر جاتی ہے۔ قرآن کریم اس مقام سے انسان کو کس طرح آگے لے جاتا ہے۔

۴- انسانی زندگی کی کشمکش

جس طرح انسانی بچہ کو اس کا جسم اور جسمانی صلاحیتیں، نشو و نما یافتہ (DEVELOPED) شکل میں نہیں ملتے۔ ان کی نشو و نما ہوتی ہے۔ اسی طرح اسے انسانی ذات بھی نشو و نما یافتہ شکل میں نہیں ملتی۔ اس کی بھی نشو و نما ہوتی ہے۔ انسانی جسم کی پرورش ہو یا اس کی ذات کی نشو و نما، یہ اضداد کے تصادم (CONTRADICTIONS) کی رو سے ہوتی ہے جسم انسانی میں یہ تصادم، زندگی کے جرثوموں کے ہر آن فنا ہونے اور نئے جرثوموں کے وجود پذیر ہونے رہنے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ زندگی، صحت بیماری، موت، اسی کشمکش کے مظاہر ہیں۔

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ انسانی ذات کی نشو و نما کن متضاد عناصر کے تصادم سے ہوتی ہے۔ یہ سوال غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔

جس طرح انسانی جسم کی پرورش کے لئے کچھ قوانین ہیں اسی طرح انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے بھی کچھ قوانین وضوابط ہیں۔ انسانی جسم کی پرورش سے متعلق قوانین کو قوانین فطرت (LAWS-OF NATURE) کہا جاتا ہے۔ اور انسانی ذات کی نشو و نما سے متعلق قوانین کو مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہتے ہیں۔ یہ اقدار بھی قوانین فطرت کی طرح، غیر متبدل اور عالمگیر ہیں۔ ان اقدار کا تفصیلی ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا۔ اس وقت صرف ایک بنیادی قدر کو مثالاً پیش کیا جاتا ہے۔

جسمِ انسانی کی پرورش ہر اُس شے سے ہوتی ہے جسے انسان خود استعمال کرتا ہے۔ (مثلاً کھانا، پینا وغیرہ) اس کے لئے ہر فرد کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ سامانِ رزق اپنے لئے سمیٹتا چلا جائے۔ عقلِ انسانی، اس کے اس جذبہ کی تسکین کے لئے، اسے مختلف راہیں سجھاتی اور متنوع حربے سکھاتی ہے۔ نیز اس کی اس روش کے لئے جواز کی دلیلیں (JUSTIFICATORY REASONS) تراشتی رہتی ہے۔ اس کے برعکس، انسانی ذات کی نشوونما کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اپنے جسم کی ضروریات سے زائد جو کچھ ہو، اسے دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے۔ اس طرح انسانی جسم کے تقاضے اور اس کی ذات کے تقاضے میں کشمکش ہوتی رہتی ہے۔ قرآن کریم نے اس کشمکش اور تصادم کو قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں "ابلیس و آدم کی آویزش" سے تعبیر کیا ہے۔ ابلیس (یا شیطان) انسان کے ان جذبات کا ترجمان ہے جو اس کے طبیعی تقاضوں کے بروئے کار لانے کا ذریعہ ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں ابلیس و آدم کی نمود ایک ہی وقت میں ہوئی ہے۔ اور ابلیس کو آخر تک، آدم کے مدِمقابل رہنے کی مہلت بھی دیدی گئی ہے۔ (قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ (۷/۱۵)۔ خدا نے ابلیس سے کہا کہ ہاں! تمہیں مہلت دیجاتی ہے) لہذا، انسان کے اندر، اضداد کی یہ کشمکش، شروع سے ہے اور آخر تک رہے گی — ایک فرد کی زندگی میں بھی اور نوعِ انسان کی حیاتِ اجتماعیہ میں بھی — (حیاتِ اجتماعیہ میں ان دو گروہوں کی شکل میں، جن میں سے ایک اپنے ذاتی مفاد کے حصول کو مقصدِ زندگی قرار دے اور دوسرا گروہ ان کا جو نوعِ انسانی کے مفادِ عامہ کو پیشِ نظر رکھیں) اس ٹکراؤ سے انسانی ذات کی صلاحیتوں کی نمود اور نشوونما ہوتی ہے۔ اس سے اس کی قوت بڑھتی ہے اور جوں جوں اس کی قوت بڑھتی جاتی ہے، ابلیسی تقاضے اس سے مغلوب ہوتے جاتے ہیں۔ اسی لئے ابلیس سے کہہ دیا گیا تھا کہ تو جس قدر چاہے زور لگا لے — اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (۱۵/۴۲) — جو لوگ میرے قوانین کا اتباع کریں گے، ان پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکے گا۔

واضح رہے کہ قرآنی تصور کی رو سے، ابلیس کا کبھی خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ یہ، انسانی ذات کی نشوونما یافتہ قوتوں کے سامنے جھک جاتا ہے، ان سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے سلسلۂ ارتقا میں آگے بڑھنے اور رک جانے کے لئے اصول یہ بتایا ہے کہ

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ

فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ۔ (۷/۹)۔

جس کا تعمیری قوتوں کا پلڑا بھاری ہوگا وہ کامیاب و کامران ہوگا۔ جس کا وہ پلڑا ہلکا ہوگا۔ وہ نقصان اٹھائے گا۔

یعنی، یہ نہیں کہ آگے وہ بڑھ سکے گا جس کا تخریبی پلڑا بالکل خالی ہوگا۔ آگے وہ بڑھے گا جس کی ذات کی صلاحیتوں کا پلڑا بھاری ہوگا۔ جو تخریبی قوت پر غالب آچکا ہوگا۔ یہاں زندگی اور ارتقاء کا معیار ثقل موازین (پلڑے کا بھاری ہونا) ہے۔

نفس کشی — یعنی ابلیسی قوتوں کو فنا کر دینے — کا تصور، خانقاہیت کا پیدا کردہ فریب ہے۔ حقیقت نہیں ہے۔ حقیقت وہی ہے جس کی تائید قرآن کر رہا ہے۔ اگر تصادم کا امکان باقی نہ رہے تو زندگی کی جوئے رواں، جوہڑ بن کر رہ جائے۔ اس میں حرکت و حرارت، اسی تصادم کی بدولت ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔ ؎

مزی اندر جہان کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

یہ ہے وہ دوگونہ عمل اضداد، جو انسان کے اندر کارفرما رہتا ہے۔ ایک تضاد اس کے جسم کے اندر اور دوسرا تضاد اس کے طبیعی تقاضوں اور ذات کے تقاضوں کے اندر — واضح رہے کہ قرآن کی تعلیم یہ نہیں کہ انسانی جسم کے طبیعی تقاضوں کو فنا کر دیا جائے۔ قطعاً نہیں۔ وہ جسم کی پرورش کو بھی ضروری قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا صرف یہ ہے کہ جب جسم کے کسی تقاضے اور انسانی ذات کے تقاضے میں ٹکراؤ ہو تو ذات کے تقاضے کو ترجیح دینی چاہیئے، کیونکہ یہ حیات کی ارفع اور آگے چلنے والی شکل کا نام ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس مقام پر بھی قرآنی فلسفۂ حیات کس طرح مادی جدلیت کے فلسفہ سے آگے لے جاتا ہے۔

۵۔ قانونِ اضداد

قانونِ اضداد و تصادم، خود خالقِ کائنات کا پیدا کردہ، اور اس کی اسکیم کا لاینفک حصہ ہے۔

وہ چاہتا تو انسانوں کو پیدا ہی اس طرح کر دیتا کہ تعمیری اور تخریبی قوتوں کے تصادم کا امکان نہ ہوتا۔ سب انسان مجبوراً ایک ہی راستے پر چلے جاتے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا۔ اس لئے انسان کو ایسا نہیں پیدا کیا۔ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ (۱۰/۹۹) اگر خدا چاہتا تو وہ انسانوں کو پیدا ہی اس طرح کر دیتا کہ سب کے سب مومن ہوتے۔ لیکن اس کی مشیت کا پروگرام ایسا نہیں تھا۔ اس نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ کہ وہ اپنے فیصلہ سے جو راستہ چاہے اختیار کرے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ۔ (۱۸/۲۹)

ان سے کہدو کہ حق تمہارے نشو و نما دینے والے کی طرف سے آگیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اسے تسلیم کرلے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

اختیار و ارادہ، انسانی ذات کی خصوصیت ہے۔ اسی سے یہ حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے اور اسی سے یہ اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ اسی سے اس کے اندر وہ تبدیلی پیدا ہوتی ہے جس سے اُس کی خارجی دنیا کی ہیئت بدل جاتی ہے۔ یہی صورت افراد کی ہوتی ہے اور یہی کیفیت اقوام کی۔ اس کا واضح فیصلہ ہے کہ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ (۱۳/۱۱)

یاد رکھو! خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا، جب تک وہ قوم خود اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کرلے۔

جس قسم کی تبدیلی قوم کے اندر (یعنی اس کی نفسیات) میں پیدا ہوگی، اسی قسم کی تبدیلی اس کی خارجی دنیا میں رونما ہوگی۔ (ایمان، اسی قسم کی صحیح نفسیاتی تبدیلی کو کہتے ہیں) یہی وہ تبدیلیاں ہیں جن سے مردہ اقوام کے اندر زندگی کی نمود ہوجاتی ہے اور زندہ اقوام پر موت طاری ہوجاتی ہے۔ يُخْرِجُ الْحَىَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَىِّ۔ (۳۰/۱۹)۔ اسی سے ایک قوم اپنی عظمت و شوکت کھوکر قعرِ ذلت میں گر جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔ سورۂ توبہ میں تو جماعتِ مومنین کو مخاطب کر کے کہا گیا کہ اگر تم تخریبی قوتوں کا پوری مستعدی سے مقابلہ نہیں کرو گے تو يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا۔ (۹/۳۹)۔ خدا کا قانونِ محو و ثبات تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئیگا۔

اور تم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکو گے ــــ یہ نہیں کہ ایک قوم کی جگہ دوسری قوم آتی ہے تو وہ پہلی قوم جیسی ہی ہوتی ہے اس قسم کا استبدال بے معنی ہے۔ یہ (آنے والی قوم) جانے والی قوم کی شل نہیں ہوتی۔ اس سے بہتر ہوتی ہے، تبھی تو اس کی جانشین بنتی ہے۔ اسی لئے کہا کہ وہ قوم جو تمہاری جگہ لے گی، لَا یَکُوْنُوْا اَمْثَالَکُمْ (۴۷/۳۸)۔ وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ مٹنے والی قوم ہے جس کی تعمیری صلاحیتوں کا پلڑا ہلکا ہوگیا ہو، اور اس کی جگہ وہ قوم لے لیتی ہے جس کا یہ پلڑا بھاری ہو۔ یہی قوموں کے استبدال و استخلاف کا ابدی قانون ہے۔ اور یہ نتیجہ ہوتا ہے قوم کی داخلی (نفسیاتی) تبدیلی کا۔

ایک قوم تو ایک طرف رہی۔ قرآن تو یہاں تک بھی کہتا ہے کہ اگر پوری کی پوری نوعِ انسانی ایسی ہو جائے کہ اس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہ رہے، تو یہ بھی صفحۂ ارض سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔ اور اس کی جگہ کوئی اور مخلوق لے لے۔

اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَ یَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ۔ (۱۴/۱۹)

خدا کے قانونِ مشیّت کی رُو سے یہ بھی ممکن ہے کہ (اگر تم میں باقی رہنے کی صلاحیت نہ رہے تو) وہ تمہیں مٹا دے اور تمہاری جگہ ایک جدید مخلوق لے آئے۔

جب کسی قوم کے زندہ رہنے کی صلاحیتوں کا پلڑا ہلکا ہو جائے اور وہ اس طرح مصافِ زندگی سے ہٹا دی جائے تو اُسے اس قوم کی "اجل" کہا جاتا ہے اور اس میں پھر ایک ثانیہ کی بھی تاخیر و تقدیم نہیں ہو سکتی۔

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ (۷/۳۴)۔

ہر قوم اُس وقت تک زندہ رہتی ہے جب تک اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہو جب وہ صلاحیت ختم ہو جاتی ہے تو اس کی مُدّتِ حیات بھی ختم ہو جاتی۔ اس کے بعد، اس میں ایک ثانیہ کی بھی تاخیر و تقدیم نہیں ہوتی۔

اور یہ کچھ یونہی علی الحساب نہیں ہو جاتا، خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ہوتا ہے ــــ وَ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (۱۳/۳۸)۔ ہر قوم کی اجل کا فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ یہ تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کی اندھی قوت یا قانونِ اضداد (LAW OF CONTRADICTION) کی جابرانہ گردش نہیں جس سے ایک قوم

غلبہ و تسلط کی مالک بن جاتی ہے۔ اس کے بعد ایک اور قوم اس کی جگہ لے لیتی ہے اور اس میں نہ مٹنے والی قوم کا کوئی جرم اور قصور ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی جگہ لینے والی قوم کی کوئی کاریگری۔ یہ محض گردش دولابی کی رو سے بندھی ہوئی باریاں ہیں جو خود بخود آتی جاتی ہیں ـــــ قرآن کریم کے فلسفہ کی رو سے، قومیں اپنے جوہر ذاتی کی بنا پر غلبہ و اقتدار کی وارث ہوتی ہے۔ جب تک ان میں وہ جوہر باقی رہتا ہے، ان کا اقتدار بھی قائم رہتا ہے۔ جب اس جوہر میں کمی واقع ہو جائے تو وہ باقی رہنے کی صلاحیت کھو دیتی ہے اور اس کی جگہ ایسی قوم لے لیتی ہے جو اس سے بہتر صلاحیتوں کی مالک ہوتی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قانونِ اضداد اور قرآنی فلسفہ میں کس قدر نمایاں فرق ہے اور قرآنی فلسفہ کس طرح علم و بصیرت کو اپیل کرتا ہے۔

۶۔ کائنات میں غیر متبدل کیا ہے؟

فلسفۂ جدلیت کی رو سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ

۱ـــ کائنات میں ماورائے مادہ کسی شے کا وجود نہیں۔

۲ـــ ہر مادی شے میں عمل اضداد جاری و ساری ہے جس کی وجہ سے ہر شے ہر آن تغیر پذیر ہوتی ہے۔ کائنات میں ثبات و قرار کسی شے کو نہیں۔

لیکن، (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) اس کے ساتھ ہی، انہیں یہ بھی تسلیم ہے کہ خود یہ قانونِ اضداد ایک حقیقتِ مطلقہ (ABSOLUTE TRUTH) ہے۔ غیر متبدل (IMMUTABLE) ہے۔ ابدی (ETERNAL) ہے۔ اور نہ کسی شے کا پیدا کردہ ہے، نہ ذہنِ انسانی کی تخلیق ہے۔ بلکہ موجود فی الخارج (OBJECTIVE) ہے۔

قرآنِ کریم کا فلسفہ یہ ہے کہ اس قسم کا غیر متبدل، موجود فی الخارج قانون ایک ہی نہیں۔ ایک سے زیادہ ہیں۔ ان قوانین کو دو شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک شق قوانین فطرت پر مشتمل ہے جن کے مطابق سلسلۂ کائنات سرگرمِ عمل ہے۔ دوسری شق کا تعلق ان قوانین سے ہے جن کے مطابق انسان کو اپنی زندگی بسر کرنی چاہیئے تاکہ اس کے طبیعی جسم کے ساتھ ساتھ اس کی ذات کی نشوونما بھی ہوتی جائے۔ قانونِ فطرت

ہر شے کے اندر از خود موجود ہوتا ہے اور وہ اس کی اطاعت پر مجبور ہوتی ہے۔ "مجبور" سے مطلب یہ ہے کہ اشیائے کائنات کو اس کا اختیار و ارادہ ہی نہیں دیا گیا کہ وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کر سکیں۔ انسانی زندگی سے متعلق قوانین، قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ یہ قوانین جب نظری حیثیت سے سامنے آئیں تو انہیں کلماتِ اللہ کہا جاتا ہے۔ اور جب ان کا ظہور عملی شکل میں ہو تو یہ سنت اللہ کہلاتے ہیں۔ کلمات اللہ ہوں یا سنت اللہ — سب غیر متبدل ہیں — ایسے غیر متبدل کہ کائنات کی کسی شے کو (انسان سمیت) اس کی قدرت حاصل نہیں کہ ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل کر سکے؛ اور خود خدا، جس نے ان قوانین کو اس قسم کا بنایا ہے، قدرت رکھنے کے باوجود، ان میں تغیر و تبدل نہیں کرتا۔ خود اس کا ارشاد ہے کہ — لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (۶/۳۴) قوانینِ خداوندی کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ دوسری جگہ ہے۔

وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۶)

تیرے رب کے قوانین صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ انہیں کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔

اسی طرح "سنت اللہ" کے متعلق فرمایا

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۳۳/۶۲)

خدا کا یہی دستور امم سابقہ میں بھی رہا۔ یہی اب کارفرما ہے۔ تم دستورِ خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

...

جن لوگوں کے سامنے ان قرآنی حقائق کو پہلی مرتبہ پیش کیا گیا، وہ کہتے تھے کہ یہ محض شاعری ہے فَتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (۵۲/۳۰)۔ تھوڑا سا انتظار کرو — زمانے کی گردشیں اسے خود مٹا دیں گی؛ یونہی حالات بدلے اور زمانے کے تقاضوں میں تبدیلی آئی؛ یہ باتیں، داستانِ پارینہ ہو جائیں گی۔ ان سے کہا گیا کہ یہ شاعری نہیں۔ شاعری ایک داعیٔ انقلاب کے شایانِ شان ہی نہیں ہوتی۔ (۳۶/۶۹)۔ یہ اٹل قوانین ہیں۔ اس لئے — تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ○ (۵۲/۳۱)۔ تم بھی انتظار کرو، میں بھی انتظار کرتا ہوں۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ یہ ابدی حقائق ہیں یا کسی شاعر کے تخیلات — انہی میں وہ قانونِ محو و اثبات شامل ہے جس کے مطابق چیزیں مٹتی اور باقی رہتی ہیں يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ (۱۳/۳۹)۔ اور ان کا سرچشمہ کائنات سے ماوراء علم خداوندی ہے وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ (۱۳/۳۹) یعنی قوانین

دیئے اس لئے گئے ہیں ـــ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ۔ (۸/۴۲)۔ جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے زندہ رہے اور جسے تباہ ہونا اور مٹنا ہے، وہ بھی دلیل و برہان کی رو سے مٹے ـــ یہاں نہ دھاندلی ہے اور نہ ہی محض اتفاقی طور پر حوادث سرزد ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہر بات قاعدے اور قانون کے مطابق واقع ہوتی ہے۔

۷۔ مستقل اقدار

ان میں سے جن قوانین کا تعلق انسانی زندگی سے ہے، انہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ اگر انسانی معاشرہ ان اقدار کے مطابق متشکل ہو جائے تو اس میں تمام افراد معاشرہ کی طبیعی ضروریات زندگی بھی بلا مشقت و پریشانی پوری ہوتی جاتی ہیں اور ان کی ذات کی صلاحیتوں کی بھی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ یہ دوہرا مقصد، ان اقدار کے سوا اور کسی صورت میں حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان اقدار و قوانین کی فہرست تو طول طویل ہے لیکن ہم یہاں ان میں سے چند ایک بنیادی اقدار کا ذکر کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ مثلاً:۔

۱ـــ ہر انسانی بچہ محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب الاحترام ہے۔ (۱۷/۷۰)۔

۲ـــ معاشرہ میں تعین مدارج کا معیار افراد کے ذاتی جوہر اور حسن سیرت و کردار ہے۔ نہ کہ اضافی نسبتیں۔ (۴۹/۱۳)۔

۳ـــ معاشرہ میں سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ اپنے فرائض منصبی کا پابند ہے۔ (۴۹/۱۳)۔

۴ـــ معاشرہ کے بنیادی ستون عدل اور احسان ہیں۔ عدل کے معنی ہیں ہر ایک کے حقوق اور واجبات کی کما حقہ ادائیگی۔ اور احسان کے معنی یہ ہیں کہ جس میں کسی وجہ سے کوئی کمی آجائے اس کمی کا پورا کر دینا۔ (۱۶/۹۰)۔ اور اس کے لئے مزد و معاوضہ تو ایک طرف شکریہ تک کے بھی متمنی نہ ہونا۔ (۷۶/۹)۔

۵ـــ اپنی جائز ضروریات سے زائد سب کچھ دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دیدینا (۲/۲۱۹) بلکہ اگر دیکھا جائے کہ دوسروں کی ضرورت میری ضرورت سے زیادہ شدید ہے تو ان کی ضرورت کو

اپنے اوپر ترجیح دینا۔ (۹/۵۹)۔

۶۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ (۳۸/۵۳)۔

۷۔ جس میں محنت کرنے کی استعداد ہے، اسے محنت کئے بغیر کچھ نہیں مل سکے گا۔ (۳۹/۵۳)۔

۸۔ ذرائع رزق ہر ضرورت مند کے لئے یکساں طور پر کھلے رہیں گے۔ ان پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ (۱۰/۴۱، ۱۰/۵۵)

۹۔ ہر فرد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا معاشرہ کا فریضہ ہوگا۔ (۴/۱۱، ۱۵۱/۶)۔

۱۰۔ کسی شخص کو دوسروں پر حکومت کرنے کا حق نہیں ہوگا۔ (۳/۷۹) فرمانروائی صرف قوانین کی ہوگی۔ (۴۴/۵)۔

۱۱۔ انسان کا کوئی کام — حتیٰ کہ اس کے دل میں گذرنے والا خیال تک بھی اپنا نتیجہ مرتب کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ (۱۹/۲۶)۔ ان میں سے ہر ایک کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہے اور انہی اثرات کے مجموعے کے مطابق اس کی ذات کا مستقبل متعین ہوتا ہے۔ اگر اس کے تعمیری نتائج کا پلڑا جھکا ہوا ہے تو اس کا مستقبل خوشگوار ہے۔ اگر وہ پلڑا ہلکا ہے تو اس کے لئے تباہی ہے۔ اس قانونِ مکافات میں کسی کے لئے استثناء نہیں۔

ان قوانین یا مستقل اقدار کو حق (THE TRUTH) کہا جاتا ہے۔ یہی حقیقت (REALITY) ہے۔ ان کے خلاف جو نظریہ، تصور یا مسلک ہے وہ باطل ہے۔ حق تعمیری نتائج پیدا کرتا ہے اور انسانیت کے ارتقاء میں ممد و معاون ہوتا ہے۔ باطل تخریبی نتائج پیدا کرتا ہے اور کاروانِ انسانیت کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری، اس کے تین بڑے ستون ہیں۔ حق و باطل میں شروع سے کشمکش چلی آ رہی ہے اور چلی جائے گی۔ انسانی تاریخ، اسی کشمکش کی محسوس تفسیر ہے۔

۸۔ کشمکش حق و باطل

اب ہم پھر ایک ایسے مرحلہ میں داخل ہو رہے ہیں جہاں مادی جدلیت کے فلسفہ اور قرآنی تصور میں بنیادی فرق ہے۔ فلسفۂ جدلیت کی رو سے، کوئی نظریہ، کوئی تصور، کوئی مسلک، نہ بنیادی طور پر حق ہے

نہ باطل۔ ہر نظریہ (IDEA) اور ہر شے کے اندر دو متضاد عناصر باہمد گر برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ ان میں سے کبھی ایک غالب آجاتا ہے کبھی دوسرا۔ جو غالب آجاتا ہے اس کی ضد پھر نمودار ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح وہی کشمکش پھر جاری رہتی ہے اور یہ سب کچھ (مارکس کے الفاظ میں) تاریخی وجوب (HISTORICAL - NECESSITY) اور مادئیت تنگ کی اصطلاح میں قانونِ اضداد کی اندھی قوت کی رُو سے، از خود ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس کے برعکس، قرآنی تصور یہ ہے کہ

۱۔ یہ کشمکش، حق (تعمیری قوتوں) اور باطل (تخریبی قوتوں) کے درمیان ہوتی ہے۔

۲۔ اس کشمکش میں آخرالامر حق غالب آتا ہے اور سلسلۂ کائنات ایک ارتقائی منزل اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس نئی منزل میں باطل پھر بھیس بدل کر سامنے آتا ہے اور حق و باطل کا یہ تصادم پھر جاری رہتا ہے جس میں حق پھر غالب آجاتا ہے۔ یہ سلسلہ آگے بڑھتا چلا آرہا ہے اور ہر منزل کے بعد کائنات اور نکھرتی اور سنورتی چلی جا رہی ہے۔

۳۔ یہ کشمکش اور حق کا غلبہ، اس اسکیم کے مطابق جاری و ساری ہے جس کی رو سے خدا نے کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اس کشمکش میں اگر انسان حق کی حمایت کے لئے اٹھ کھڑا ہو تو یہ مرحلہ تیز رفتاری سے طے ہو جاتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو یہ مسافت اس رفتار کے مطابق طے پاتی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ "خدا کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار سے لیکر ایک ایک ہزار بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے"۔ (اس کی مزید تشریح ذرا آگے چل کر آئے گی)۔

۴۔ جو انسان، حق کی حمایت کے لئے اٹھتے ہیں، ان کی ذات کی نشو و نما ہوتی جاتی ہے۔ اور ان کی اس دنیا کی، اور اس کے بعد کی زندگی، خوشگواریوں کے جھولے جھولتی ہے۔ یوں خود انسان، اپنے ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

دیکھئے قرآن کریم ان حقائق کو کن الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

۱۔ نظامِ کائنات یونہی کھیل تماشے کے طور پر پیدا نہیں کیا گیا۔ اسے بالحق ـــ تعمیری مقاصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ○ وَ مَا

خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (۴۴/۳۸-۳۹)

اور ہم نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو اور جو کچھ ان میں ہے، یونہی کھیل تماشے کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ یہ بالحق پیدا کی گئی ہے۔ لیکن اکثر لوگ علم و بصیرت سے کام نہ لیتے ہوئے اس حقیقت کو سمجھتے نہیں۔

۲۔ کائنات میں حق و باطل کی کشمکش جاری ہے۔ اس تصادم میں آخر الامر باطل شکست کھاتا ہے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَ لَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ○ (۲۱/۱۸)

ہم حق کی ضربیں باطل پر لگاتے رہتے ہیں۔ تا آنکہ حق، باطل کا بھیجہ نکال دیتا ہے اور یوں وہ میدان چھوڑ کر بھاگ اٹھتا ہے۔ جو لوگ اپنے تصورات کے مطابق اس کے خلاف کچھ سمجھتے ہیں، تو ان کے حصے میں تباہی کے سوا کچھ نہیں آسکتا۔ (کیونکہ وہ حق کے غلبہ کا تصور نہیں رکھتے)۔

۳۔ مفاد پرست گروہ باطل کو غالب رکھنے کے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں۔

وَ يُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ (۱۸/۵۶)

جو لوگ حق سے انکار کرتے ہیں وہ باطل کے حیلوں سے حق کے خلاف نبرد آزما ہوتے رہتے ہیں۔ تاکہ اس طرح حق کو مغلوب کر دیا جائے۔

۴۔ لیکن حق پرست جماعتیں ان کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان میں اتر آتی ہیں۔

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ يُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۚ (۸/۸)

تاکہ حق کا اثبات ہو جائے اور باطل کا ابطال۔ خواہ ایسا ہونا ان لوگوں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گذرے جو قوانین شکنی ہی میں اپنا مفاد مضمر سمجھتے ہیں۔

۵۔ لیکن اگر حق کی حمایت کے لئے انسانوں کی جماعت نہ بھی اٹھے، تو بھی آخر الامر حق غالب آکر رہتا ہے۔ اگرچہ اس میں وقت بہت لگ جاتا ہے۔

وَ يَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَ يُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ۔ (۴۲/۲۴)

خدا، اپنے قوانین کے زور سے، باطل کو محو اور حق کو محکم اور استوار کئے جاتا ہے۔

یہ نکتہ مزید وضاحت چاہتا ہے۔ انسانی عمل کا ایک طریق تو یہ ہے کہ وہ کسی قانون کی صداقت پر یقین رکھ کر اس کے مطابق کام کرنا شروع کر دے۔ اس سے اثباتِ حق کی مسافت بہت جلد طے ہو جائے گی۔ اور اس عمل کے نتائج اس قانون کی صداقت کی محسوس دلیل بن جائیں گے۔
دوسرا طریق یہ ہے کہ وہ کسی قانون یا فارمولے کو نہ مانے بلکہ اپنے قیاس کی راہ نمائی میں سفر شروع کر دے۔ قیاسِ عقلی کا طریق تجرباتی (TRIAL AND ERROR) کام ہوتا ہے۔ اس میں عقل ایک مسلک اختیار کرتی ہے۔ صدیوں کے تجربے کے بعد جا کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ راہ غلط تھی۔ پھر وہ اسے چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرتی ہے۔ اس طرح متعدد تجارب، اور سینکڑوں برس کی جانکاہ مشقتوں کے بعد وہ حقیقت تک پہنچ پاتی ہے۔ اسے عرفِ عام میں زمانے کے تقاضے کہا جاتا ہے۔ حقیقت تک پہنچنے کی یہ وہ رفتار ہے جس میں "ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے"۔ اب یہ انسان کے اپنے فیصلہ پر منحصر ہے کہ وہ اپنے سفر کا آغاز ہی حقیقت (صداقت) کی راہ نمائی میں کرے اور اس طرح راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے بھی محفوظ رہے، اور مسافت بھی برق رفتاری سے طے کر لے۔ یا عقل کے تجرباتی طریق کے مطابق ٹھوکریں کھاتا ہوا، صدیوں کے بعد وہاں جا کر پہنچے۔ اوّل الذکر طریق سے حق، ایک ہی جست میں باطل پر غالب آجاتا ہے۔ ثانی الذکر طریق سے وہ صدیوں میں جا کر غالب آتا ہے۔ غالب بہر طور حق ہی کو آنا ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ آخر الامر غالب حق ہی نے آنا ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ حق یونہی خلا میں غالب آجائے گا۔ حق سے مراد ہے حق پر مبنی نظام۔ یہ نظام انسانوں کی دنیا میں رائج ہو گا اور انسانی ہاتھ ہی اسے متشکل کریں گے۔ ایک جماعت اسے متشکل کرے گی اور دوسری جماعت اس کی مخالفت کرے گی۔ اسکی حمایت کرنے والی جماعت اگر مادی قوت کے اعتبار سے فریقِ مخالف کے مقابلہ میں کمزور بھی ہو گی تو بھی اسے کامیابی ہو گی۔ (قرآنِ کریم اس کمزوری کو ابتداءً ایک اور دو کی نسبت سے تعبیر کرتا ہے اور آخر الامر ایک اور دس کی نسبت سے)۔

۶۔ یہ پرکھنے کے لئے کہ حق کس طرف ہے، بنیادی کسوٹی یہ ہے کہ

وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (۱۳/۱۷)

وہی نظریۂ زندگی، وہی مسلکِ حیات، وہی نظامِ انسانی باقی رہ سکتا ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت کا موجب ہو۔

مفاد پرست انسانوں کی گروہ مندانہ منفعت کوشیاں، اس اصول کو ناکام بنانے کے لئے مصروف جدوجہد رہتی ہیں لیکن خدا کی اسکیم اسے کامیاب وکامران بنا کر رہتی ہے۔

يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ○ (۹/۳۲)

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اس نورِ خداوندی کو پھونکیں مار مار کر بجھا دیں۔ لیکن خدا کی مشیت ان کی ان کوششوں کو بار آور نہیں ہونے دے گی۔ یہ نور اپنی تکمیل تک پہنچ کر رہے گا۔ خواہ مفاد پرست گروہوں پر یہ چیز کتنی ہی شاق کیوں نہ گذرے۔

یہی وہ نظامِ زندگی ہے جو باطل پر مبنی ہر نظام پر آخر الامر غالب آئے گا۔

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ○ (۹/۳۳)

خدا نے اپنے رسول کو صحیح منزل کی طرف راہ نمائی دے کر بھیجا ہے۔ یعنی ایک ایسا نظامِ زندگی دے کر جو حق پر مبنی ہے۔ یہ نظام، دنیا کے ہر نظام پر غالب آکر رہے گا۔ خواہ یہ بات ان لوگوں پر کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے جو خالص قوانین خداوندی کی اطاعت نہیں کرنا چاہتے۔

حق و باطل کی اس کشمکش کے نقطۂ نگاہ سے دنیا میں انسانوں کی دو ہی جماعتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک حق کا غلبہ چاہنے والی — اسے جماعت مومنین کہا جاتا ہے۔ دوسری باطل کے غلبہ کی متمنی — اسے کفار کا گروہ کہتے ہیں۔ یہ کشمکش انہی دو جماعتوں میں ہوتی ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو حق پرست ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں لیکن درحقیقت چاہتے ہیں باطل کے ساتھ لپٹے رہنا۔ انہیں منافق کہا جاتا ہے۔ یہ گروہ، قرآنِ کریم کی رو سے، بدترین خلائق ہوتا ہے۔ یعنی کفار سے بھی بدتر۔

"شرک" حق اور باطل کے نظام میں مفاہمت (COMPROMISE) کو کہتے ہیں جس کی نظامِ حق میں قطعاً گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے اس نظام کے داعیٔ اوّل (حضورؐ نبی اکرم) سے واضح الفاظ میں کہدیا گیا کہ۔

وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ۔ (۱۱/۱۱۳)

یہ لوگ جو عدل کے بجائے، ظلم پر مبنی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں، تو تم ان کی طرف

ذرا سا بھی نہ جھکنا۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو جس جہنم میں یہ گرفتار ہیں اس کی آگ کے شعلے تمہیں بھی اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔

حق و باطل کے اضداد میں مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر حق کے ساتھ باطل کی ذرا سی بھی آمیزش ہو جائے، تو حق، حق نہیں رہتا۔

قرآنی تصور کی رو سے حق اور باطل کے تضاد کی کیفیت یہ ہے۔ دوسری طرف فلسفۂ جدلیت ہے جو یہ تصور پیش کرتا ہے کہ دو باہمد گر متخاصم قوتیں کچھ وقت کے بعد ایک دوسرے میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ —— یعنی کچھ عرصہ کے بعد، حق —— باطل ہو جاتا ہے اور باطل، حق ہو جاتا ہے۔

اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کے اس فلسفہ کو (کہ حق ہمیشہ حق رہتا ہے اور باطل باطل) وہ ماوراء الطبیعیاتی (METAPHYSICS) سے تعبیر کرتے ہیں جس کی ضد، فلسفۂ جدلیت ہے۔ اس لئے اس بناء پر، ہمیں ان کے فلسفہ پر تنقید کرنے کا حق نہیں۔ ہم اس دلیل کو تسلیم کر لیتے لیکن انہی کا یہ بھی تو دعوٰے ہے کہ قانونِ اضداد (LAW OF CONTRADICTION) حق ہے جو باطل میں تبدیل نہیں ہوتا۔ وہ شروع سے وہی ہے اور ابد تک وہی رہے گا۔ یہ خود (METAPHYSICS) ہے، لہذا بات صرف اتنی ہوئی کہ فلسفۂ جدلیت، ایک قانون کو غیر متبدل تسلیم کرتا ہے، قرآن ایک سے زیادہ قوانین کو ایسا کہتا ہے۔ اس کے اس دعوے کی دلیل بھی وہی ہے جو دلیل وہ پیش کرتے ہیں۔ یعنی نتائجی دلیل (PRAGMATIC TEST)۔ اس کے متعلق ہم ذرا آگے چل کر گفتگو کریں گے۔ جب "علم" سے متعلق گوشہ سامنے آئے گا۔

بہرحال یہ ہے وہ نظام جسے قرآن پیش کرتا ہے۔ یعنی وہ نظامِ زندگی جس میں مستقل اقدارِ حیات یا غیر متبدل قوانین محسوس عملی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ یہ نظام زمان و مکان کی حدود سے بالاتر ہوتا ہے۔ مکان کی حدود سے اس طرح کہ یہ عالمگیر نظام ہے جو کسی خاص خطۂ زمین میں محدود نہیں رہ سکتا، نہ ہی کسی خاص قوم پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں نظام ہے۔ جہاں تک زمان کا تعلق ہے۔ اس نظام کے محسوس پیکر میں تو زمانے کے تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں ہو سکتی ہیں لیکن اس کی اصل و بنیاد ہمیشہ وہی رہتی ہے۔ یعنی غیر متبدل قوانین جن پر ان کی عمارت استوار ہوتی ہے، اسے دین کہا جاتا ہے۔

۹۔ اضداد میں توافق

حق و باطل کی کشمکش دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو ان جماعتوں کے درمیان جو حق و باطل کی حامی ہوتی ہیں۔ اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ دوسرے' افراد کے سینے کے اندر' (داخلی) کشمکش' جس میں ایک طرف انسان کے بیباک جذبات، طبیعی مفاد کے حصول کے لئے ہیجان خیز رہتے ہیں اور دوسری طرف اس کی ذات کی نشو ونما کے تقاضے حق کی حمایت کے داعی ہوتے ہیں۔ انسانی جذبات کو فنا کر دینے کا تصور' انتہائی غلط نگہی اور خود فریبی ہے۔ جذبات ہی تو وہ قوتِ محرکہ ہے جو انسان کو آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ قرآن کا انداز تربیت یہ ہے کہ وہ جذبات کو مستقل اقدار کے تابع سرگرمِ عمل رہنا سکھاتا ہے۔ نبی اکرمؐ کے الفاظ میں۔ "اس طرح ابلیس مسلمان ہو جاتا ہے۔" اس سے ان افراد کے سینے کا داخلی اضطراب مبدّل بہ سکون ہو جاتا ہے۔ یہ نظام انہی افراد کے ہاتھوں سے متشکل ہوتا ہے۔ اس کیفیت کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے کہ ــــ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ ــ (۶/۱۲۷) خدا کی صفتِ ربوبیت کے زیرِ سایہ' انہیں ایسا مقام حاصل ہوگا جس میں ہر سمت سے سلامتی کی آوازیں وجۂ نشاطِ روح ہوں گی۔ (وَ تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ ۱۰/۱۰) ــــ اس وقت انسان کے ارضی معاملات اور سماوی اقدار (غیر متبدل قوانین) ایک ہی مرکز میں مرکوز ہوں گے۔ (۳۹/۶۹) اور انسانی معاشرہ کی حالت یہ ہوگی کہ۔ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا ــــ کسی انسان کا دوسرے انسان پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ہوگا۔ وَ الْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۔ (۸۲/۱۹)۔ حکومت انسانوں کی نہیں بلکہ قوانینِ خداوندی کی ہوگی۔

وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا ۔ (۳۹/۶۹)

اور زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔

۱۰۔ علم کے متعلق تصور

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے' فلسفۂ جدلیت کی رُو سے علم وہی علم کہلانے کا مستحق ہے جو حواس کے ذریعے سے حاصل کیا جائے۔ اور نظریہ وہی درست تسلیم کیا جا سکتا ہے جس کی تائید اس کے نتائج کریں۔ اس عملی طریق سے انسان بتدریج قوانینِ فطرت کا علم حاصل کرے گا حقائق انہی قوانین کو کہا جاتا ہے۔

قرآنِ کریم بھی انسانی علم اسی کو قرار دیتا ہے جسے حواس (SENSE PERCEPTION) کے ذریعے حاصل کیا جائے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ

وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ○ (۱۷/۳۶)۔

جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ یاد رکھو! تمہاری سماعت، بصارت اور قلب ہر ایک سے پوچھا جائے گا (کہ انہوں نے اس بات کے علم ہونے کی شہادت دی تھی یا نہیں)۔

یعنی حصولِ علم کے لئے ضروری ہے کہ انسانی حواس معلومات حاصل کر کے، قلب (MIND) تک پہنچائیں اور وہ ان سے کوئی نتیجہ مستنبط کرے۔ چنانچہ قرآن کریم قدم قدم پر مظاہرِ فطرت پر غور و فکر کی تاکید کرتا ہے۔ وہ "علماء" کہتا ہی انہیں ہے جو کارگہِ فطرت کے مشاہدہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچیں کہ اس میں قوانینِ خداوندی کس حسن و خوبی سے کارفرما ہیں۔ (۳۵/۲۷-۲۸)۔ نظامِ فطرت کے ساتھ ہی وہ انسانی تاریخ کے مطالعہ پر بھی بڑا زور دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم اقوامِ سابقہ کی سرگذشتوں پر غور کرو اور دیکھو کہ جس قوم نے زندگی کے صحیح قوانین کے مطابق نظام متشکل کیا اس کا نتیجہ کیا نکلا اور جس نے غلط راہ اختیار کی اس کا انجام کیا ہوا۔

نظامِ فطرت کے مشاہدہ اور تاریخِ انسانی کے مطالعہ کے بعد جس نتیجہ پر انسان پہنچے، قرآن اسے ایک نظریہ قرار دیتا ہے۔ وہ نظریہ صحیح ہے یا غلط، اسے پرکھنے کے لئے وہ کہتا ہے کہ اس نظریہ پر عمل کر کے دیکھو۔ اگر اس کے نتائج، اس کے دعویٰ کی تائید کرتے ہیں تو وہ نظریہ صحیح ہے۔ اگر نتیجہ اس کے مطابق نہیں نکلتا تو وہ نظریہ درست نہیں۔ یہی وہ طریق تھا جسے خود نبی اکرمؐ نے اپنے دعاوی کی صداقت کے ثبوت کے لئے پیش کیا۔ آپؐ نے اپنی قوم مخالف سے کہا کہ میں نے قوانینِ خداوندی تمہارے سامنے پیش کر دیئے۔ اب ان کی صداقت کے پرکھنے کا طریق یہ ہے کہ

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (۶/۱۳۶)

ان سے کہو، کہ اے میری قوم! تم اپنے طریق پر عمل کرو۔ میں اپنے طریق پر عمل کرتا ہوں نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ منزل تک کون پہنچتا ہے۔ یہی وہ طریق ہے جس سے یہ حقیقت اُبھر کر

سامنے آجائے گی کہ جو لوگ دوسروں کی محنت کو غصب کرکے ظلم کرتے ہیں، وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔

جس دعویٰ کا اثبات اس کے عملی نتائج نہیں کرتے وہ دعویٰ صداقت پر مبنی نہیں ہوسکتا۔ ظاہر ہے کہ اس طریق سے حقیقت تک پہنچنے کے لئے بڑی لمبی مدت درکار ہوتی ہے جہاں تک مستقل اقدار کا تعلق ہے اس طویل مدت کو مختصر کرنے کے لئے خالقِ کائنات کی طرف سے ایک اور طریق تجویز کیا گیا۔ اسے وحی کہا جاتا ہے یعنی ان قوانین کو کسی انسان پر براہ راست منکشف کر دیا جاتا اور وہ انہیں دوسرے انسانوں تک پہنچا کر ان سے کہتا کہ تم ان پر عمل کرکے خود ان کی صداقت کے متعلق اطمینان کرلو۔

وحی کا یہ سلسلہ چودہ سو سال ہوئے ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔ لہٰذا اب انسانی علم کا ذریعہ مطالعہ، مشاہدہ اور فکر و شعور کے علاوہ کوئی نہیں۔ وحی کے ذریعہ جو علم آخری مرتبہ دیا گیا تھا، وہ اپنی اصلی شکل میں قرآن کریم کے اندر موجود ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ تم ان قوانین پر غور و فکر کرو اور ان پر عمل کرکے دیکھو اگر اس طرح تمہیں ان کی صداقت کے متعلق اطمینان ہوجائے تو انہیں صحیح تسلیم کرو۔ غور و فکر سے انسانی ذہن ایک نظریہ کے متعلق اتنا اندازہ کرسکتا ہے کہ وہ مبنی برحقیقت ہے یا نہیں۔ اگر وہ اسے اس طرح مبنی برصداقت خیال کرے تو یہ بات اسے اس پر آمادہ کر دیتی ہے کہ وہ اس پر عمل کرکے دیکھے۔ اس وقت اس نظریہ کے نتائج ہنوز اس کے سامنے نہیں ہوتے۔ اس طرح ان دیکھے نتائج پر اعتماد کرکے آمادۂ عمل ہوجانے کو "ایمان بالغیب" کہتے ہیں۔ یعنی ان نتائج پر یقین جو ہنوز مشہود طور پر سامنے نہیں آتے۔ یہ یقین اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے بغیر انسان اس کے مطابق عملی قدم اٹھانے کے لئے بطیب خاطر تیار نہیں ہوسکتا۔ جب نتائج اس دعوے کی تائید کردیں تو وہی "ایمان بالغیب" حقیقت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں پہلے درجہ کے یقین کو علم الیقین کہا جاتا ہے اور دوسرے درجہ کے یقین کو عین الیقین (۱۰۲/۵-۷) یعنی نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین کرنا۔

یہ ہے قرآن کی رُو سے علم کی تعریف (DEFINITION) اور علم و عمل کا باہمی تعلق۔ وہ کہتا یہ ہے کہ جو قوانین یا مستقل اقدار تمہارے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، تم ان پر عقل و فکر اور دلیل و برہان کی رو سے غور کرو۔ اگر وہ تمہیں قابلِ قبول نظر آئیں تو ان کے مطابق اپنا معاشرہ متشکل کرو۔ اس سے جو نتائج مرتب ہوں گے وہ ان قوانین کی صداقت کی زندہ شہادت بن جائیں گے۔ (۱۲/۱۵) ۔ یوں

وہ انسان کو اس محنت شاقہ سے بچا لیتا ہے جو عقل کے تجرباتی طریق سے منزل تک پہنچنے کے لئے لانیفک ہوتی ہے۔

فلسفہ کا اثر معاشی نظام پر

اب ہم اپنے سفر کی آخری منزل میں پہنچ رہے ہیں۔ ہم نے یہ ساری فلسفیانہ بحث اس لئے کی ہے کہ کمیونزم کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کے معاشی نظام کی بنیاد فلسفۂ جدلیت پر ہے۔ اس کے برعکس قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ بنیاد اس قدر کمزور ہے کہ یہ اتنے عظیم معاشی نظام کی عمارت کا بوجھ اٹھا نہیں سکتی۔ اس نظام کے لئے قرآن کا فلسفۂ حیات ہی اساس محکم عطا کر سکتا ہے۔ اس لئے انسانیت کی نجات کی راہ یہ ہے کہ قرآنی فلسفہ کی بنیادوں پر اس معاشی نظام کی عمارت استوار کی جائے۔ دونوں فلسفے ہمارے سامنے آ گئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مادی جدلیت کا فلسفہ اس عمارت کے بوجھ کا متحمل کیوں نہیں ہو سکتا۔

مادی فلسفہ: خواہ وہ جدلیت کا ہو یا ماورار الطبیعاتی، اس کا فطری نتیجہ نظام سرمایہ داری کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتا۔ مادی فلسفۂ حیات کی رُو سے انسان کی زندگی صرف حیوانی ہوتی ہے اور قوانین فطرت کے تابع رہتی ہے۔ یہ وہ قوانین ہیں، جن کا اطلاق، دیگر حیوانات پر بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح انسان پر۔ اس طرح اس فلسفہ کی رُو سے انسانی زندگی کے تقاضے محض طبیعی تقاضے ہوتے ہیں۔

طبیعی زندگی کے تین تقاضے ایسے ہیں جنہیں بنیادی یا جبلّی (INSTINCTIVE) قرار دیا جاتا ہے۔

(۱) تحفظِ خویش کا تقاضا (SELF -PRESERVATION)

(۲) تغلب خویش کا تقاضا (SELF -AGGRESSION) — یہ درحقیقت تقاضا ۱ ہی کی تکمیل کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اور

(۳) افزائش نسل کا تقاضا (SELF - REPRODUCTION)

تقاضا ۱ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہر فرد، زیادہ سے زیادہ سامان زیست سمیٹنے کی فکر کرے تاکہ اس سے اس کا زیادہ سے زیادہ تحفظ ہو سکے۔ اگر اس مقصد کے حصول میں اس کے راستے میں کوئی حائل

ہوجائے تو یہ اس کا مقابلہ کرکے اس پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ یہ تقاضا نمبر۲ ہوا۔ اور جب اپنے تحفظ کی طرف سے اطمینان ہوجائے تو پھر اپنی اولاد کے تحفظ کی فکر کرے۔ یہ تقاضا نمبر۳ ہے۔ اس تصورِ زندگی کے ماتحت، کسی فرد کے لئے، کسی دوسرے فرد کے تحفظ یا مفاد کا سوال پیدا ہو نہیں سکتا۔ کوئی حیوان، کسی دوسرے حیوان کے مفاد کا تصور نہیں رکھتا۔ اس کے نزدیک حصولِ مفادِ خویش کے علاوہ کوئی مقصد ہوتا ہی نہیں، ہوسکتا ہی نہیں۔ یہ وجہ ہے کہ اس فلسفہ کا ماننے والا اس سوال کا اطمینان بخش جواب کبھی نہیں دے سکتا کہ

میں دوسروں کی مدد کیوں کروں؟

آپ زیادہ سے زیادہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی تمدنی زندگی کا تقاضا باہمی تعاون ہے۔ یعنی میرے لئے کسی محتاج کی مدد کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اگر کل کو میں محتاج ہو جاؤں تو دوسرے میری مدد کریں۔ لیکن ایسا کہتے وقت یہ نہیں سوچا جاتا کہ یہی جذبہ تو وہ ہے جس کے تابع ہر شخص زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی فکر کرتا ہے یعنی وہ ایسا انتظام کرنا چاہتا ہے کہ وہ کسی وقت بھی دوسروں کا محتاج نہ ہو۔ یہی وہ مسابقت (Race) ہے جو ایک فرد کی حالیہ ضروریات پوری ہونے کے بعد بھی اسے اطمینان سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ وہ ہر وقت سمیٹنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے اور اسی سے معاشرے میں ناہمواریاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ زیادہ عقل و ہنر (Wits) کے مالک زیادہ سے زیادہ سمیٹ لیتے ہیں اور دوسرے بیچارے محتاج سے محتاج تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جو زیادہ سے زیادہ سمیٹ لیتا ہے وہ دوسروں کے تعاون کا محتاج نہیں رہتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اس تعاون کو روپے سے خرید سکتا ہوں۔ اس لئے تعاون کی ضرورت اسے اس پر آمادہ نہیں کرسکتی کہ وہ دوسروں کی امداد کرے۔ اسی کا نام سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے۔ یہ مادی فلسفۂ زندگی کا لازمی نتیجہ ہے۔

فلسفۂ جدلیت، انسانی زندگی اور اس کے تقاضوں کا تصور تو یہ پیش کرتا ہے لیکن اس بنیاد پر معاشی نظام وہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں زیادہ سے زیادہ ایثار کرنا پڑتا ہے۔ کمیونزم کے معاشی نظام کی بنیاد یہ ہے کہ:۔

ہر شخص سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے اور اس میں سے اُسے بقدر اس کی ضرورت کے دے کر باقی سب دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے لے لیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ (مادی تصورِ حیات کی رُو سے) وہ کونسا جذبۂ محرکہ ہے جس کے ماتحت ایک فرد زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اس میں کم از کم خود لے کر زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دیدے۔ اس قسم کا مطالبہ زندگی کے طبعی تقاضے کے خلاف ہے۔ تحفظِ خویش کی جبلت (INSTINCT) اس کی کبھی اجازت نہیں دے سکتی۔ یہ اس مطالبہ کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ آپ ہنگامی طور پر عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے (جو نشہ پلا کر مدہوش کرنے ہی کی دوسری شکل ہوتی ہے) اس پر آمادہ کر سکتے ہیں کہ وہ مفادِ خویش کو نظر انداز کر دیں۔ لیکن اسے ان کا مستقل نہجِ زندگی نہیں بنا سکتے۔ روس کا تجربہ اس کا شاہد ہے۔ انہوں نے عوام (محتاجوں اور غریبوں کو) یہ کہہ کر کہ "اٹھو اور امیروں کو لوٹ لو۔ ان کی دولت وحشمت کے مالک تم بن جاؤ گے"؛ انہیں بے پناہ قربانیوں کے لئے آمادہ کر دیا۔ انہوں نے اس نشہ سے مدہوش ہو کر ہنگامی طور پر وہ کچھ کر دیا جسے دیکھ کر دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ لیکن جب ان کا نشہ اتر گیا تو ایثار اور قربانی کا وہ جذبہ بھی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد جب ان محنت کشوں سے کہا گیا کہ تم..... زیادہ سے زیادہ محنت کرو اور اس میں سے صرف بقدر اپنی ضرورت کے لو۔ تو انہوں نے کہا کہ سرکار! پھر اس میں اور قدیم نظامِ سرمایہ داری میں کیا فرق ہے؟ اس میں کارخانہ دار ہم سے زیادہ سے زیادہ محنت کراتا تھا اور ہمیں بقدر ہماری ضروریات کے دیتا تھا۔ یہی کچھ اب آپ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ایسا کیوں کریں؟ اس کا کوئی اطمینان بخش جواب ان کے پاس نہیں تھا۔ انہوں نے اپنا نظام قائم رکھنے کے لئے ڈنڈے سے کام لینا چاہا۔ یہ کچھ وقت کے لئے تو چلا لیکن پھر ناکام رہ گیا۔ کوئی نظام قوت کے بل بوتے پر مسلسل نہیں چل سکتا۔ اس سے مجبور ہو کر روس والوں کو اپنے نظام میں تبدیلی کرنا پڑی۔ یہ جو وہاں اپنے مؤقف سے رجعت ہوئی ہے۔ جسے چین تحریف (REVISIONISM) قرار دے رہا ہے ــــ یہ کسی سیاسی دباؤ یا مصلحت کا پیدا کردہ نہیں۔ یہ اس فلسفہ کی بنیادی کمزوری کا فطری نتیجہ ہے۔ چین ابھی اس منزل میں نیا نیا داخل ہوا ہے۔ اس لئے اس کا مقام یوں سمجھئے کہ وہی ہے جو لینن کے زمانے میں، روس کا تھا۔ اس لئے اسے ابھی اس تحریف کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ جب یہ بحران ختم ہو جائے گا تو وہاں (چین میں) بھی وہی صورت پیدا ہو جائے گی جو روس میں پیدا ہوئی ہے۔ اس لئے کہ اس نظام کی بنیاد یہاں بھی وہی ہے جو روس میں تھی۔ یہ کسی خارجی اثرات کا نتیجہ نہیں۔ یہ اس فلسفہ کی بنیادی کمزوری کا لازمی ثمرہ ہے۔ چنانچہ ماؤزے تنگ کو ابھی سے اس احساس نے ستانا شروع کر دیا ہے کہ چین کی نئی نسل کمیونزم کے مسلک سے ہٹتی جا رہی ہے۔ اسے سنبھالنا چاہیئے۔

اس کے لئے وہاں نوجوانوں پر مشتمل حفاظتی عسکر (RED GUARDS) کے ہاتھوں از سرِ نو اس انقلابی جدو جہد کو شروع کرایا جا رہا ہے جس میں سے ماؤزے تنگ اور اس کی پارٹی کے دیگر رفقا گذرے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اس تحرک (IMPETUS) سے یہ نظام چند قدم اور آگے نکل جائے لیکن اس سے اسے استحکام اور بقا نصیب نہیں ہو سکتی۔ یہ اس کی بنیادی کمزوری ہے جو خارجی محرکات سے رفع نہیں کی جا سکتی۔

اس کے برعکس، قرآن کا فلسفۂ حیات یہ ہے کہ

(۱) انسان کی زندگی محض طبیعی زندگی نہیں۔ انسان جسم کے علاوہ ایک اور شے سے بھی عبارت ہے، جسے اس کی ذات کہا جاتا ہے۔

(۲) مقصدِ زندگی جسم کے تقاضوں کا پورا کرنا بھی ہے اور ذات کے تقاضوں کا پورا کرنا بھی۔ اگر ان دونوں تقاضوں میں ٹکراؤ نہ ہو تو ہو المراد — لیکن اگر ان میں کسی وقت ٹکراؤ ہو جائے تو پھر ذات کے تقاضوں کو جسم کے تقاضوں پر ترجیح دی جائے گی۔

(۳) ذات کے تقاضوں کو پورا کرنے سے اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو جاتی ہے اور اس طرح یہ جسم کی موت کے بعد زندہ رہ کر آگے بڑھتی اور مزید ارتقائی منازل طے کئے چلے جاتی ہے۔ اسے حیاتِ آخرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۴) جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے آپ خود اپنے استعمال میں لائیں۔ مثلاً آپ کے جسم کی پرورش صرف اس شے سے ہوگی جسے آپ خود کھائیں گے۔ اس کے برعکس انسانی ذات کی نشوونما ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے آپ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدیں۔ بالفاظِ دیگر جسم کی نشوونما "لینے" سے ہوتی ہے اور ذات کی نشوونما "دینے" سے۔ قرآن کے الفاظ میں — اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی۔ (۹۲/۱۸)۔ یعنی اس شخص کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے جو اپنی چیزوں کو دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دیتا ہے۔

یہ ہے وہ فلسفۂ حیات، جس کی بنیادوں پر قرآن اپنے معاشی نظام کی عمارت استوار کرتا ہے۔ اس کے معاشی نظام کے اصولی خط و خال یہ ہیں:

(۱) خدا نے سامانِ زیست تمام نوعِ انسان کی پرورش کے لئے بلا مزد و معاوضہ عطا کیا ہے۔ اس لئے ذرائع پیداوار پر کسی کی انفرادی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ایسا کرنا خدا کے مقابلہ میں دوسرے خدا

کھڑے کر دینے کے مرادف ہے۔

(۲) چونکہ اصل مقصدِ حیات، انسانی ذات کی نشو و نما ہے اور وہ اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ انسان دوسروں کی نشو و نما کے لئے زیادہ سے زیادہ دے۔ اس لئے اس نظام میں، ہر فرد کی خواہش اور کوشش یہ ہوگی کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت سے کمائے۔ اپنی کمائی کے ماحصل میں سے، اپنی بنیادی طبیعی ضروریات پوری کرنے کے بعد، باقی سب دوسروں کی نشو و نما کے لئے دیدے يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) — یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لئے دیدیں۔ ان سے کہدو کہ جس قدر تمہاری بنیادی ضروریات سے زائد ہے، سب کا سب۔) تاکہ اس سے اس کی ذات کی زیادہ سے زیادہ نشو و نما ہو جائے۔ اس عمل (PROCESS) کو ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس وقت زکوٰۃ کا مفہوم صرف اس قدر رہ گیا ہے کہ سرمایہ دار جس قدر جی چاہے سمیٹتے چلے جائیں لیکن اس میں سے اڑھائی فی صد خیرات کر دیں۔ لیکن قرآن کی رُو سے اس کا مفہوم کچھ اور ہے۔ زکوٰۃ کے معنی نشو و نما ہیں۔ ایتائے زکوٰۃ کے معنی ہیں — دوسروں کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچانا — یہ اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ہے (۲۲/۴۱) اس میں ہر فرد زیادہ سے زیادہ محنت کرتا اور زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشو و نما کے لئے دیتے جاتا ہے — حتیٰ کہ (اگر ایسا موقع آپڑے) تو وہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتا ہے (۵۹/۹)۔ وہ یہ کچھ کسی خارجی دباؤ یا سیاسی مصلحت کے ماتحت نہیں کرتا۔ یہ اس کی ذات کا تقاضا ہوتا ہے۔ اس میں وہ زیادہ سے زیادہ اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ایتائے زکوٰۃ (یعنی زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشو و نما کے لئے دیتے جانے) کا جذبۂ محرکہ، حیاتِ آخرت پر ایمان کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ (۲۷/۳)۔ یہ صرف اسی تصوّرِ حیات کے ماتحت ممکن ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ کام کرے اور اپنی ضروریات سے زاید سب کچھ دوسروں کی نشو و نما کے لئے دیدے۔ (دوسروں سے مراد اپنی جماعت کے افراد ہی نہیں، بلکہ پوری کی پوری نوعِ انسانی ہے۔)

اور جب اپنی ضروریات سے زاید، سب کچھ دوسروں کے لئے دیدیا جائے گا تو فاضلہ دولت (SUR - PLUS - MONEY) — جو نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ہے — کسی کے پاس رہے گی ہی نہیں۔ نہ ہی جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال پیدا ہوگا، نہ ہی روپیہ سمیٹنے کے لئے باہمی دوڑ (RACE) ہوگی۔ اس میں جو مسابقت (RACE) ہوگی، وہ زیادہ سے زیادہ کام کر کے زیادہ سے زیادہ دوسروں کو

دینے کے لئے ہوگی۔ (تپش)۔

یہ ہے وہ فلسفۂ حیات جس کی بنیادوں پر قرآن اپنے معاشی نظام کی عمارت استوار کرتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ ان ہر دو فلسفوں میں سے کونسا فلسفہ ایسا ہے جس کی بنیادوں پر وہ نظام قائم رہ سکتا ہے جس کا تصور کمیونزم پیش کرتی ہے۔ وہ صرف قرآن کے فلسفۂ حیات کی بنیاد پر قائم ہو سکتا ہے۔

———— ۲ ————

جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، فلسفۂ جدلیت میں دوسرا نقص یہ ہے کہ اس میں قانون اضداد (LAW OF CONTRADICTION) کے علاوہ، کسی قانون، کسی تصور، کسی نظام کو غیر متبدل تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس کا تصور یہ ہے کہ قانونِ اضداد کی رُو سے ایک نظام ظہور میں آجاتا ہے۔ پھر اس میں اس کی ضد کھڑی ہو جاتی ہے اور دونوں میں تصادم شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ وقت کے بعد وہ پہلا نظام مغلوب ہو جاتا ہے اور دوسرا غالب آجاتا ہے۔ پہلے نظام کا دور دورہ ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرے نظام کا عہد شروع ہو جاتا ہے۔ یہ گردشِ دولابی اسی طرح جاری چلی آرہی ہے۔ اسی طرح جاری رہے گی۔ اس وقت اس گردش کی رو سے، سابقہ نظام سرمایہ داری پر اس کی ضد (نظام سوشلزم) غالب آرہا ہے۔ (اس کی اگلی منزل کمیونزم ہوگی) اب اسے محض اتفاق سمجھئے کہ ہم اس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں جب اس نظام کے غلبہ کی باری ہے جو مزدوروں اور محنت کشوں کے لئے زیادہ نفع بخش ہے۔ اس میں نہ مارکس کی فکر کا کوئی دخل ہے، نہ لینن کی عملی کارروائی کا۔ نہ روس کا کوئی کمال ہے، نہ چین کا اعجاز۔ تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کی رو سے ایسا ہونا تھا۔ ایسا ہو رہا ہے۔ اس کے بعد، جب گردش کا دوسرا رخ آئے گا تو یہ نظام مٹ جائے گا اور اس کی جگہ اس کی ضد کوئی دوسرا نظام لے لیگا۔ اس وقت روس اور چین تو ایک طرف، ساری دنیا کے انسان مل کر بھی چاہیں کہ اس قسم کے عادلانہ معاشی نظام کو برقرار رکھ لیں تو ایسا نہیں کر سکیں گے۔ اس وقت اگر نظامِ سرمایہ داری مٹ رہا ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ نظام عدل و انصاف پر مبنی نہیں تھا۔ بلکہ اسلئے کہ اس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں تھی اور اس کی جگہ سوشلزم کا نظام برسر اقتدار آرہا ہے تو یہ بھی اس لئے نہیں کہ یہ نظام نوعِ انسان کے لئے زیادہ منفعت بخش ہے۔ یہ تو صرف اپنی اپنی باری کا سوال ہے۔ اُس کی باری ختم ہو رہی ہے اس لئے وہ جا رہا ہے۔ اس کی باری آرہی ہے اس لئے یہ آرہا ہے۔ کل کو جب اس کی باری ختم ہو جائے گی تو

یہ بھی چلا جائے گا اور مزدوروں اور محنت کشوں کی ہزار آہ وفغاں اور ان کے حامیوں کی لاکھ سعی وکاوش بھی اسے برقرار نہیں رکھ سکے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہو وقت کمیونزم کیطرف سے دنیا کے سامنے اس کا معاشی نظام پیش کیا جارہا ہے اس کا فلسفہ نہیں۔ اس نظام کے متعلق بدلائل و شواہد بتایا جارہا ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلہ میں انسانیت کے لئے آیۂ رحمت ہے۔ اور یہ واقعہ بھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب اس نظام کی باری ختم ہو جائیگی اور یہ اپنی مسند خالی کر رہا ہوگا اور اس کی جگہ دوسرا نظام لے رہا ہوگا جو اس کی ضد ہوگا تو اس وقت کمیونزم کے حامی دنیا کو کیا کہیں گے؟ اس وقت ان کے تمام دلائل و شواہد جو یہ موجودہ نظام (کمیونزم) کے حق میں پیش کر رہے ہیں، سب باطل قرار پا جائیں گے۔ اس وقت انہیں بھی اس آنے والے نظام کی حمایت کرنی ہوگی۔ ورنہ جو درگت اس وقت نظام سرمایہ داری کے حامیوں کی بن رہی ہے۔ وہی کچھ ان کے ساتھ بھی ہوگا۔ اس لئے کہ نظام سرمایہ داری کے حامیوں کا قصور اتنا ہی ہے تاکہ وہ جدید نظام کا ساتھ نہیں دیتے جانے والے نظام کے ساتھ لپٹے ہوئے ہیں۔ اگر اس وقت کمیونزم کے حامیوں نے اس جدید نظام کا ساتھ نہ دیا، تو وہ بھی اسی جرم کے مرتکب قرار پائیں گے جس جرم کی بنا پر اس وقت نظام سرمایہ داری کے حامیوں کو موردِ الزام قرار دیا جارہا ہے۔

پھر یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اس وقت ماؤزے تنگ اپنی قوم کو کمیونزم کے معاشی نظام کی برکات کی بنا پر اس مقام تک لے آیا ہے۔ کل کو جب اس نظام کی باری ختم ہو جائے گی تو پھر اس قوم سے کیا کہا جائے گا اور ان کے لئے وجۂ جامعیت کیا چیز ہوگی؟

اصل یہ ہے کہ ماؤزے تنگ کا فلسفۂ اضداد، فلسفۂ جبریت (DETERMINISM) ہی کی ایک شاخ ہے، جس کی رو سے انسان کی حیثیت کائنات کی عظیم مشینری میں ایک بے بس پرزے سے زیادہ کچھ نہیں، جو مشین کی حرکت کے ساتھ چلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ فلسفہ یونان کی فکرگاہوں سے ابھرا اور انسانیت کو تباہ کرتا ہوا مختلف بھیس بدل کر یہاں تک آپہنچا ہے۔ یہی وہ فلسفہ تھا جس سے متاثر ہو کر ہندوؤں نے تناسخ (آواگون) کا عقیدہ وضع کیا اور عیسائیت نے "اوّلین گناہ (ORIGINAL SIN)" کے کلنک کا ٹیکہ انسانیت کی پیشانی پر لگایا جو کسی کے دھوئے دُھل نہیں سکتا۔ مغرب کے مفکرین اور سائنسدانوں نے عیسائیت کو تو خیرباد کہہ دیا لیکن وہ اس کے اس فلسفہ کے چکر سے نہ نکل سکے۔ چنانچہ ان کی ہر تحقیق کا رُخ اسی طرف جاتا ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے۔ اسی سے ہیگل متاثر تھا اور یہی مارکس

بیچارے کے اعصاب پر سوار رہا۔ اب وہی تصور، فلسفۂ اضداد کے روپ میں سامنے آیا ہے جس میں نظام خود بخود بدلتے رہتے ہیں اور انسان، ہر آنے والے نظام کا ساتھ دینے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ نہ اس کی برائیاں، کسی مروجہ نظام کا کچھ بگاڑ سکتی ہیں، نہ اس کی اچھائیاں، اس کا کچھ سنوار سکتی ہیں۔

اس کے برعکس قرآن یہ کہتا ہے کہ ایک نظام فی ذاتہٖ اچھا ہوتا ہے اور دوسرا نظام فی ذاتہٖ خراب ہوتا ہے۔ جو اچھا ہوتا ہے اس میں قائم رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے، جو خراب ہوتا ہے وہ باقی نہیں رہ سکتا۔ اچھے نظام کا معیار یہ ہے کہ

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷)

جو نظام تمام نوعِ انسان کے لئے نفع بخش ہوتا ہے وہی نظام اچھا ہوتا ہے اور اس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

اس کے برعکس، إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ - (۶/۱۳۵) - جو نظام سلب و نہب اور ظلم و جور پر مبنی ہوگا اسے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ چونکہ محو و ثبات کا یہ قانون غیر متبدل ہے۔ اس لئے اس کے خلاف ہو نہیں سکتا۔ بات ساری وقت (TIME) کی ہے اگر انسانوں کی کوئی جماعت اس کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی۔ تو یہ ظلم پر مبنی نظام جلد مٹ جائے گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اس میں وقت لگ جائیگا۔ قرآن کریم نے اس کی ایک مثال بھی دی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ نظام جاگیرداری (FEUDAL - SYSTEM) - جس میں زمین کے بعید و نہایت رقبے افراد کی ملکیت میں چلے جاتے ہیں، ظلم پر مبنی نظام ہے یہ مٹ کر رہے گا۔ خدا کے کائناتی قانون کی رو سے ایسا بتدریج ہوگا۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا وَاللَّهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ○ (۱۳/۴۱)

کیا یہ لوگ اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ ہم کس طرح زمین کے رقبوں کو جاگیرداروں کی ملکیت سے کم کرتے جا رہے ہیں۔ یہ خدا کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے جسے کوئی پلٹا نہیں سکتا۔ وہ بہت جلد حساب کر دیتا ہے (لیکن اس کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار سے ایک ایک ہزار سال کا ہوتا ہے)۔

لیکن جب عہد نبی اکرمؐ میں، جماعتِ مومنین اس قانون کو عملاً نافذ کرنے کے لئے اٹھ کھڑی

ہوئی، تو وہی انقلاب جسے اپنی رفتار سے ہزاروں سال میں جاکر مکمل ہونا تھا، چند سال کے عرصہ میں ظہور میں آگیا عہد نبی اکرمؐ میں، زمین کو بٹائی، یا کرایہ پر دینے کی ممانعت کر دی گئی اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں تمام زمین، نظامِ معاشرہ کی تحویل میں آگئی ۔ اس کے بعد جب اس جماعت کے جانشینوں نے اس قانونِ خداوندی سے اعراض برتا، تو اس قانون نے پھر اپنی کائناتی رفتار سے آگے چلنا شروع کر دیا اور اب یہ صدیوں کی مسافت طے کرنے کے بعد، پھر عملاً متشکل ہوتا نظر آ رہا ہے ۔ یہی مثال دوسرے غلط نظامہائے حیات پر بھی صادق آتی ہے۔

یہ ہے قرآن کا پیش کردہ قانونِ محو و ثبات ــــ یہ تاریخی دجوب کی اندھی قوت کی پیدا کردہ گردشِ دولابی نہیں ۔ اس میں اصول یہ ہے کہ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ۔ (۸/۴۲)۔ جو مٹتا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رو سے مٹتا ہے، جو زندہ رہتا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رو سے زندہ رہتا ہے ۔ اور وہ دلیل و برہان یہ ہے کہ

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۔ (۱۳/۱۷)

زندہ وہ رہتا ہے جو نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔

اس نقطۂ خیال سے بھی آپ دیکھئے کہ جدلیت کے فلسفہ اور قرآنی فلسفہ میں سے کس میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ ایسے نظام کو قائم کر سکے اور باقی رکھ سکے جو انسانیت کے لئے نفع بخش ہو؟

حرفِ آخر

نظامِ کائنات پر غور کرنے سے چند ایک اہم حقیقتیں ہمارے سامنے آتی ہیں ۔ مثلاً:۔

(۱) صفحۂ ارض پر زندگی کی نمود سے پہلے ہی یہاں سامانِ زیست موجود تھا اور موجود چلا آ رہا ہے۔ زندگی خواہ اوّلین جرثومہ کی شکل میں ہو اور خواہ بلند ترین حیوانی پیکر میں، جن اشیاء پر ان کے قیام و بقا کا انحصار ہے ــــ پانی، روشنی، حرارت، ہوا، خوراک، وغیرہ ــــ وہ سب کچھ ساتھ موجود رہتا ہے ۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ سلسلہ یونہی اتفاقاً وجود میں نہیں آگیا ۔ یہ کسی سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت کارفرما ہے اور سراسر حکمت پر مبنی۔

(۲) یہ سامانِ زیست ان اشیاء کا خود پیدا کردہ نہیں، کسی اور کا عطا کردہ ہے۔ یعنی جس نے انہیں زندگی دی ہے اس نے سامانِ زندگی بھی پیدا کر دیا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں:۔

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶)۔

زمین پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہیں۔

(۳) صفحۂ ارض پر کوئی شئے (انسان کے علاوہ) ایسی نہیں جو سامانِ زیست کو انفرادی ملکیت میں لے بیٹھے۔ وہ صرف اپنی ضرورت پوری کرتی ہے — وَ كَأَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا۔ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَ إِيَّاكُمْ۔ (۲۹/۶۰) —۔ ذرا سوچو تو سہی کہ کتنے ذی حیات ہیں جو اپنا رزق اپنی پیٹھ پر لادے لادے پھرتے ہیں۔ سامانِ زیست، مائدہ، ارض پر تمہارے لئے اور ان کے لئے بکھرا پڑا ہے۔

ان میں سے جو ذی حیات رزق کا ذخیرہ بھی کرتے ہیں (مثلاً چیونٹیاں یا شہد کی مکھیاں وغیرہ) تو وہ بھی ان سب کی اجتماعی ضرورت کے لئے ہوتا ہے۔ انفرادی ملکیت کا سوال وہاں بھی نہیں ہوتا۔

(۴) انسانوں کے لئے بھی اسی انداز کی زندگی بسر کرنا منشائے فطرت تھا۔ اسے قرآن (قصہ آدم کے تمثیلی رنگ میں) اس زمین پر جنّت کی زندگی سے تعبیر کرتا ہے یعنی وہ زندگی جس میں کیفیت یہ ہو کہ:

إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَ لَا تَعْرٰى وَ أَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيهَا وَ لَا تَضْحٰى۔ (۲۰/۱۱۸)

اس میں تجھے نہ بھوکے رہنے کا غم ستائے نہ پیاس پریشان کرے۔ نہ اس میں لباس کے لئے متفکر ہونا پڑے، نہ مکان کے لئے سرگرداں۔

اس میں کیفیت یہ ہونی چاہیئے کہ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا۔ (۲/۳۵)۔ جہاں کسی کو ضرورت ہو، پیٹ بھر کر کھانے کو مل جائے۔ ذرائع رزق ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوں، سَوَآءً لِّلسَّآئِلِينَ۔ (۴۱/۱۰)۔

(۵) لیکن انسان کی مفاد پرستیوں نے، سامانِ زیست پر انفرادی ملکیت کا تصور پیدا کر کے اس جنّت کو جہنم میں تبدیل کر دیا۔ اس پستی کو قرآن نے ہبوطِ آدم سے تعبیر کیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

ہر فرد، دوسرے کا دشمن ہوگیا۔ (وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔ (۲/۳۶)۔

(۴) اب مقصودِ فطرت یہ ہے کہ انسانی دنیا میں پھر سے وہی جنتی زندگی کا نقشہ قائم ہو جائے۔ اور اس طرح "جنت سے نکلا ہوا آدم پھر سے جنت کو پالے"۔ خدا کا کائناتی قانون، اسی نقشہ کو قائم کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، اس کی رفتار (ہمارے حساب و شمار کے مطابق) بہت سست ہے۔ اس کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہے۔

اس رفتار کو تیز کرنے کے لیے آسمانی دعوتِ انقلاب کے داعی، حضرات انبیاء کرام وقتاً فوقتاً آتے رہے۔ وہ اپنے حلقۂ اثر میں اس نقشہ کو قائم کرتے ——— یعنی سامانِ زیست کو تمام افرادِ انسانیہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے عام کر دیتے۔ (اسے نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے) ——— لیکن ان کے بعد مفاد پرست گروہ پھر آگے بڑھ آتا۔ اور اس نقشہ کو الٹ کر پھر سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کر دیتا ——— یہ کچھ ایسے لوگوں کی مدد سے ہوتا، جو مقدس لبادوں میں ملبوس ہو کر عوام سے کہتے کہ منشاءِ خداوندی بھی یہی ہے۔ انہیں مذہبی پیشوا کہا جاتا ہے۔

آخری مرتبہ" وہ جنتی نقشہ "خدا کے آخری نبی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں متشکل ہوا اس کے کچھ عرصہ بعد، مفاد پرست گروہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی شکل میں پھر آگے بڑھ آیا، انہوں نے باطل کا نظامِ سرمایہ داری قائم کر دیا اور خدا کا کائناتی قانون پھر سے اپنی رفتار سے آگے بڑھنے لگا۔

اب نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا اس لیے اب جنتِ ارضی کی تشکیل کی دو صورتیں تھیں۔

(الف) جس امت کو اس آخری نبی کے پیغام (قرآن) کا وارث قرار دیا گیا تھا، وہ اس نظام کو اپنے دست و بازو سے قائم کرتی اور باقی رکھتی ——— اور اگر وہ ایسا نہ کرتی ——— تو

(ب) زمانے کے تقاضے انسان کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیتے۔ اس شکل میں دشواری یہ ہوتی ہے کہ یہ نظام بیک جست اپنی منزہ صورت میں سامنے نہیں آسکتا۔ ابتداءً بڑی دھندلی سی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور پھر تجرباتی طریق سے بتدریج اپنی منزہ شکل تک پہنچتا ہے۔

ہم (وارثین کتاب اللہ) نے اپنا فریضہ ادا نہ کیا، تو اس انقلاب نے دوسری شکل اختیار کر لی۔ عصرِ حاضر میں اس کی پہلی نمود مارکس کی فکر میں سامنے آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مارکس کے سینے میں قلبِ حساس تھا، جو مظلوم و مقہور انسانوں کی حرماں نصیبی پر ——— جن پر بالادست انسانوں کی چیرہ دستیوں

نے رزق کے دروازے بند کر دیئے تھے ـــــ خون کے آنسو روتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح ان کے دُکھ دور ہو جائیں۔ وحی کی حقیقی روشنی (قرآنی تعلیم) اس کے سامنے نہیں تھی۔ اس کے سامنے عیسائیت تھی جو لفظاً انسانیت کے دکھوں پر آنسو بہانے کی مدعی ہونے کے باوجود، عملاً اس نقشہ کو قائم رکھنے کا موجب تھی جس سے یہ تمام دُکھ وجود میں آتے ہیں ـــــ جب آپ خدا پرستی کے لئے دنیا کو تیاگ دینے یا اسے قابلِ نفرت سمجھنے کو اولین شرط قرار دیدیں اور مظلوموں کے دکھ دور کرنے کے لئے عدل کے بجائے رحم کی بھیک مانگیں، تو مستبد قوتیں دندناتی پھریں گی۔ انہیں ظلم وستم سے روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ مارکس نے اس حقیقتِ حال پر غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان چیرہ دستیوں کا بنیادی سبب مذہب کا تصور ہے ـــ اس لئے اس نے مذہب کو انسانیت کا اولین دشمن قرار دیدیا۔ اگر اس کے سامنے "مذہب" کے بجائے "دین" (قرآن کریم) ہوتا تو وہ اس نتیجہ پر کبھی نہ پہنچتا۔

روس میں بھی، یہی عیسائیت کا دَور دورہ تھا۔ اس لئے لینن بھی خدا کے متعلق، اسی نتیجہ پر پہنچا، کہ اس کا تصور، مفاد پرستیوں کا پیدا کردہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب خدا پر ایمان نہ رہے تو انسانی ذات، وحی، حیاتِ آخرت پر ایمان تو خود ختم ہو جاتا ہے۔

چین میں مذہب کے سلسلہ میں حالات اس سے بھی بدتر تھے۔ وہاں، ایک چھوڑ، تین تین قدیم مذاہب مروج تھے۔ اور تینوں کے تینوں توہم پرستی کے مظاہر، کنفیوشس ازم، کی تعلیم خالصتہً اسلاف پرستی تھی جس میں جمود و تقلید سب سے بڑی نیکی اور تغیر و اصلاح کا تصور سب سے بڑا گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ (بعینہٖ اسی طرح جس طرح ہمارے ہاں مذہبی پیشوائیت تقلید کو عین دین پیش کرتی اور ہر تغیر اور جدّت کو جہنم کے عذاب کا موجب قرار دیتی ہے) طاؤ ازم، گیان دھیان میں مست رہ کر دنیا تیاگ دینے کی تعلیم دیتا تھا۔ بدھ مت اس سے بھی چار قدم آگے تھا۔ اس میں منتہائے زندگی نروان حاصل کرنا ہے جس سے مراد اپنے آپ کو قاطبتہً فنا کر دینا ہوتا ہے۔ ماؤزے تنگ کے سامنے یہ مذاہب تھے۔ اس لئے اس کا ردِ عمل ظاہر ہے۔ اس نے فکری طور پر ہیگل، بلکہ مارکس سے بھی اختلاف کیا۔ لیکن مذہب کے خلاف اس کی شدت ان سے بھی زیادہ بڑھ گئی ـــ ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ اتنا بڑا انقلابی ذہن جمود و تعطل کے اس جذام کو کیسے گوارا کر لیتا؟ ـــ لیکن چونکہ دین اس کے سامنے بھی نہیں تھا، اس لئے اس نے بھی اپنے فلسفہ کی بنیاد اپنے قیاسات ہی پر رکھی۔ وہ اس کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔

یہ ہے وہ فلسفہ جس کا اجمالی تعارف ہم نے شروع میں کرایا تھا اور جس کی بنیادوں پر وہ اتنے عظیم معاشی نظام کی عمارت استوار کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فلسفہ کی بنیادوں پر یہ عمارت قائم نہیں رہ سکتی۔ جب چین میں ان السابقون الاوّلون (PIONEERS) کی موجودہ نسل ختم ہو جائے گی تو پھر آئندہ نسل کے لیے، اتنی بڑی قربانیوں کے لیے کوئی جذبۂ محرکہ نہیں رہے گا۔ اور چینی انقلاب بھی اسی تحریف (REVISIONISM) پر مجبور ہو جائے گا جس کا طعنہ وہ اس وقت روس کو دے رہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ پہلے روس اور اس کے بعد چین کی ان انقلابی جماعتوں نے کائناتی قانون کی تائید کے لیے ہاتھ اٹھایا کہ اس کی رفتار میں تیزی پیدا کر دی ہے۔ لیکن چونکہ ان کے انقلاب کی اساس و بنیاد محکم نہیں، اس لئے یہ انقلاب ایک ہنگامی حادثہ بن کر رہ جائے گا۔ اور اس کے بعد، اگر کائناتی قانون نے اپنے حساب سے "ایک دن" کی بھی مزید "تاریخ ڈال دی" تو انسانیت کو صدیوں تک پھر سرمایہ داری کے آہنی شکنجہ میں جکڑے رہنا پڑے گا۔ لیکن اگر اس وقت، اس معاشی انقلاب کو قرآن کی اساس محکم مل جائے تو پھر نظام سرمایہ داری سر نہیں اٹھا سکے گا۔ اور جنت سے نکلا ہوا آدم، اپنے فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے پالے گا۔ اقبالؒ نے نیٹشے کے فکر کی بلندی اور اس کی بنیاد کی پستی کو دیکھ کر کہا تھا کہ ؎

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبالؔ اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے؟

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اُس "مجذوبِ فرنگی" سے کہیں زیادہ ضرورت آج اس "سالکِ چینی" کو مقامِ کبریا سے آگاہ کرنے کی ہے۔ یہ اس لئے کہ مقامِ کبریا کے راستے میں جو خاردار جھاڑیاں دامنگیر ہوتی ہیں چین نے انہیں راستے سے الگ کر دیا ہے ـــ وہاں بادشاہی، مذہبی پیشوائیت، اور سرمایہ داری کی قوتیں ختم ہو چکی ہیں۔ اور یہی وہ خاردار جھاڑیاں ہیں جو انسان کو "خدا" تک پہنچنے نہیں دیتیں ـــ یہ وہ حصۂ لَآ ہے جسے طے کئے بغیر انسان اِلَّا اللہ تک پہنچ نہیں سکتا۔ چین ان منفی منازل کو طے کر لینے کے بعد دینِ کی منزل اِلَّا کی سرحد پر کھڑا ہے۔ اگر اس وقت اُسے اس مقام کی نشاندہی کر دی جائے اور وہ اس راستے کو اختیار کر لے، تو صرف چین ہی نہیں، عالمگیر انسانیت اس جہنم سے بچ سکتی ہے جس میں اسے بصورتِ دیگر نمعلوم کتنے عرصے تک اور مبتلائے مصائب رہنا پڑے اور اس سے نکلنے کے لئے خدا جانے اسے کتنی خون کی ندیاں پیرنی۔ اور آگ کے دریا عبور کرنے پڑیں ـــ مسلم ممالک میں سے اس وقت کوئی بھی اس کے لیے

آمادہ نظر نہیں آتا، کہ وہ قرآن کے انقلابی پروگرام کو اپنے ہاں عملاً متشکل کردے۔ یہ ممالک ابھی حصۂ لا ہی سے نہیں نکلے، حصۂ اِلّا تک کیسے پہنچ سکیں گے۔ پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا تھا، کہ اس سے "اسلام اس چھپے کو مٹا سکے گا جسے عربی ملوکیت نے اس پر ثبت کر دیا تھا"۔ لیکن یہاں جس تیزی سے مذہبی پیشوائیت اپنا تسلط جاری ہے اس کے پیش نظر یہاں دین کے تمکن کے امکانات بہت پیچھے جا پڑے ہیں۔ یاد رکھئے! مذہبی پیشوائیت کا اقتدار نظام سرمایہ داری کے ماتحت کا پیمانہ ہوتا ہے ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک کے بڑھنے سے دوسری بڑھتی ہے اور ایک کے گھٹنے سے دوسری گھٹتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں دین کے انقلابی پروگرام کے راستے میں مزاحم ہوتی ہیں خواہ وہ وحی کی راہ نمائی میں وجود کوش ہو، اور خواہ زمانے کے تقاضوں سے۔ یہ وجہ ہے، جو میں سمجھتا ہوں کہ اگر قرآن کا پیغام کسی طرح ماوزے تنگ تک پہنچ جائے اور وہ اسے سمجھنے پر آمادہ ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ اس سے نوعِ انسان کی تقدیر بدل جائے اور اقبال نے حکیم سنائی کے اس مصرعہ کے اندر چھپی ہوئی جس 'قیامت پیش از قیامت' کا خواب دیکھا تھا، جنت سے نکلا ہوا آدم اس خواب کی تعبیر کو اپنی آنکھوں کے سامنے متشکل دیکھ لے ــــ یہ خواب، اُس نظم کے ایک بند میں مرقوم ہے جسے علامہ نے حکیم سنائی کے مزار کے سرہانے کھڑے ہو کر کہا تھا۔ یعنی

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا، وہاں بے ذوق ہے صہبا
نہ ایراں میں رہے باقی نہ توراں میں رہے باقی!
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسریٰ!
یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ
حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے پیدا!
ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے
"گرفتہ چینیاں احرام و مکّی خفتہ در بطحا!" (یہ مصرعہ حکیم سنائی کا ہے)

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تاریخ نے ہمیں ایک عجیب مقام پر لاکر کھڑا کردیا ہے۔ ایک طرف مغربی جمہوریتیں ہیں جن کا نظام سرمایہ دارانہ ہے لیکن وہ (عیسائی یا یہودی ہونے کی جہت سے) اپنے آپ کو خدا پرست کہتی ہیں - لیکن قرآن کریم اس قسم کی خدا پرستی کو خدا پر ایمان قرار ہی نہیں دیتا۔ خدا پر ایمان کے معنی یہ نہیں کہ آپ اپنے ذہن کے تراشیدہ (یا اپنے مذہب کے پیش کردہ) خدا کے تصور کے مطابق خدا کو مانیں - خدا پر ایمان کے یہ معنی ہیں کہ آپ خدا کے اس تصور پر ایمان رکھیں جو تصور اس نے خود اپنے متعلق دیا ہے۔ اور وہ تصور قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ قرآن کریم نے اہل کتاب سے بھی یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ خدا پر ایمان لائیں۔ لہذا، قرآنی نقطۂ نگاہ سے، نہ اہل مغرب خدا پرست ہیں اور نہ ہی ان کا نظام، قرآنی نظام کے مماثل ہے - بلکہ وہ اس کی ضد ہے۔ انکی طرف سے یہ نعرہ کہ

"دنیا کے خدا پرستو! آؤ اور اشتراکیت کے خدا فراموش نظام کے خلاف متحدہ محاذ بناؤ"

محض ایک سیاسی نعرہ ہے جو مسلم اقوام کو اپنے دام تزویر میں پھنسانے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔

دوسری طرف کمیونزم ہے جس کا نظام تو قرآنی نظام کے مماثل ہے لیکن اس کا فلسفۂ حیات قرآنی فلسفۂ زندگی کی نقیض ہے۔ اس لئے وہ بھی، قرآنی نقطۂ نگاہ سے، مسلمان کے لئے قابل قبول نہیں ہوسکتی۔ واضح رہے کہ جس طرح قرآن اپنے نظام کو فلسفۂ حیات سے الگ نہیں کرتا، اسی طرح کمیونزم بھی اپنے معاشی نظام کو اپنے فلسفۂ زندگی سے جدا نہیں کرتی۔ کمیونسٹ کے لئے ضروری ہے کہ وہ کمیونزم کے فلسفۂ حیات اور اس پر متفرع معاشی نظام کو ایک وحدت کی طرح تسلیم کرے۔ یہ وجہ ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ نہ ایک کمیونسٹ مسلمان ہوسکتا ہے اور نہ ایک مسلمان کمیونسٹ۔

تیسری طرف ہم مسلمان ہیں جن کے ہاں قرآن کریم کے الفاظ تو بے شک محفوظ ہیں لیکن، عملاً نہ ہمارا نظام قرآنی ہے، نہ فلسفۂ زندگی قرآنی۔ ہم بھی درحقیقت اسی مقام پر ہیں جس مقام پر مغرب کے اہل کتاب ہیں ـــ اس فرق کے ساتھ کہ ان کے پاس خدا کی راہ نمائی اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں اور ہمارے پاس وہ (غلافوں میں لپٹی ہوئی) محفوظ رکھی ہے۔

ان حالات کے پیش نظر علامہ اقبالؒ نے جو کہا تھا کہ 'اگر اشتراکیت کے ساتھ خدا کو شامل کرلیا جائے

تو وہ اسلام کے مماثل ہو جاتی ہے۔ تو یہ فارمولا کاروانِ انسانیت کے لئے منزلِ مقصود کی صحیح نشاندہی کر سکتا ہے۔ لیکن (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس کے لئے مسلم ممالک ابھی آمادہ نہیں۔ وہ اس تصورِ حیات سے ہنوز بہت بہت دور ہیں۔ لیکن دین خداوندی پر کسی خاص قوم کی اجارہ داری نہیں کہ وہ اسے چلانا چاہے تو وہ چل سکے اور اگر وہ اسے نظرانداز کر دے تو دین اسے بے حس و مجبور بیٹھا اس کا منہ تکتا رہے۔ یہ تمام نوعِ انسانی کی مشترکہ وراثت ہے۔ دنیا کی جو قوم بھی اسے اپنانا چاہے، دین اسی کا ہو جاتا ہے۔ وہ ہر مخاطب قوم سے کہتا ہے کہ دین کا نقشہ تمہارے سامنے آچکا ہے — فَاِنْ تَوَلَّوْا..... يَسْتَخْلِفْ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ اگر تم اسے اپنانا چاہتے ہو تو بہو المراد۔ لیکن اگر تم اس سے روگردانی چاہتے ہو تو خدا تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئے گا، جو اسے اپنا لے گی۔ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْئًا۔ (۱۱/۵۷)۔ اور تم اس کا کچھ بگاڑ نہ سکو گے۔ دین ایک خاص فلسفۂ حیات کے مطابق نظامِ زندگی متشکل کرنے کا نام ہے۔ جو قوم بھی ایسا کرنا چاہے دین لبیک کہہ کر اسے سینے سے لگا لے گا۔

اٹھا لے جو بڑھ کر ہاتھ میں ساغر اسی کا ہے

لہٰذا بہ حالاتِ موجودہ کشاد کی راہ ایک ہی نظر آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر اشتراکی ذہن پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ جس فلسفہ پر وہ اپنے معاشی نظام کی عمارت استوار کرنا چاہتا ہے اس کی بنیادیں اس عمارت کے بوجھ کی متحمل نہیں ہو سکتیں، یہ عمارت قرآنی فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر ہی استوار ہو سکتی ہے، تو امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کر لے۔ اس وقت اشتراکی ذہن کا سب سے بڑا نمائندہ ماؤزے تنگ ہے۔ چین کے ستر کروڑ نفوس اس کی فکر کی پرستش کرتے ہیں اور چین سے باہر کس قدر اذہان اس فکر سے بالواسطہ متاثر ہیں! اس کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ پوزیشن دنیا میں اس وقت کسی اور مفکر کو حاصل نہیں، اور نہ ہی عملی انقلاب سے اس وقت کوئی دوسرا انسان ایسا نظر آتا ہے جو اسلام جیسے عالمگیر انقلاب کو اپنے ہاں عملاً نافذ کرنے کی ہمت اور صلاحیت رکھتا ہو۔ اگر اس ایک ذہن کی سوچ میں قرآنی تبدیلی آجائے تو عالمِ انسانیت میں اس سے بڑا انقلاب اور کونسا ہو سکتا ہے۔ اس سے فی الواقعہ دنیا میں قیامت سے پہلے وہ قیامت برپا ہو سکتی ہے جس کا تصور اقبالؒ نے پیش کیا تھا اور جس نے "پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانوں سے" کی جو نادر حقیقت بیان کی تھی، عجب کہ اس کی تائید میں ایک اور شہادت دنیا کے سامنے آجائے۔

مجھے اس کا احساس ہے کہ ہمارے ہاں (ہر کمزور قوم کی طرح) یہ ذہنیت چلی آرہی ہے کہ دنیا میں جونہی کسی بڑے آدمی نے غلبہ و اقتدار حاصل کیا تو اس کے متعلق یا تو ہم نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ "وہ اندر سے مسلمان ہی ہے" اور یا اس کے مسلمان ہونے کی دعائیں مانگنے لگ گئے۔ لیکن میرے اس خیال کی محرک یہ ذہنیت نہیں —— میں اس نتیجہ پر جن دلائل وجوہات کی بنا پر پہنچا ہوں، انہیں میں نے تفصیل سے پیش کر دیا ہے۔ اگر ارباب فکر و نظر کو اس تجزیۂ حالات میں کوئی سقم نظر آئے تو اس کی نشاندہی کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں گا —— میری قرآنی بصیرت نے بہر حال مجھے اسی نتیجہ پر پہنچایا ہے اور وہی مجھے اس پر بھی مجبور کر رہی ہے کہ میں اسے ارباب علم و بصیرت کے سامنے کھلے الفاظ میں پیش کر دوں۔ کیونکہ کتمانِ حقیقت قرآن کی رُو سے، انسانیت کے خلاف جرم عظیم ہے۔

آخر میں، میں اتنا اور واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ سابقہ صفحات میں ماؤزے تنگ کی فکر پہ جو تنقید کی گئی ہے تو اس سے اس کی تنقیص مقصود نہیں۔ قرآن کریم عقلِ انسانی کا مقام بہت بلند قرار دیتا ہے۔ اور اس سے کام لینے کی بڑی تاکید کرتا ہے۔ اس لئے جو شخص بھی عقل و فکر سے کام لے کر زندگی کے مسائل سلجھانے کی کوشش کرے گا، وہ ہمارے نزدیک مستحق تحسین و ستائش ہے۔ لیکن وہ کہتا یہ ہے کہ جس طرح (مثلاً) انسانی نگاہ کی ایک حد ہے جس سے آگے کی چیز اسے نظر نہیں آسکتی، اسی طرح عقلِ انسانی کی بھی ایک حد ہے جس سے آگے وہ جا نہیں سکتی۔ وحی کی راہنمائی ایک دوربین ہے جس سے عقلِ انسانی کی آنکھ اپنی عام حد سے بہت آگے کی چیزیں دیکھ سکتی ہے۔ ماؤزے تنگ (یا دیگر مفکرین) کی حد نگاہ یقیناً عام انسانوں سے زیادہ وسیع ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اسے وحی کی راہ نمائی کی دوربین مل جائے تاکہ وہ راستے کے ان مقامات کو یقین کی آنکھ سے دیکھ سکے جسے اس وقت وہ محض قیاس کی لکڑی سے ٹٹولتا ہے۔ اس لئے غلطی کھا جاتا ہے۔ ہم اگر اس وقت اس سے زیادہ دور کی چیزیں دیکھ سکتے ہیں تو اس میں ہماری آنکھ کا کوئی کمال نہیں۔ یہ اس دوربین کی خوبی ہے —— یہ دوربین اگر اس مفکر کے ہاتھ میں دیدی جائے تو وہ ہم سے بہت زیادہ آگے دیکھ سکیگا۔ اس لئے خود بھی راستے کے خطرات سے محفوظ رہے گا۔ اور کاروانِ انسانیت کو بھی بحفاظت اس کی منزل تک لے جاسکے گا —— یہ ہے میری آرزو کا مقصود، اور میری سعی و کاوش کا مطلوب۔

یارب: ایں آرزوئے من چہ خوش است!

(جنوری ۱۹۶۷ء)

ایک خط
اور
اس کا جواب

ذیل کا خط بغور ملاحظہ فرمایئے۔

بندہ ایک سال سے آپ کی تصنیفات کا مطالعہ کر رہا ہے اور طلوعِ اسلام بھی برابر زیرِ نظر ہے۔ آپ نے قرآنِ حکیم کی تفہیم جس نہج پر دو چار کی ہے اپنی نوعیت میں بالکل منفرد ہے۔ تاریک خیال ملّا کا آپ سے سیخ پا ہونا ایک قدرتی اور فطری امر ہے۔ آپ نے ثابت کیا ہے کہ قرآنِ حکیم نظامِ ربوبیت کا داعی ہے۔ اور حضرت علامہ اقبالؒ مرحوم کا کلام بھی آپ کے ممنون ہے۔ چونکہ نظامِ ربوبیت اپنے خواص میں انقلابی فطرت کا ہے اور مُلّا ازم فطرتاً اس کی ضد ہے۔ بقول کسے :۔

ہرگز مگو کہ شیخ شود اہلِ انقلاب

با در مکن کہ ہست در عالم غراب سُرخ

پرویز صاحب: نظامِ ربوبیت سے جو آپ کی غایت ہے وہ بالکل درست ہے لیکن ذرائع حصول میں مجھے اختلاف ہے لہذا اپنے سوال کا جواب بہ توسل طلوع اسلام چاہتا ہوں۔ اگر جواب مذہبی عقیدتمندی کے جذبات سے ذرا ہٹ کر مدلل اور تاریخی جواب وحقائق کا حامل ہو تو میرے لئے زیادہ مؤثر و مسکت ہوگا۔

قدیم اشتراکی نظام سے لے کر آج تک تدریجی ادوار میں ارتقائی قوانین قدرت جاری و ساری ہیں۔ مادی تاریخ ان ادوار کا تعین کرتی چلی آرہی ہے۔ مذہب کی دخیل کاری مادی تاریخ کے عوامل میں دست انداز نہیں ہوئی ہے۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے ابتدائی ایام میں تاریخ کے مادی تقاضوں سے تحرّلی اور ایک مخصوص خطہ میں ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کی جو سراسر اپنی فطرت کے لحاظ سے اس وقت کے مادی دور سے جو اس زمانہ کا طبعی تاریخی دور تھا الگ تھلگ تھا۔ یہ پیغمبر اسلام کی بے پناہ روحانیت کا کرشمہ تھا اور تاریخی تجربہ جو ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن شارع اسلام کے رخصت ہوتے ہی چند ماہ و سال کے اندر یہ اسلامی نظام جو تاریخی لحاظ سے قبل از وقت تھا ختم ہو گیا اور "مستثنیات" و اقعات کی تعریف میں جگہ پا گیا۔ وہ لوگ جنہوں نے اپنے رسولِ پاکؐ سے بنفسِ نفیس تربیت پائی تھی۔ اور قیصر و کسریٰ کو اس واسطے ختم کیا تھا کہ یہ غیر صالح نظام کے نمائندہ ہیں۔ چند ہی روز کے بعد آپ غیر صالح نظام کے شہنشاہ بن کر جلوہ نما ہوئے اور تاریخ کا تیز رو دھارا اسی سمت ہی بہتا رہا جس سمت سے اس کو غیر طبعی طور پہ موڑنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کیونکہ تاریخ کے ارتقائی مادی تقاضے ہی تاریخ سے عبارت ہیں۔

یہ امر بالکل غیر طبعی اور غیر فطری ہے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی بڑھاپے کی عمر میں پہنچ جائے اور شیر خوارگی۔ بچپن۔ عنفوانِ شباب، شباب اور کہولت کے دوروں سے گذرے ہی نہ۔ ایسا ہونا ناممکنات سے ہے کیونکہ انسان کو ان تمام ارتقائی منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اور بعینہٖ یہی ارتقائی قوانین انسانی معاشرہ میں بھی موجود ہیں۔ یہیں منزل بمنزل ایک دور سے دوسرے دور میں داخل ہونا پڑتا ہے جیسے برف کو پانی اور پانی کو بھاپ میں تبدیل ہونے کے لئے انقلابی عملوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اور ان تینوں یعنی برف۔ پانی۔ اور بھاپ میں اصل ہستی پانی کی ہے۔ جس نے مختلف مدارج میں پہنچ کر اپنی اصل ہستی کو فنا نہیں کیا ہے بلکہ اپنے خواص اور صورتِ نوعیہ میں تبدیلی پیدا کر لی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح یہ کاروانِ زندگی ابتدا میں پھسل پھسل کر اور رینگ رینگ کر چلتا ہے۔ آہستہ آہستہ تاریخی عوامل کے تھپیڑوں کو سہنے کی اپنے اندر قابلیت پیدا کرتا ہے۔ یعنی تنازع للبقا کی قوتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ اور اس کے اندر روانی پیدا ہو جاتی ہے اور اسی طرح یہ کارواں اور تاریخی ارتقائی مراحل طے کرتا ہے اور اب یہ ایٹم اور برقیات کے دور میں ہے۔ پانی کی طرح زندگی کے ان مختلف قافلوں کی اصل بھی مادی تاریخ ہی ہے

جو مختلف دوروں میں اپنی صورت نوعیتہ اور خواص تبدیل کرتی جارہی ہے۔ اگر کسی سوسائٹی یا مذہب کے خیالات کا رجحان ترقی پسندانہ ہوتا ہے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ اپنے ان اعمال و افعال کی تجدید بھی کرتا جاتا ہے جو نئے مادی تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے ہیں تو ایسا نظام ترقی پسندانہ معاشرہ کہلاتا ہے۔ مادی تاریخ کے یہ سائنٹفک اصول ہیں جن کو نہ ماننا حقیقت کا منہ چڑانا ہے۔ اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا ہم جدلی تاریخ کے سائنٹفک مطالعہ کے بغیر مادی تقاضوں اور عوامل کا درست تجزیہ کرسکتے ہیں۔ اور صرف مذہبی پیشوا اس قابل ہیں کہ اپنے مذہبی علوم کے سہارے سے تاریخ کا پہیہ ہمیشہ آگے کو لے جائیں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ ان کی تاریخ رجعت پسندانہ تاریخ ہے۔ "آئینِ نو سے ڈرنا۔ رسم کہن پر اڑنا ـــ منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں"۔ چونکہ قوموں کا ہر فعل خواہ وہ وقتی تقاضے کی مصلحت پر مبنی ہو وہ مذہب کی اصطلاح میں "سنّت" کہلاتا ہے جس کو ترک کرنا مذہب کی اصطلاح میں "کفر" تصور کیا جاتا ہے خواہ پیغمبر کے اس فعل کی افادیت صرف وقتی طور پر ہو اور بعد کے حالات میں اس فعل پر عمل کرنا سراسر ناقابلِ عمل ہو۔ جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ کو ان کی خلافت کے عہد میں یہ مشورہ دیا گیا کہ آپ خزانہ عامرہ کو ہر شام خالی نہ کر دیا کریں۔ بلکہ خزانہ کو باقاعدہ جمع کریں۔ اور کارکنانِ حکومت کی باقاعدہ ماہانہ تنخواہ مقرر فرمائیں تو آپ نے جواب دیا کہ میں سنّت رسولؐ کے خلاف نہیں کرسکتا ہوں۔ بہرحال یہ ایک امر واقع ہے کہ پیغمبرِ اسلام جن خطوط پر معاشرہ کی تشکیل چاہتے تھے وہ نہ ہوا اور معاشرہ مادی تاریخ کے عوامل کی سنّت کا پیروکار رہا۔ اور مذہبی پیشواؤں نے اس وقت کے صاحب اقتدار طبقہ کی خواہشات کے مطابق جواز نکالنے کا کام سنبھال لیا جو آج بھی جاری ہے۔

محترم پرویز صاحب! آپ اس بستی یعنی پاکستان میں واحد شخص ہیں جو فرماتے ہیں کہ الارض للّٰہ اور نظامِ ربوبیت قائم ہونا چاہیئے دوسری طرف شرق تا غرب تمام مولوی صاحبان یک زبان آپ کے خلاف تکفیر کے فتوے دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو اسلام کا ماحصل صرف چار نکاحوں تک جانتے ہیں۔ لیکن جماعت اسلامی کے امیر اسلام کا نام لے کر جاگیرداری نظام کا جواز نکالتے ہیں۔ اور اپنی کتاب "سود حصہ دوم" میں فرماتے ہیں۔ "ایک مربع گز سے لے کر اگر کسی شخص کے قبضہ میں اس قدر رقبہ ہو جس کی کوئی حد ہی مقرر نہ ہو اگر جائز طریقہ سے قابض ہے تو شریعت کی رو سے درست ہے"۔ لیکن آپ فرماتے ہیں کہ زمین اللہ کی ہے اس پر کسی کی ملکیت نہیں ہے۔

دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں میری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

آپ بھی جواز اپنے دعوے کا قرآن ہی سے نکالتے ہیں اور مودودی صاحب بھی قرآن ہی سے۔ جن کے نزدیک یہ زمینِ پاکستان کھوڑوؤں، دولتانوں اور ٹوانوں کی ہے۔

خداوندا! یہ تیرے سادہ لوح بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری!

کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ حصولِ پاکستان سے پیشتر کیا وعدے کئے تھے کہ پاکستان بن جانے کے بعد آپ کے لفظوں میں نظام ربوبیت قائم کیا جائے گا۔ اور حضرت عمرؓ کا دور لوٹ آئے گا۔ عوام نے ہولناک اور بے مثال قربانیاں دیں۔ پاکستان بن گیا۔ سولہ سال گذر گئے اور ان سولہ سالوں میں ہر صدرِ مملکت اور ان گنت وزیروں نے اور مولوی صاحبان نے یہی کہا کہ ہمارا نظام اسلامی ہونا چاہیئے لیکن مادی تاریخ کہتی ہے کہ نہیں۔ نظام صرف میری سنّت پر چلنا چاہیئے۔ آپ غور فرمائیں کہ ہماری حکومت اور علمائے دین دونوں فریق یہی کہتے ہیں کہ اسلامی نظام ہونا چاہیئے لیکن یہ دونوں فریق اسلامی نظام بنانے سے عاجز ہیں۔ اگر آپ نظام ربوبیت پیش کرتے ہیں تو علمائے دین کے نزدیک کافر ٹھیرتے ہیں ادھر خانہ کعبہ سے بھی اسلامی نظام کی آواز نہیں آتی ہے۔ بلکہ عربوں کا آج ایک ہی محبوب نعرہ ہے۔ (عرب نیشنلزم زندہ باد) لیکن آج زمین میر و سلطاں سے بیزار ہو رہی ہے اور ہمارے ملک کا جاگیرداری نظام عالم نزع میں ہے۔ ہمیں آگے بڑھنے کے لئے تاریخ کے مادی اصولوں ہی سے راہنمائی لینی چاہیئے اور اپنے اردگرد کے حالات اور تجربوں سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ نظام ربوبیت تک پہنچنے کے لئے سیدھا راستہ یہی ہے۔"

طلوعِ اسلام

ہم نے اس تفصیلی خط کو بتمامہٖ اس لئے شائع کیا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اشتراکی فلسفۂ حیات کیا ہے؟ اور اس فلسفے سے متاثر ذہن کس نہج پر سوچتا ہے۔ ہم اس حقیقت کو متعدد بار واضح کر چکے

ہیں کہ ایک چیز ہے اشتراکی نظام معاشی اور دوسری چیز ہے اشتراکی فلسفۂ زندگی۔ لیکن چونکہ اشتراکی نظام معیشت کی عمارت اشتراکی فلسفہ کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے اس لئے اس نظام کو سمجھنے کے لئے اس فلسفہ کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ بعینہٖ جس طرح اسلامی نہجِ زندگی کے کسی گوشے کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی فلسفۂ حیات یا نظریۂ زندگی کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ جو نظام یوں ہی ہنگامی طور پر اپنا لیا جائے اس کی صورت کچھ اور ہوتی ہے لیکن جو نظام کسی خاص فلسفۂ حیات کی پیداوار ہوا سے اس فلسفۂ حیات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے اس فلسفہ کا سمجھنا لاینفک ہوتا ہے۔

۲۔ مشہور جرمنی مفکر ہیگل کا پیش کردہ نظریہ یہ تھا کہ ایک تصور (IDEA) پیدا ہوتا ہے۔ وہ بڑھتا۔ پھولتا۔ پھلتا پروان چڑھتا ہے۔ جب وہ اپنی تکمیل تک پہنچ جاتا ہے تو اس میں سے ایک اور تصور کی نمود ہوتی ہے جو پہلے تصور کی ضد ہوتا ہے۔ جو کچھ پہلے تصور کے ساتھ ہوا تھا وہی کچھ اس جدید تصور کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ گردش دولابی شروع سے آج تک جاری ہے اور اسی طرح جاری رہیگی اس عمل کا نام جدلی عمل (DIALECTICAL PROCESS) ہے۔ جب ہیگل سے پوچھا گیا کہ وہ کون سی قوت ہے جو اس عمل کو ایسے نظم اور ضبط کے ساتھ جاری رکھتی ہے، تو اس نے کہا کہ اس مخفی قوت کا نام "روح عالم" (WORLD — SPIRIT) ہے وہ اس عمل سے خود اپنی ذات کی تکمیل چاہتی ہے۔

مارکس (MARX) ہیگل کے فلسفہ کا متبع تھا۔ لیکن اس نے ذرا آگے جاکر، ہیگل سے ایسا اختلاف کیا کہ اس کا یہ اختلافی نظریہ خود ایک فلسفہ بن گیا۔ اس نے کہا کہ جنگِ اضداد کا جو تصور ہیگل نے پیش کیا ہے وہ تو درست ہے لیکن یہ جنگ تصورات (IDEAS) میں نہیں ہوتی بلکہ نظامہائے زندگی (SOCIAL ORDERS) میں ہوتی ہے۔ ایک نظام قائم ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے عروج تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے بعض مخالف قوتیں وجود کوش ہوتی ہیں۔ یہ قوتیں اس نظام کو تباہ کر کے اس کی جگہ ایک جدید نظام کو مسلّط کر دیتی ہیں۔ جو پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ اور یہ جنگ اسی طرح آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس سے پہلے نظام سرمایہ داری دنیا پر مسلط تھا۔ اب اس کی جگہ، اشتراکی نظام لے رہا ہے جو اس سے پہلے نظام کی ضد ہے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ یہ جنگ اضداد کون سی قوت کی روح سے جاری رہتی ہے تو اس نے کہا کہ اسے تاریخی وجوب

(HISTORICAL NECESSITY) کہا جاتا ہے۔ یہ قوت اس قدر محکم اور مہیب ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ انسان اس کے سامنے یکسر بےبس اور عاجز ہے۔ جب یہ ایک نظام کو مسلط کرتی ہے تو انسان اس نظام کو بدل ہی نہیں سکتا۔ اسے اس نظام کو مجبوراً تسلیم اور اختیار کرنا پڑتا ہے ۔۔۔ اختیار کرنا کیا معنی' اس کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ اور جب وہ قوت اس نظام کو فنا کرنا چاہتی ہے تو انسانوں کی کوئی تدبیر اسے بچا نہیں سکتی۔ مارکس کے نزدیک انسان کی ساری تاریخ اس کی اس بےبسی اور بیکسی کی داستان ہے۔ خدا۔ وحی ۔۔۔ مستقل اقدار۔ حق و باطل کا تصور اس کے نزدیک سب افسانے ہیں۔ اور ذہن انسانی کی تخلیق۔ حقیقت صرف تاریخی وجوب کی ہے۔ مارکس کے اس نظریہ کی عملی تعبیر کا نام، "تاریخ کی مادی تعبیر (MATERIALISTIC INTERPRETATION OF HISTORY) ہے وہ اس تعبیر کو اس قدر حتمی اور یقینی قرار دیتا ہے کہ اس کے نزدیک دنیا کی کوئی طاقت اس کے دھارے کا رُخ بدل نہیں سکتی۔

۳۔۔۔ یہ ہے مختصر الفاظ میں اشتراکی فلسفۂ زندگی۔ اس کی روشنی میں آپ مندرجۂ بالا خط پڑھیں گے تو بات صاف ہو جائے گی کہ اس فلسفہ سے متاثر ذہن کس نہج پر سوچتا ہے۔

اسلام کا نظریۂ حیات، اس فلسفہ کے بالکل برعکس اور اس کی ضد ہے۔ اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ حق (TRUTH) ایک ابدی حقیقت ہے، جو ذہن انسانی کی پیداوار نہیں۔ یہ اپنے مقام پر اٹل اور غیر متبدل ہے، اور کسی شے سے اثر پذیر نہیں ہوتا۔ جو تصورات حق کے مطابق ہوں وہ مبنی بر صداقت ہوں گے۔ انہیں مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ یہ اقدار، حق پر مبنی ہونے کی وجہ سے ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ یہ وحی خداوندی کی رُو سے (بوساطت حضرات انبیائے کرامؑ) انسانوں کو ملتی ہیں تاکہ وہ ان کے مطابق اپنا نظام زندگی قائم کریں۔ جو نظام ان اقدار کے مطابق قائم ہوتا ہے اسے حق کا نظام کہا جاتا ہے اس نظام کی عملی شکل، زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ لیکن جن بنیادوں پر یہ استوار ہوتا ہے ان میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔

جو تصورات، مستقل اقدار کے خلاف ہوں انہیں باطل کے تصورات کہا جاتا ہے جو حق کی نقیض ہے۔ ان دونوں تصورات کی باہمی کش مکش رہتی ہے اور اس کش مکش میں حق، باطل کو شکست دیتا چلا جاتا ہے اس طرح باطل آہستہ آہستہ کمزور ہوتا جاتا ہے۔ تا آنکہ آخر الامر یہ میدان چھوڑ جاتا

اور حق کا غلبہ مکمل ہو جائے گا۔

حق اور باطل کی یہ کش مکش ، خدا کے کائناتی قانون کی رو سے جاری ہے لیکن چونکہ اس قانون کی رفتار ، ہمارے حساب و شمار کی پیمائش کے مطابق بہت سُست ہوتی ہے۔ (خدا کا ایک ایک دن قرآن کے الفاظ میں ہزار ہزار بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کے برابر ہوتا ہے) اس لئے اس کشمکش کے نتائج بڑے غیر محسوس اور غیر مرئی ہوتے ہیں۔ لیکن تاریخی نوشتوں پر نگاہ ڈالی جائے تو ان سے اس حقیقت کی شہادت مل سکتی ہے کہ یہ کشمکش جاری ہے اور اس میں حق (تعمیری تصورِ حیات) باطل (تخریبی نظریہ) پر بتدریج غالب آ رہا ہے۔

اسلام کی رُو سے انسان بے بس اور بے کس - مجبور و مقہور مخلوق نہیں - یہ صاحبِ اختیار و ارادہ ہستی ہے۔ اسے اس انتخاب (CHOICE) کی قوت دی گئی ہے کہ وہ اپنا نظام ، حق کے مطابق قائم کرے یا باطل کے مطابق - جب انسانوں کی کوئی جماعت حق کے مطابق نظام قائم کرتی ہے تو اس کے تعمیری نتائج مرتب ہونے کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے - اتنی تیز کہ کائناتی قانون کی رفتار سے جو نتائج صدیوں میں جا کر محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں ، وہ اس رفتار کی رُو سے دنوں میں سامنے آجاتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں یہ ادوار (خواہ ان کی مدت کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو) نشانِ منزل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ حق و باطل کی یہ کشمکش "تاریخی وجوب" کی اندھی قوت کی رو سے جاری نہیں۔ یہ خدائے علیم و حکیم کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق جاری ہے جس کی رو سے کائنات بالحق اور با مقصد پیدا کی گئی ہے اور وہ ایک خاص منزل کی طرف رواں دواں جاری ہے۔
جب انسان حق کے مطابق نظام قائم کرنے کی کوشش چھوڑ دیتے ہیں تو وہ (حق) پھر ، کائناتی رفتار سے آگے بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ مستقل اقدار کی صحیح تعلیم و تربیت سے انسانوں کو ہر زمانے میں اس قابل بنایا جا سکتا ہے کہ وہ حق کا نظام قائم کر سکیں۔ تاریخ کے جن درخشندہ ادوار کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے ، وہ ادوار تھے جن میں انسانی جماعتوں کو اس قابل بنایا گیا تھا۔ آخری مرتبہ یہ دور محمد رسول اللہ والذین معہٗ کے زمانے میں آیا۔ جب تک اس صحیح تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رہا (جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) وہ نظام قائم رہا۔ جب لوگوں نے اس سلسلہ کو منقطع کر دیا ، تو وہ نظام بھی باقی نہ رہا۔ وہ مستقل اقدار جن کے مطابق یہ نظام قائم ہوا تھا ، اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ ان میں یہ

صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہر زمانے میں عملی نظام کی شکل میں متشکل کی جا سکیں۔ جب اور جہاں بھی ان کی صحیح تعلیم کا سلسلہ جاری ہو گیا وہ نظام متشکل ہو جائے گا۔

۴۔ اس چودہ سو سال کے عرصے میں جبکہ حق کا وہ نظام، جسے انسانی ہاتھوں نے قائم کیا تھا، باقی نہ رہا۔ حق پر مبنی تصورات، کائناتی رفتار سے باقاعدہ آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں اور انسانی معاشرہ پر غیر شعوری طور پر مسلط ہوتے جا رہے ہیں۔ ملوکیت کا مٹ جانا اور اس کی جگہ شورائیت کے تصور کا عام ہو جانا۔ غلامی کا خاتمہ۔ ذات پات کی تمیز کا دور ہو جانا۔ قومیت کی جگہ عالمگیر انسانی برادری اور وحدتِ نظامِ انسانیت کے تصور کا اجاگر ہوتے چلے جانا۔ انسانوں کے بنیادی حقوق کے احساس کا بیدار ہوتے جانا۔ زمینداری۔ سرمایہ داری کے نظام کا مبغوض بن جانا اور عالمگیر نظامِ ربوبیت کا مقبول ہوتے چلے جانا وغیرہ وغیرہ ۔۔۔ یہ سب قرائن وشواہد اس حقیقت کی دلیل ہیں کہ حق کے مطابق نظریاتِ زندگی، کائناتی قانونِ خداوندی کے مطابق آہستہ آہستہ متمکن ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اب دنیا کی کوئی قوت، اُن باطل تصورات کو واپس نہیں لا سکتی۔ جنہیں حق کے تصورات نے شکست دے کر میدان سے بھگا دیا ہے۔ اس وقت اگر انسانوں کی تعلیم وتربیت قرآنی تصورات کے مطابق کر دی جائے تو صحیح نظامِ عدل و صداقت کے قائم ہونے میں (جسے ہم خدا کے نظامِ ربوبیت کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں) کچھ دیر نہیں لگے گی۔ اس کے لئے کائناتی قانون نے فضا کو بڑا سازگار بنایا ہے۔

۵۔ تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ اسلام کا نظریۂ حیات اور اشتراکیت کا فلسفۂ زندگی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہی وجہ ہے جو ہم اکثر وبیشتر کہتے رہتے ہیں کہ نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ ہو سکتا ہے اور نہ کوئی کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے۔ عام لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ جب اشتراکیت کے معاشی نظام کی بعض جزئیات اور قرآن کے معاشی نظام میں مماثلت دیکھتے ہیں تو جھٹ سے کہہ اٹھتے ہیں کہ اسلام اور اشتراکیت ایک ہی چیز ہے۔ اور یہ غلطی صرف اشتراکی نظام کے بارے میں ہی نہیں کی جاتی۔ ہر نظام کے بارے میں کی جاتی ہے۔ مثلاً جب لوگوں نے دیکھا کہ مغربی جمہوریت بھی لوگوں کے خلاف ہے اور اسلام بھی ملوکیت کی جگہ نظامِ شورائیت کا حامی ہے تو انہوں نے فوراً اعلان شروع کر دیا کہ اسلام اور جمہوریت ایک ہی شے ہے۔ حالانکہ مغرب کی جمہوریت، جس مادی نظریۂ حیات کی پیداوار ہے وہ اسلامی نظریۂ زندگی کے یکسر خلاف اور اس کی نقیض ہے۔ اسی قبیل کا یہ نعرہ ہے (جسے آجکل مغربی

سیاست خاص طور پر بلند کر رہی ہے، کہ چونکہ عیسائی دنیا بھی خدا کو مانتی ہے اور مسلمان بھی خدا پر ایمان رکھتے ہیں اس لئے یہ دونوں ایک ہیں۔ حالانکہ عیسائی دنیا جس چیز کو خدا پر ایمان قرار دیتی ہے قرآن اسے کفر اور شرک سے تعبیر کرتا ہے اور واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ جب تک یہ لوگ خدا کو ان تصورات کے مطابق نہ مانیں، جنہیں قرآن کریم پیش کرتا ہے، وہ کبھی خدا کے ماننے والے نہیں کہلا سکتے۔ بہر حال یہ جملہ معترضہ تھا۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ اسلام کا نظریۂ زندگی اور اشتراکی فلسفۂ حیات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

۲۔ گذشتہ صفحات میں جو کچھ کہا گیا ہے، محترم مستفسر کے استفسارات کا اصولی جواب اسی میں آگیا ہے۔ لیکن ان کی بعض جزئی باتوں کے متعلق مختصراً ذیل میں عرض کیا جاتا ہے۔

(۱) انہوں نے کہا ہے کہ اسلام نے اپنے ابتدائی ایام میں تاریخ کے مادی تقاضوں سے ٹکر لی۔ اور ایک مخصوص خطہ میں ایسا نظام قائم کر دکھایا جو اس زمانے کے طبعی تاریخی دور سے الگ تھا۔ اس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ "پیغمبرِ اسلام کی بے پناہ روحانیت کا کرشمہ تھا اور ایک معجزہ"۔

محترم مستفسر یا تو پورے طور پر اشتراکی فلسفہ کے قائل نہیں۔ یا (معاف فرمائیے) انہیں پورے طور پر اس کا علم نہیں۔ اشتراکی فلسفہ کی رُو سے نہ "روحانیت" کوئی شے ہے! اور نہ ہی اس پر مبنی معجزہ کا کوئی وجود۔ جب تاریخ کی تعبیر یکسر مادی ہے تو اس میں روحانیت کا ذکر ہی کیا۔ مارکس، اس قسم کے تصورات کو انسانی اوہام کی پیداوار قرار دیتا ہے۔ پھر یہ چیز بھی قابلِ غور ہے کہ جب تاریخی وجوب کی قوت ایسی بے پناہ ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کے دھارے کو نہیں روک سکتی، تو دنیا کے کسی ایک خطہ ہی میں سہی اور تھوڑے سے وقت کے لئے ہی سہی۔ جب اس دھارے کا رُخ موڑ دیا گیا اور اس کے علی الرغم ایک اور نظام قائم کر کے دکھا دیا گیا تو وہ بنیاد ہی منہدم ہو گئی جس پر اشتراکی فلسفہ کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذرا عام روش سے ہٹ کر سوچا جائے تو یہ بات اُبھر کر سامنے آجاتی ہے کہ جسے "تاریخی وجوب" کہا جاتا ہے، اس کی اصل ہی کچھ نہیں۔ وہ تو قرآن کے الفاظ میں "ان ناموں میں سے ایک نام ہے، جنہیں تم نے یا تمہارے آباء و اجداد نے وضع کر لیا تھا"۔ محض ایک نام۔ تاریخ، انسانوں کے اختیار و ارادہ اور اعمال و کردار کی داستان کا نام ہے۔ اسے ایک ایسی مہیب قوت سمجھ لینا جس کے سامنے انسان بے دست و پا، اور محکوم و مقہور بن کر رہ جائے، پتھر کو دیوتا بنا لینے والی

بات ہے۔ مارکس نے خدا سے انکار کیا۔۔۔ اور اس کا مذہب اُسے جس خدا کا پرستار بنانا چاہتا تھا وہ خدا تھا ہی اس قابل کہ اس سے انکار کر دیا جاتا۔۔۔ اس خدا سے اس نے انکار کیا اور حقیقی خدا کا تصور اس کے سامنے کسی نے پیش نہ کیا۔ نتیجہ یہ کہ اس کے ذہن میں خلا پیدا ہو گیا۔ لیکن چونکہ خلا کا قائم رہنا ناممکنات سے ہے اس لئے اسے اس خلا کو پورا کرنے کے لئے ایک "خدا" وضع کرنا پڑا۔ یہ خدا ہے "تاریخی وجوب" جو محض ایک موہوم نام ہے۔ اس کی اصل و حقیقت کچھ بھی نہیں۔ کوئی کمیونسٹ آج تک یہ نہیں سمجھا سکا کہ "تاریخی وجوب" ہے کیا؟ نہ ہی خود مارکس کے ہاں اس کی تشریح ملتی ہے۔

باقی رہا یہ کہ جو نظام رسول اللہؐ نے قائم فرمایا تھا وہ تھوڑے عرصے کے بعد جاری کیوں نہ رہا، سو اس کے متعلق گذشتہ صفحات میں مختصراً بتایا جا چکا ہے۔ (تفصیلاً دیکھنا ہو تو سلیم کے نام خطوط کی تیسری جلد میں وہ خط دیکھئے جس کا عنوان ہے "اسلام آگے کیوں نہ چلا")

اس مقام پر اتنا اور بتا دینا ضروری ہے کہ جو نظام نبی اکرمؐ نے قائم فرمایا تھا وہ معجزہ تھا۔ نہ "روحانیت" کا کرشمہ۔۔۔ وہ اس پروگرام کا فطری نتیجہ تھا جسے قرآن کریم نے اس نظام کے قیام کے لئے تجویز کیا ہے یعنی صحیح تعلیم و تربیت سے مستقل اقدار کی اہمیت کو اس قدر دلوں میں جاگزیں کر دینا کہ وہ انسانی زندگی کا نصب العین بن جائیں اور اس طرح انسان ان کے تحفظ کی خاطر ہر قسم کی مادی قربانی کے لئے بطیب خاطر تیار ہو جائے۔ اس پروگرام پر جب بھی عمل کیا جائے گا اس کا نتیجہ وہی برآمد ہو گا جو نبی اکرمؐ کے زمانے میں پیدا ہوا تھا۔ یہ بھی واضح رہے کہ قرآن کریم نے اس نظام کے اصول دیئے ہیں جو غیر متبدل ہیں۔ اس کی جزئیات خود متعین نہیں کیں۔ انہیں ہر زمانے کے انسانوں پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ انہیں اپنے حالات کے مطابق خود متعین کریں۔ اس لئے محترم مستفسر کا یہ سمجھنا کہ کسی ایک زمانے کی متعین کردہ جزئیات بھی ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گی۔ قرآنی تصور نظام سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ خود نبی اکرمؐ کے جانشینوںؓ (خلفائے راشدینؓ) کے زمانے میں کئی ایک جزئیات میں، جو پہلے متعین ہوئی تھیں تبدیلی کی گئی۔ ان میں سے جو علیٰ حالہٖ رہنے دی گئیں تو اس لئے کہ ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

(ii) محترم مستفسر نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی بڑھاپے کی عمر میں پہنچ جائے۔ تدریجی ارتقا فطرت کے اصولوں میں سے ہے۔

یہ درست ہے لیکن اس اصول کا اطلاق انہی امور پر ہو سکتا ہے۔ جو انسانی ذہن کے پیدا کردہ ہوں۔ آج سے چھ ہزار سال پہلے کا انسانی ذہن وہ باتیں نہیں سوچ سکتا تھا جو آج کا ذہن سوچ سکتا ہے۔ لیکن وحی خداوندی انسانی ذہن کی تخلیق نہیں ہوتی۔ اس کا سرچشمہ علم خداوندی ہے۔ جو ماحول کے اثرات سے بلند ہے۔ وحی انسان کو ابدی حقائق دیتی ہے جو مستقل بالذات اور غیر متبدل ہیں۔ وحی نے سب سے پہلے نبی سے بھی یہی کہا تھا کہ لوگوں سے کہہ دو کہ ذرائع رزق، انسانی نشوونما کے لئے ہیں۔ انہیں افراد و مخصوص گروہوں کی مفاد پرستیوں کے لئے محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ذہن انسانی اور وحی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ذہنِ انسانی کا طریق، تجرباتی ہے۔ اس لئے وہ تدریجاً حقیقت تک پہنچتا ہے۔ لیکن وحی خداوندی پہلے ہی دن حقیقت کو سامنے لے آتی ہے۔ البتہ اس حقیقت کو عملی نظام میں متشکل کرنے کے لئے ہر دور کے تقاضوں کو سامنے رکھا جائے گا اور یہ سب کچھ انسانی جدوجہد کی رو سے ہو گا۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے وحی کی رو سے اس نظام کے اصول ملتے ہیں، جزئیات نہیں ملتیں۔ تدریجی ارتقاء کا عمل انسانی زندگی کی جزئیات میں ہوتا ہے۔ اصولوں میں نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ بچے کی مختلف قوتوں کی نشوونما تدریجاً ہوتی ہے لیکن جن اصولوں پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے، وہ بچپن، جوانی، اور بڑھاپے میں یکساں رہتے ہیں۔ مثلاً زندگی کا دارومدار سانس پر ہے تو یہ چیز زندگی کے پہلے دن سے آخری دن تک یکساں طور پر کارفرما رہتی ہے۔ اسی طرح زندگی اور صحت سے متعلق دوسرے اصولوں کی کیفیت ہے یہ اصول تدریجاً مرتب نہیں ہوتے جس نے زندگی دی ہے، اسی نے ان اصولوں کو مستقل طور پر متعین کر دیا ہے۔ جو ان اصولوں میں تغیر و تبدل کرتا ہے وہ نقصان اٹھاتا ہے۔

جس طرح زندگی کے خالق نے طبعی زندگی کے اصول دیئے ہیں، اسی طرح اس نے انسان کی تمدنی زندگی کے لئے بھی اصول دیئے ہیں۔ یہ اصول بھی اسی طرح غیر متبدل ہیں جس طرح طبعی زندگی سے متعلق اصول۔ تدریجی ارتقاء کا سوال نہ ان میں ہے نہ ان میں۔ پھر جس طرح طبعی زندگی سے متعلق اصول انسانی ذہن کی پیداوار نہیں، اسی طرح اس کی تمدنی زندگی سے متعلق اصول بھی اس کے ذہن کی پیداوار نہیں ہو سکتے۔ کائنات کی کسی چیز نے بھی اپنے لئے اصول آپ وضع نہیں کئے۔ سب "وحی" کی رو سے ملے ہیں۔

(۲) محترم مستفسر نے اشتراکی فلسفہ کی ایک بنیادی کمزوری کو نظر انداز کر دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب (مثلاً) تاریخی وجوب کی رو سے اب وقت آ گیا ہے کہ سابقہ نظامِ سرمایہ داری کی جگہ اشتراکی نظام

دنیا پر مسلط ہو جائے تو اس کے لئے نہ کسی جہد و جہد کی ضرورت ہے نہ کد و کاوش کی حاجت۔ "تاریخی دجوب" کی بے پناہ قوت اس جدید نظام کو خود بخود مسلط کر دے گی۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کے دھارے کے سامنے روک بن کر کھڑی نہیں رہ سکتی۔ یہ اسے خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گی۔

جب صورت حال یہ ہے تو پھر اشتراکی ممالک، اشتراکیت کو پھیلانے اور مسلط کرانے کے لئے اس قدر نعل بر آتش کیوں رہتے ہیں ـــــ یہ اس قدر پراپیگنڈے کا طوفان۔ مختلف ممالک میں دہشت پسند جماعتیں، سرمایہ دارانہ نظام کی حامل سلطنتوں کے خلاف سرد اور گرم جنگ کا سلسلہ۔ اس قدر سپاہ۔ اتنا عظیم سامان جنگ۔ ایٹمی بم وغیرہ وغیرہ کس مقصد کے لئے ہیں۔ کیا "تاریخی دجوب" اس قدر کمزور ہو چکی ہے کہ اسے ان سہاروں کی ضرورت پڑ رہی ہے۔ اور ضرورت پڑ رہی ہے ان انسانوں کے مقابلہ کے لئے جو اشتراکی فلسفہ کے مطابق نہایت بے بس اور مجبور ہیں۔

اس فلسفہ کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ (مثلاً) آجکل جدلی جنگ کی رو سے اشتراکی نظام کے مسلط ہونے کی باری ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کے بعد جب اسی جنگ کے مطابق اشتراکی نظام کی ضد دوسرے نظام (یعنی نظامِ سرمایہ داری) کے مسلط ہونے کی باری آئے گی تو اس وقت اس فلسفہ کے معتقدین کا طرزِ عمل کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اس وقت انہیں نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہونا پڑے گا۔ اور اشتراکی نظام کے خلاف وہی کچھ کرنا ہوگا جو کچھ وہ اس وقت نظامِ سرمایہ داری کے خلاف کر رہے ہیں۔ اس وقت وہ تمام لٹریچر جس میں نظامِ سرمایہ داری کو نوعِ انسان کے لئے لعنت قرار دیا گیا ہے، نذرِ آتش کر دینا پڑے گا۔ اور وہ تمام دلائل جو اس وقت نظامِ اشتراکی کے حق میں دی جاتی ہیں، خود ان کی تردید کرنی پڑے گی۔ اس وقت سب سے بڑا سرمایہ دار، سب سے زیادہ مستحق تبریک و تہنیت قرار دیا جائے گا۔

پھر اسی نقشہ کو ذرا پیچھے کی طرف لائیے۔ موجودہ دور سے پہلے۔ نظامِ سرمایہ داری "تاریخی وجوب" کے تقاضے کے عین مطابق تھا۔ سوال یہ ہے کہ آپ اس دور کے سرمایہ پرستوں کو موجبِ لعنت و ملامت کیوں قرار دیتے ہیں؟ ان کی شان میں قصائد کیوں نہیں لکھتے۔ آپ اس "مذہب" کو "افیون" کیوں قرار دیتے ہیں جو اس وقت اس نظام کی تائید کرتا تھا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کا طرزِ عمل کس طرح وجوب تاریخی کے خلاف ہے؟ اگر آپ اس

فلسفہ کو فی الواقعہ سچا سمجھتے ہیں تو آپ کو سابقہ دور کے سرمایہ پرستوں کی مدح میں قصیدے پڑھنے چاہئیں کہ انہوں نے تاریخی وجوب کا ساتھ دیا تھا۔ نیز اُس زمانے کے مذہب کو سچا مذہب قرار دینا چاہیئے جس نے تاریخی وجوب کی تائید کی تھی۔ اسی طرح آپ کو اس دور کے بعد بھی اُس مذہب کو حق و صداقت کا مذہب سمجھنا چاہیئے جو نظامِ سرمایہ داری کی تائید کرے۔ کیونکہ اس وقت تاریخی وجوب کا یہی تقاضا ہوگا۔

آپ مذہب پرست طبقہ کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ آنکھیں بند کئے اپنے معتقدات پر جمے رہتے ہیں اور جو شخص ان کے خلاف کچھ کہے اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اس کا نام آپ کے نزدیک مذہبی جنون (FANATICISM) ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ نظامِ اشتراکیت بہترین نظام ہے تو کیا آپ اس نتیجہ پر عقل و فکر کی رو سے پہنچے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ آپ اس دور میں پیدا ہوئے جب تاریخی وجوب کی رو سے اشتراکی نظام کی باری آئی۔ آپ نے اس نظام کی تائید شروع کر دی۔ اگر آپ چند صدیاں پہلے پیدا ہوتے تو تاریخی وجوب کے معتقد کی حیثیت سے آپ نظامِ سرمایہ داری کو عین حق و صداقت کے مطابق نظام قرار دیتے ۔۔ سوچئے کہ یہ مذہبی جنون نہیں تو اور کیا ہے؟ اور جنون بھی اس شدت کا کہ جو شخص آپ کے اس عقیدہ سے متفق نہیں آپ اسے زندہ رہنے کا حق تک دینے کے لئے تیار نہیں۔

اس کے مقابلہ میں دینِ خداوندی کو دیکھئے کہ اس نے پہلے دن سے ایک نظام (ربوبیت) کو حق و صداقت کا نظام قرار دیا اور آج تک اُسی کو حق و صداقت کا نظام قرار دیئے چلا جا رہا ہے۔ اور ہمیشہ تک اسے ہی حق و صداقت پر مبنی نظام قرار دے گا۔ آپ سوچئے کہ جو لوگ اس نظام کے مؤید ہیں ان کا موقف علم و بصیرت اور دلائل و براہین پر مبنی سمجھا جائے گا یا تاریخی وجوب کے معتقدین کا جنہیں ہر دور میں اپنے سابقہ موقف کے خلاف کتنا اور کرنا پڑے گا۔ یہ فرق ہے وحیِ خداوندی اور انسانی ذہن کے وضع کردہ نظریاتِ حیات میں!

(۷) محترم مستفسر یہ بھی کہتے ہیں کہ اسی قرآن سے پرویز صاحب نظامِ ربوبیت ثابت کرتے ہیں اور اسی سے مودودی صاحب۔ نظامِ سرمایہ داری کی تائید لاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے ہیں کہ

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں!

محترم مستفسر جس خدا سے پوچھتے ہیں کہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں، اسی خدا نے

ان سادہ دل بندوں کو پہلے ہی بتا رکھا ہے کہ وہ کدھر جائیں۔ اس نے کہا ہے کہ تم نہ یہ دیکھو کہ پرویز کیا کہتا ہے اور نہ یہ کہ مودودی کیا کہتا ہے ؟ میری کتاب "گیٹ دی ویا" نہیں کہ کسی کی سمجھ میں ہی نہ آئے۔ تم اس کتاب کو اپنی عقل و فکر کی رو سے دیکھو اور سمجھو، بات صاف ہو جائے گی۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ مسلمانوں کے ممالک میں اس وقت کیا ہو رہا ہے۔ اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ داری قرآن کی تعلیم پر ہے یا انسانوں کے خود ساختہ مذہب پر جسے بدقسمتی سے اسلام کا نام دے دیا گیا ہے۔

(۷) محترم مستفسر نے کہا ہے کہ ہمیں "آگے بڑھنے کے لئے تاریخ کے مادی اصولوں ہی سے راہ نمائی لینی چاہیئے اور اپنے اردگرد کے حالات سے اور تجربوں سے فائدہ اٹھانا چاہیئے نظامِ ربوبیت تک پہنچنے کے لئے سیدھا راستہ یہی ہے۔

ہم سمجھ نہیں سکے کہ اس سے ان کا مطلب کیا ہے ؟ یہ بات اگر وہ اس مذہب پرست طبقہ سے کہتے جو نظامِ سرمایہ داری کو مقدس سمجھتا ہے تو قابلِ فہم ہوتی۔ لیکن نظامِ ربوبیت کے داعیان سے یہ کہنا، کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے مراد وہ چیز ہے جسے وہ اپنے خط کے شروع میں بیان کر چکے ہیں یعنی یہ کہ نظامِ ربوبیت سے جو آپ کی غایت ہے وہ بالکل درست ہے لیکن ذرائع حصول میں مجھے اختلاف ہے: انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ان کے نزدیک اس مقصد کے حصول کے ذرائع کیا ہیں۔ نہ ہی ہمیں ایسا فرض کر لینے کا حق حاصل ہے کہ یہ صاحب واقعی اشتراکی ہیں، اس لئے ان کے پیشِ نظر وہی ذرائع ہیں جنہیں اشتراکی لیڈر اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ممکن ہے ان کے پیشِ نظر کوئی اور ذریعہ ہو۔ لیکن جہاں تک اشتراکی نظام کا تعلق ہے، اس کے نزدیک اپنے مقصد کے حصول کے جو ذرائع ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ لینن اس باب میں کہتا ہے کہ

> ہم ان تمام اخلاقی حدود و شرائع کی مذمت کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت عقیدہ کا نتیجہ ہوں ہمارے خیال میں اخلاق کا نظریہ ہمیشہ جماعت کے مفاد کی جنگ کے ماتحت ہونا چاہیئے۔ ہر وہ حربہ جو قدیم غاصبانہ نظامِ معاشرت کے خلاف اور مزدوروں کی تنظیم کی تائید میں ضروری سمجھا جائے عین اخلاق ہے۔ چنانچہ جماعتی مفاد کی خاطر، جرائم کا ارتکاب، دروغ بافی، فریب دہی، عین حق و صداقت ہے۔

اب رہا طریق کار۔ سو اس کے متعلق لینن لکھتا ہے۔

سرمایہ داری نظامِ حکومت کی جگہ اشتراکی حکومت کا برسرِ اقتدار آجانا تشدد آمیز انقلاب کے بغیر ناممکن ہے۔[1]

ظاہر ہے کہ اسلام کی رُو سے ان ذرائع کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاقی حدود وہ مستقل اقدار ہیں جنہیں کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام، ذریعہ اور مقصد میں فرق ہی نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک غلط راستہ کبھی صحیح منزل تک نہیں پہنچا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ نظامِ ربوبیت بھی اس کے نزدیک مقصود بالذات نہیں، بلکہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور وہ مقصد ہے انسانی ذات کی نشو و نما۔ اور انسانی ذات کی نشو و نما کی صورت یہ ہے کہ جہاں کوئی مستقل قدر ہاتھ سے چھوٹی نشو و نما رک گئی۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ "زندگی کی بعض ضروریات کے لئے جھوٹ بولنا شرعاً جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے" تو یہ خالص میکیاولی سیاست ہے جسے شریعتِ خداوندی سے کوئی واسطہ نہیں۔

باقی رہا تشدد کے ذریعہ انقلاب لانا تو قرآن کی رُو سے، اس طرح فساد تو برپا کیا جا سکتا ہے۔ انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔ اس کے نزدیک خارج میں انقلاب آ نہیں سکتا جب تک انسان کے قلب میں انقلاب پیدا نہ ہو، اور قلب میں انقلاب، صحیح تعلیم و تربیت کے ذریعہ پیدا ہو سکتا ہے۔ نبی اکرمؐ جو انقلاب لائے تھے تو اس کا ذریعہ "تعلیم کتاب و حکمت" ہی تھا۔ اس سے حضورؐ نے اپنی جماعت کے قلب و نگاہ میں ایسا انقلاب پیدا کر دیا جس سے ان کی نظروں میں زندگی کی اقدار بدل گئیں۔ تشدد کے ذریعے جس قسم کا انقلاب آتا ہے اس کا مزا خود روس نے چکھ لیا ہے۔ اسٹالن کا دور، تشدد کا سخت ترین دور تھا۔ اب روس میں اس دور کے ہیرو اسٹالن کی لاش تک کو اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہے اور اس دور کے تشدد کی ہولناک داستانوں کو بار بار دُہرا کر لوگوں کے دل میں اس کے خلاف نفرت و انتقام کے جذبات بھڑکائے جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مادی نظریۂ حیات کی رُو سے، انقلاب کے لئے تشدد کے علاوہ اور کوئی ذریعہ کارگر ہو نہیں سکتا۔ لیکن قرآنی نظریۂ زندگی کی رُو سے احترامِ انسانیت، انسانی ذات پر ایمان

---

[1] حوالوں کے لئے دیکھئے "سلیم کے نام خطوط" جلد اوّل۔ آٹھواں خط۔

کا بنیادی تقاضا ہے۔ یہ، ظلم و استبداد کی قوتوں کی درازدستیوں کو روکنے کے لئے تو قوت کے استعمال
کی اجازت دیتا ہے۔ نظریۂ زندگی کی تبدیلی کے لئے قوت کے استعمال کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے کہ قوت
کے استعمال سے نظریہ میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ یہ تبدیلی یقین (CONVICTION) سے آتی ہے
اور (CONVICTION) کی بنیاد دلائل و براہین کی رو سے دل و دماغ کے اطمینان پر ہے۔ اسی کو
قرآن کی اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں۔ یہی ایمان وہ جذبۂ محرکہ (INCENTIVE) عطا کرتا ہے
جو انسان کو اس پر آمادہ کر دیتا ہے کہ وہ خون پسینہ ایک کر کے زیادہ سے زیادہ کمائے اور اس
میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لے کر باقی سب، بطیب خاطر، دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے
مادی تاریخ، انسان کے اندر اس قسم کا جذبہ پیدا کر ہی نہیں سکتی۔ اور یہی وہ چٹان ہے جس پہ
اشتراکیت کی کشتی اس بُری طرح سے ٹوٹی ہے کہ انہیں اس کی شکست و ریخت کو دنیا کی نگاہوں سے
پوشیدہ رکھنے کے لئے وہاں آہنی پردے لٹکانے پڑ گئے ہیں، اس کے برعکس، جب اسلامی نظام قائم
ہوتا ہے تو وہ دنیا بھر کے انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اس کے مرکز (کعبہ) میں آئیں۔ (لیشھدوا
منافع لھم) اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ وہ ان کی نفع بخشیوں کے لئے کیا کچھ کرتا ہے۔

یہ ہے فرق اسلام کے طریق کار اور اشتراکیت کے طریق کار میں۔

(vi) محترم مستفسر نے لکھا ہے کہ اس وقت دنیا کے تمام مسلم ممالک، اسلامی نظام کی مخالفت سمت
کو جا رہے ہیں۔ اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلامی نظام صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس نتیجے کے اخذ کرنے
کے لئے یہ دلیل جس قدر کمزور ہے وہ ظاہر ہے۔ محترم مستفسر اس سے متفق ہوں گے کہ اس وقت دنیا
کی اکثریت، اشتراکی نظام کی مخالف ہے۔ کیا وہ اسے ماننے کے لئے تیار ہیں کہ اس سے ثابت ہوتا ہے
کہ اشتراکی نظام صحیح نہیں۔ کسی نظام کے صحیح یا غلط ہونے کی یہ دلیل نہیں کہ کتنے لوگ اس کے موافق
ہیں اور کتنے مخالف۔ اس بات کے پرکھنے کا صحیح طریق یہ ہے کہ اس نظام پر علم و بصیرت کی رُو سے
غور کیا جائے اور دلائل و براہین کی رو سے کسی نتیجہ پہ پہنچا جائے۔ قرآن اپنے ہر دعوے کو علیٰ
وجہ البصیرت پیش کرتا ہے اور دلائل کی رُو سے منواتا ہے۔ وہ اپنے مخالفین سے بھی یہی کہتا ہے کہ
تم اپنے دعوے کی تائید میں دلائل پیش کرو۔ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن کریم کا پیش کردہ نظام
ربوبیت، نوع انسان کی منفعت کا ضامن ہے اور اس کے سوا دنیا کا کوئی نظام یہ نتیجہ نہیں پیدا

کرسکتا۔ ہم اپنے اس دعوے کو علم و بصیرت کی رو سے پیش کرتے ہیں اور اگر کوئی اس سے انکار کرتا ہے تو اس سے بلا مطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنے دعوے کو علم و بصیرت کی رو سے پیش کرے۔

آخر میں ہم محترم مستفسر کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ اسے حسن اتفاق سمجھیے کہ اس وقت آپ کے خیال کے مطابق تاریخی وجوب کا تقاضا بھی وہی ہے جس کی طرف قرآن دعوت دیتا ہے۔ سوال اس فلسفۂ زندگی کے اختلاف کا ہے جس پر یہ دونوں نظام متفرع ہیں۔ اگر آپ اس نظام کو قرآنی فلسفۂ زندگی کی رو سے اختیار کریں گے تو اس سے کم از کم اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا کہ کل کو جب "تاریخی وجوب کی اٹل گردش کے مطابق" پھر سے نظام سرمایہ داری کی باری آگئی تو اس وقت آپ کو یہ خفت۔ نہیں اٹھانی پڑے گی کہ جس اشتراکی نظام کو آپ کل تک نوع انسان کی فلاح و بہبود کا ضامن قرار دیتے تھے، اسے نوع انسان کی تباہی و بربادی کا موجب ٹھہرانا پڑے۔ قرآن یہ کبھی نہیں کرے گا کہ جس بات کو وہ آج نوع انسان کی منفعت کا موجب بتائے اسے کل کو انسانیت کی تباہی کا باعث قرار دیدے۔ اس کے اصول ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ وہ "تاریخی وجوب" کی گردش دولابی سے ہر زمانے میں بدلتے نہیں رہتے۔ اس نکتہ کو ذرا اشتراکی نظام کی تاریخ کی روشنی میں دیکھیے۔ مارکس نے اپنے تصور کو ایک عالمگیر نظام کی حیثیت سے پیش کیا اور لینن کے زمانے تک اسے ایسا ہی سمجھا جاتا رہا۔ لیکن اسٹالن نے اس کی عالمگیر حیثیت کو ختم کرکے، قومی حیثیت دیدی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب یہ نظام روس کا قومی نظام بن کر رہ گیا۔ اب اس نظام کی جنگ دوسرے نظاموں سے نہیں رہی۔ اب روس کی جنگ دیگر ممالک سے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روس کو اپنی سرمایہ دارانہ نظام کے حامل ممالک سے دوستی کے معاہدات کرنے پڑ رہے ہیں جس نظام کے خلاف اشتراکی نظام صدائے احتجاج بن کر اٹھا تھا اور اس کے خلاف ان ممالک سے تعلقات منقطع کرنے پڑ رہے ہیں جو خود اشتراکی نظام کے داعی ہیں۔ یہ نتیجہ ہے مستقل اقدار پر ایمان نہ ہونے کا۔ اس کے برعکس قرآن کریم زندگی کا جو نظام پیش کرتا ہے اس کا بنیادی اصول یہ ہیں کہ (۱) ہر انسان، محض انسان ہونے کی حیثیت سے واجب التکریم ہے۔ (۲) نظام وہی حق و صداقت پر مبنی سمجھا جاسکتا ہے۔ جس کے پیش نظر کسی خاص ملک۔ خاص قوم۔ خاص گروہ اور خاص پارٹی کا مفاد نہ ہو، بلکہ پوری کی پوری انسانیت کا مفاد ہو۔ (۳) دنیا میں "اپنوں" اور "بیگانوں" کی تمیز اور تفریق

کا معیار یہ ہے کہ جو لوگ قرآنی نظام کی صداقت پر ایمان رکھیں وہ اپنے ہیں جو اس کے مخالف ہوں وہ بیگانے۔
۔۔۔ خواہ وہ روس کے اشتراکی ہوں یا امریکہ کے جمہوریت نواز۔ (۴) اس نظام کی بنیاد اس ایمان پر ہے کہ زندگی
اسی دنیا کی زندگی نہیں۔ موت کے بعد بھی آگے چلتی ہے اور انسان کا ہر ارادہ اور عمل اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہتا
ہے ۔۔۔ خواہ وہ اس زندگی میں سامنے آئے، یا اس کے بعد۔ اسی تصور کو بالفاظ دیگر یوں بیان کیا جاتا ہے
کہ انسان اپنے ہر عمل بلکہ ہر ارادہ تک کے لئے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔
یہ اصول غیر متبدل ہیں اور کسی دور کے کسی "اسٹالن" کو اس کا اختیار نہیں کہ ان میں کسی قسم کی
تبدیلی کر سکے ۔۔۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں جناب مستفسر سے کہ کیا نوع انسان کے امن و فلاح کا ضامن
اس قسم کا نظام ہو سکتا ہے یا اشتراکی نظام!

(طلوع اسلام۔ جنوری ۱۹۴۷ء)

اسلامی سوشلزم
یا
قرآن کا اشتراکی نظام؟

انسانی زندگی کا پہلا دور وہ تھا جسے قرآنِ کریم "آدم کی جنّت" کہہ کر پکارتا ہے۔ اس جنت کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ ـــ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۔ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۔ (۲۰/۱۱۸-۱۱۹) اس میں نہ کسی کو بھوک کا خوف ستاتا تھا، نہ پیاس کا۔ نہ کسی کو لباس کے لئے پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا نہ مکان کے لئے ـــ زمین، رزق کا بنیادی ذریعہ تھی (اور ہے) اور اس پر ہنوز کسی نے لکیریں کھینچ کر اپنی ملکیت نہیں جتائی تھی ـــ اس دور کا انسانی لغت "ملکیت" کے لفظ سے آشنا نہ تھا۔ وہاں تصور "تمتع" (UTILITY) کا تھا۔ اسی لئے قرآن نے ارض کے متعلق کہا تھا کہ وہ متاع ہے، ملک نہیں۔ لہذا، اُس دور میں ابھی "میری اور تیری" کے جھگڑے نہیں پیدا ہوئے تھے۔ اس وقت کیفیت یہ تھی کہ ـــ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا۔ (۲/۳۵)۔ جسے بھوک لگتی تھی وہ جہاں سے جی چاہے پیٹ بھر کر کھا لیتا تھا۔ "حَيْثُ شِئْتُمَا" (جہاں سے جی چاہے) کی کیفیت صاف بتا رہی ہے کہ وہ زندگی انفرادی ملکیتوں کی نہیں تھی، اشتراکی تمتع کی تھی۔ اسے قرآن نے جنّتی زندگی سے تعبیر کیا ہے۔

اس کے بعد بعض لوگوں کے ذہن میں انفرادی مفاد پرستانہ تصور نے انگڑائی لی (قرآن نے اسے شیطانی وسوسہ سے تعبیر کیا ہے) اور اس ذہنیت نے ابنِ آدم سے وہ جنّت چھین لی۔ اس سے

اُس دور کا آغاز ہوا جس میں حالت یہ ہو گئی کہ ۔ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۔ (۲/۳۶) انسان اور انسان کے درمیان اپنے اپنے مفاد کی حدفاصل قائم ہو گئی ۔ ان میں باہمی "عداوت" پیدا ہو گئی ۔۔۔ (اَلْعُدْوَۃ اس لکڑی WEDGE کو کہتے ہیں جو دو لکڑیوں کے درمیان دیدی جاتی ہے تاکہ وہ ایک دوسرے سے الگ الگ رہیں۔ بادنیٰ تدبر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ نظامِ سرمایہ داری میں انفرادی مفادات کے باہمی ٹکراؤ سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے اسے محسوس طور پر سامنے لانے کے لئے العداوۃ سے بہتر تشبیہ اور کون سی ہو سکتی تھی ؟) یہ دورِ سرمایہ پرستی جوں جوں آگے بڑھتا گیا، انسان اور انسان میں حائل شدہ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی ۔ اس خلیج کو پاٹ دینا ذہنِ انسانی کے بس کی بات نہیں تھی ۔ اسے انفرادی مفاد پرستی کا اب چسکا پڑ گیا تھا کہ وہ کسی دوسرے نظام کا تصور ہی نہیں کر سکتا تھا ۔ اس مقصد کے لئے خدا کی طرف سے راہ نمائی ملنے کا سلسلہ جاری ہوا ۔ حضرات انبیاء کرامؑ کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ وہ آدم کو پھر سے وہ جنت دلا دیں جس سے شیطانی وسوسہ انگیزی نے اسے نکالا تھا ۔ یہ حضرات آتے اور "میری اور تیری" کی تفریق ہٹا کر اپنے دائرۂ عمل کے اندر پھر سے اس برادری کی تشکیل کر جاتے جس میں انفرادی مفاد پرستی کی وجہ سے پیدا شدہ عداوتیں باقی نہ رہتیں ۔ لیکن ان کے چلے جانے کے بعد مفاد پرستوں کا گروہ پھر برسرِ اقتدار آجاتا اور پھر سے اسی نظام کو قائم کر دیتا ۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی، حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت تھی ۔ آپؐ نے اپنی عدیم النظیر تعلیم اور فقید المثال عمل سے ایک ایسی برادری کی تشکیل فرمائی جس میں انفرادی ملکیتوں کا عداوت انگیز تصور، بھائی کو بھائی سے الگ کرنے کا موجب نہیں بنتا تھا ۔ اس برادری کی تشکیل کن بنیادوں پر ہوئی تھی اس کا سمجھ لینا ضروری ہے ۔

مسلمان کیسے ہوا جاتا ہے

آج ہماری کیفیت یہ ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوتے ہیں، انہیں "مسلمان ہونے" کی ضرورت ہی نہیں ہوتی ۔ اور جو غیر مسلم، مسلمان ہونا چاہتا ہے ۔ اس کے لئے بھی اتنا ہی ضروری ہوتا ہے کہ وہ 'اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ' کے الفاظ دہرا دے ۔ لیکن اسلامی برادری کی تشکیل اس طرح نہیں ہوئی تھی ۔ اسلامی برادری ایک سوسائٹی تھی جس میں شامل ہونے کیلئے ایک معاہدہ (CONRACT)

پر دستخط کرنا ضروری تھا۔ وہ معاہدہ یہ تھا کہ

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ (۹/۱۱۱)۔

اس سوسائٹی کی ممبرشپ قبول کرنے والا اس امر کا اقرار واعلان کرتا تھا کہ اب سے میں اپنی جان اور اپنے مال کا مالک نہیں رہا۔ میں نے اسے "اللہ" کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ اور "اللہ" اس کے جواب میں وعدہ کرتا تھا کہ اسے، اس کے عوض وہ "جنت" مل جائے گی جس سے آدم نکلا تھا۔ اور جس کی تلاش میں کاروانِ انسانیت اس طرح مارا مارا پھر رہا ہے۔ یہ عہد و معاہدہ یونہی نظری اور اعتقادی نہیں تھا کہ ایک شخص نے یہ الفاظ دہرا دیئے اور سمجھ لیا کہ معاہدہ کی شرط پوری ہو گئی ہے۔ اسے اپنی جان اور مال سب کچھ فروخت کر دینا ہوتا تھا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا، خود تو کسی انسان کے سامنے آتا نہیں، اس لئے یہ متاع کس کے پاس بیچی جاتی تھی؟ اس کے لئے خود خدا نے بتا دیا کہ اسے تم اس رسولؐ کے ہاتھوں فروخت کر دو جو ہمارا نظام قائم کرنے کے لئے یہ عہد تم سے لیتا ہے۔ اور اسکے بدلے میں، جو ذمہ داری ہم نے لی ہے (یعنی تمہیں پھر سے جنت دیدینے کی ذمہ داری) اسے یہی نظام پورا کردے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ یہ سودا کیا کرتے تھے، ان کے متعلق کہہ دیا کہ

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (۴۸/۱۰)

اے رسولؐ! جو لوگ اپنی اس متاع کو تیرے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں وہ دراصل اسے خدا کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں۔ اس معاہدہ کی پختگی کے لئے تو جو ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتا ہے تو یہ ہاتھ دیکھنے میں تو تیرا ہاتھ ہوتا ہے لیکن درحقیقت یوں سمجھو کہ یہ خدا کا ہاتھ ہوتا ہے

خدا کی ذمہ داری

اس معاہدہ کے بعد یہ شخص اسلامی سوسائٹی کا ممبر بنتا تھا۔ اور یہ تھی وہ سوسائٹی جو دنیا میں اس جنت کو متشکل کرتی تھی جس میں، نہ کسی کو بھوک کا خوف ستاتا تھا نہ پیاس کا۔ نہ اسے لباس کی فکر پریشان کرتی تھی نہ مکان کی؛ جب اور جہاں کسی کو بھوک لگتی تھی اسے پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا تھا۔ یوں یہ سوسائٹی (اسلامی نظام) خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرتی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱)

زمین میں کوئی متنفس ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا نے اپنے سر نہ لے رکھی ہو۔

اسی ذمہ داری کی ضمانت کے لئے وہ نظام اعلان کرتا تھا کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)

اے افرادِ انسانیہ! تم رزق کی طرف سے پریشان مت ہو۔ ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

ملکیت کا نام اس نظام کا نام تھا اسلامی نظام، اور اسے قائم کرنے والی جماعت کے ممبروں کو کہتے تھے مسلمان۔ کچھ عرصے کے بعد مفاد پرست گروہوں نے پھر سر نکالا اور جو کچھ سابقہ انبیائے کرام کے پیش کردہ نظام کے ساتھ ہوا تھا وہی کچھ اسلامی نظام کے ساتھ ہو گیا۔ یعنی اسلام کے اشتراکی نظام کی جگہ انفرادی ملکیت کے نظام نے لے لی، اور بیع و شری کے خدائی عہدنامہ پر دستخط کر کے اس سوسائٹی کا ممبر بننے کے بجائے، محض اسلام کی طرف اپنی نسبت کرنے والے مسلمان سمجھ لئے گئے۔ ملکیت کے نظام کی بدترین شکل ملوکیت ہوتی ہے۔ اس میں ساری ملک ایک فرد کے قبضہ میں رہتی ہے۔ پھر جس جس کو وہ کچھ حصہ دیدے، وہ اس حصہ کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ باقی دنیا کی طرح یہی نظام مسلمانوں میں بھی متوارث چلا آرہا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ باقی دنیا اسے برنائے مصلحت قبول و اختیار کئے ہوئے ہے۔ جب کسی کی مصلحت کا تقاضا ہو وہ اسے بدل سکتے ہیں لیکن مسلمانوں نے (گذشتہ انبیائے کرام کے نام لیواؤں کی طرح) اسے خدائی نظام قرار دے رکھا ہے جسے بدلا ہی نہیں جا سکتا۔ حتیٰ کہ اب ان کی طرف سے یہاں تک بھی کہدیا جاتا ہے کہ انفرادی مفاد کے حصول کی خاطر جد و جہد کرنا "انسانی فطرت" کا تقاضا ہے۔ اس کے سوا، محنت کرنے کا کوئی اور جذبہ محرکہ ہو نہیں سکتا۔ اور چونکہ اسلام "دینِ فطرت" ہے اس لئے انفرادی مفاد پرستی عین مطابق اسلام بلکہ تقاضائے دین ہے۔ (خدا فریبی کی اس سے بدتر مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے)۔

عصرِ حاضر میں جب انسانی ذہن نے ملوکیت کے خلاف احتجاج کیا تو مفاد پرست گروہوں نے اس کے لئے ایک ایسی ترکیب تیار کی جس کا نام ڈیماکریسی (جمہوریت) رکھا گیا۔ ملوکیت اور مغربی جمہوریت

میں فرق صرف اصطلاح کا ہے۔ روح دونوں کی ایک ہے۔ یعنی انفرادی ملکیت کا تصور دونوں جگہ موجود ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے جو فیصلہ ایک فرد کیا کرتا تھا اور اسے "بادشاہ کا حکم" کہا جاتا تھا، اب وہ فیصلے مفاد پرستوں کا ایک گروہ کرتا ہے جو مختلف سیاسی حربوں اور دولت کے زور سے یہ پوزیشن حاصل کر لیتا ہے۔ اور ان کے فیصلوں کو مملکت کا قانون، اور ان کے مفاد کو مفاد عامہ (PUBLIC - INTEREST) - جیسی فریب آخریں اصطلاحات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اشتراکیت

لیکن زمانے کے تقاضے اس تغیر لفظی سے مطمئن نہیں ہو سکے۔ وہ "ملکیت" کے تصور سے اِبا کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ اشتراکیت (کمیونزم) کی صورت میں سامنے آیا۔ اس نقطۂ خیال سے دیکھئے یعنی انفرادی ملکیت کے تصور کو ختم کر دینے کے نقطۂ خیال سے، تو اشتراکیت نے وہی کچھ کرنے کا دعویٰ کیا ہے جو کچھ کرنے کے لئے اسلام آیا تھا۔ لیکن ان دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اشتراکیت انفرادی ملکیت کے تصور کو بزور مٹانا چاہتی ہے۔ لیکن اسلام اپنی ہمہ گیر تعلیم اور بلند فلسفۂ حیات کی بنا پر انسانی قلوب میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کر دیتا ہے کہ ملکیت کے اس تصور کو مٹانا ان کے لئے اسی طرح تقاضائے حیات بن جاتا ہے جس طرح طبیعی زندگی کے لئے سانس لینا تقاضائے حیات ہوتا ہے — ہم کسی قانون کے ڈر سے سانس نہیں لیتے — بہرحال، انفرادی مفاد پرستی (یعنی نظام سرمایہ داری) کے تصور کو مٹانا، اشتراکیت اور اسلام دونوں میں قدرِ مشترک ہے۔ اگر مسلمانوں کے سامنے دین اپنی حقیقی شکل میں ہوتا، تو وہ عصر حاضر کے اس تقاضے کو اپنے حق میں بڑی نیک فال سمجھتے۔ کیونکہ اس نے فضا اُس نظام کو دوبارہ متشکل کرنے کے لئے سازگار ہو گئی تھی جس کا قیام، اسلام کا مقصود تھا۔ لیکن ان کی (اور ان کے ساتھ عالم انسانیت کی) بدنصیبی کہ انہوں نے، اس موقع کو غنیمت سمجھنے کے بجائے، اس تصور کو خلاف اسلام قرار دیدیا اور سب سے بڑھ کر اس کی مخالفت شروع کر دی۔ سرمایہ دار مملکتوں کے لئے ان کا یہ ردِ عمل بڑا مفید مطلب تھا۔ اس لئے انہوں نے بھی ان کی پیٹھ ٹھونکی۔ اس طرح انہوں نے (مسلمانوں نے) اس محاذ میں، اس تصور کے سب سے بڑے مخالف کی حیثیت اختیار کر لی۔ چنانچہ اب صورت یہ ہے کہ ہمارا مذہبی پیشوائیت کا طبقہ اس مخالفت کو جہاد قرار

دے رہا ہے ان کی طرف سے، اس تصور کے خلاف (جسے سوشلزم سے تعبیر کیا جاتا ہے) دلائل کس قسم کے دیئے جاتے ہیں، وہ سننے کے قابل ہیں۔ اس سلسلہ میں مودودی صاحب اپنی کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" میں لکھتے ہیں:۔

ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے۔ لہذا اگر ہمیں اسلامی اصول پر زمین کے بندوبست کی اصلاح کرنی ہو تو ایسی تمام تجویزوں کو پہلے قدم ہی پر لپیٹ کر رکھ دینا چاہیئے جن کی بنیاد میں قومی ملکیت کا نظریہ اصل یا نصب العین کی حیثیت سے موجود ہو۔ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اسلام زبردستی مالکانِ زمین کی ملکیتیں چھین لینے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور بات صرف اتنی بھی نہیں ہے کہ وہ ایسے قوانین بنانے کی اجازت نہیں دیتا جن کے ذریعے سے کسی شخص یا گروہ کو اپنی ملکیت حکومت کے ہاتھ بیچنے پر مجبور کیا جاسکے۔ بلکہ درحقیقت اسلامی نظریۂ تمدن و اجتماع سرے سے اس تخیل ہی کا مخالف ہے کہ زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار حکومت کی ملکیت ہوں اور پوری سوسائٹی اس مختصر سے حکمران گروہ کی غلام بن کر رہ جائے جو ان ذرائع پر متصرف ہو۔ جن ہاتھوں میں فوج اور پولیس اور عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہیں انہی ہاتھوں میں سوداگری اور کارخانہ داری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہو جائے تو اس سے ایک ایسا نظامِ زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا ہے۔ اس لئے یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ اگر غاصبانہ طریقے سے زمینوں پر قبضہ نہ کیا جائے، بلکہ پورے پورے معاوضے دے کر حکومت تمام زمینوں کو ان کے مالکوں سے برضا و رغبت خرید لے تو اسلامی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی قباحت نہیں۔ جزئیاتِ شرع کے لحاظ سے چاہے اس میں قباحت نہ ہو، مگر کلیاتِ شرع کے لحاظ سے یہ تخیل ہی غلط ہے کہ عدلِ اجتماعی کی خاطر زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیتوں سے نکال کر قومی ملکیت بنا لیا جائے۔ یہ انصاف کا اشتراکی تصور ہے نہ کہ اسلامی تصور، اور اس تصور کی بنیاد پر ایک اشتراکی معاشرہ پیدا ہوتا ہے نہ کہ اسلامی معاشرہ۔ اسلامی معاشرہ کے لئے تو یہ نہایت ضروری ہے کہ اس کے اگر سب نہیں تو اکثر

افراد اپنی معیشت میں آزاد ہوں۔ اور اس غرض کے لیے ناگزیر ہے کہ ذرائع پیداوار افراد ہی کے ہاتھوں میں رہیں۔

اس دلیل کا بودا پن

اس دلیل کا ذرا تجزیہ کیجئے۔ سوال یہ تھا کہ "اسلامی نظام" میں، ذرائع پیداوار، افراد کی ملکیت میں رکھے جائیں گے یا امت کی مشترکہ تحویل میں ہوں گے۔ اس نکتہ کو ایک دفعہ پھر سمجھ لیجئے کہ سوال یہ تھا کہ کیا اسلام کی رُو سے یہ جائز ہوگا کہ ذرائع پیداوار امت کی مشترکہ تحویل میں رکھے جائیں اس کے جواب میں مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ اگر اسلامی نظامِ حکومت میں ذرائع پیداوار نظام کی تحویل میں دیدیئے جائیں تو اس سے پوری سوسائٹی اس مختصر سے حکمران گروہ کی غلام بن کر رہ جائیگی جوان ذرائع پر متصرف ہوگا — جن کے ہاتھوں میں فوج اور پولیس اور عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہوں گی، انہی کے ہاتھوں میں اگر سوداگری کارخانہ داری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہو جائے تو اس سے ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہو جائے گا جس سے بڑھ کر انسانیت کُش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کرسکا۔

سوال یہ ہے کہ کیا اسلامی نظام میں بھی کیفیت یہ ہوگی کہ

(۱) پورا اقتدار سمٹ کر ایک مختصر سے گروہ کے ہاتھوں میں آجائے گا۔ اور امت اس گروہ کی غلام ہوگی۔

(۲) اس گروہ کے ہاتھ میں، فوج، پولیس، قانون سازی کا جو اقتدار ہوگا وہ اسے، قوم کو اپنا غلام بنانے کے لئے استعمال کرے گا۔ لہذا

(۳) اگر ذرائع پیداوار بھی اسی گروہ کے ہاتھ میں دیدیئے جائیں تو وہ اس شیطانی نظام کے ہاتھوں انسانیت کا گلا گھٹ جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ اگر اسلامی نظام کے ارباب حل وعقد کی بھی یہی حالت ہوگی کہ وہ اپنے اقتدار و اختیار کو، انسانیت کو ذبح کرنے کے لیے استعمال کریں گے، تو پھر فرعونی نظام اور اسلامی نظام میں فرق کیا ہوگا؟ اگر حالت یہی ہونی ہے تو پھر اس اسلامی نظام کو کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں۔

کہ اس کی خاطر موجودہ نظاموں کو الٹ دینے کے لئے اس قدر قربانیاں کی جائیں! یہ حضرات ہمیں بتاتے یہ ہیں (اور یہ حقیقت بھی ہے) کہ اسلام کے نظامِ حکومت میں نظم ونسق ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جو نہایت متدین، متشرع، متقی، خداترس، صالح۔ اور بہ ہمہ وجوہ، خدا اور اس کے رسول کے رنگ میں رنگے ہوں گے، اور وہ خلافتِ راشدہ کے نظام کو پھر سے قائم کریں گے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس قسم کے لوگوں کی بھی حالت یہی ہوگی، کہ جس قدر ان کے اختیارات بڑھتے جائیں گے، اسی قدر انسانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا جائے گا تو پھر ان لوگوں میں اور موجودہ ابلیسی نظامہائے حکومت کے اربابِ بست وکشاد میں فرق کیا ہوگا؟ اگر "صالحین" کے ہاتھوں بھی خلقِ خدا کا وہی حشر ہونا ہے جو "فاسقین اور فاجرین" کے ہاتھوں میں ہو رہا ہے تو "صالحین" کو برسرِ اقتدار لانے کے لئے اس قدر کد وکاوش کا ہے کے لئے؟

یہ ہے وہ دلیل جسے یہ حضرات اس طمطراق سے پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ اگر زمین کو انفرادی ملکیت سے نکال کر امت کی مشترکہ تحویل میں دیدیا جائے تو اس سے ایسا نظام وجود میں آجاتا ہے جس سے زیادہ انسانیت کش نظام شیطان وضع نہیں کر سکا۔ ہم ان سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے، عراق کی زمینوں کے متعلق فیصلہ کیا تھا کہ انہیں انفرادی ملکیت میں دینے کے بجائے، حکومت کی تحویل میں رکھا جائے، تو کیا اس کے بعد وہ نظام، واقعی "انسانیت کش شیطانی" نظام میں تبدیل ہو گیا تھا۔

ذہنی انتشار

اگلے دنوں روزنامہ نوائے وقت میں چوہدری محمد علی صاحب کا ایک مقالہ (مسلسل قسطوں میں) شائع ہوا تھا جس کا موضوع تھا "اہلِ پاکستان کے سیاسی اور معاشی مقاصد"۔[1] اس میں انہوں نے بھی ذرائع پیدا وار کو قومی تحویل میں دیدینے کی مخالفت کی ہے۔ لیکن اس کے لئے ان کی دلیل کیا ہے؛ وہ بھی سننے کے لائق ہے --- وہ اسلامی نظامِ حکومت کی خوبیاں گنواتے

---

[1] نوائے وقت بابت ۱۹؍ ۲۰؍ ۲۱؍ جون ۱۹۶۷ء۔

ہوئے لکھتے ہیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اسلام میں ارباب حکومت کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ حکومت کے اختیارات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے یا اپنے خویش واقارب کے لئے مال ودولت فراہم کریں۔ حکومت کے تمام اختیارات اور سارا خزانہ یا بیت المال عوام کی امانت ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ "میرا تعلق تمہارے مال کے ساتھ وہی ہے جو یتیم کے ولی کا تعلق یتیم کے مال کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر میں حاجتمند نہ ہوں تو اس میں سے کچھ نہ لوں گا۔ اور اگر حاجتمند ہوں تو معمولی گزارہ لے لوں گا۔ چنانچہ اس اصول کے مطابق خلافت راشدہ میں خلیفہ اور گورنروں اور عاملوں کے لئے بیت المال سے فقط اتنا شاہرہ مقرر کیا گیا تھا جو ان کو اور ان کے گھر والوں کو ایک عام مسلمان گھرانے کی طرح زندگی بسر کرنے دے۔ حالانکہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں فتوحات اور مال غنیمت کی کثرت کی وجہ سے عام لوگوں کی مالی حالت بدرجہا بہتر ہوگئی تھی۔ لیکن خلیفہ وقت کی خود یہ حالت تھی کہ کپڑوں میں کئی کئی پیوند لگے ہیں۔ مکان کے لئے ایک جھونپڑا ہے اور کھانا وہی ہے جو ایک آدمی کو میسر آتا ہے۔ خلافتِ راشدہ کے دور میں ہر خلیفۂ وقت کی یہی کیفیت رہی۔ اور مختلف صوبوں کے گورنروں کو بھی ایسی ہی زندگی بسر کرنے کے احکام تھے۔ اس امر پر اجماع صحابہ ہے کہ جو حکمران ہے وہ سوداگری نہیں کرسکتا۔ یعنی حکومت کو مالدار بننے کا ذریعہ نہیں بنایا جاسکتا۔ خلافت راشدہ اور دوسری طرز حکومت کے درمیان یہ حد فاصل ہے۔ کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ حکمرانوں نے بالعموم حکومت کو اپنے اور اپنے اعزہ واقارب کے لئے مال و آسائش کا ذریعہ بنایا اور بندگانِ خدا پر اپنی آقائی کا سکہ جمایا۔

(نوائے وقت۔ بابت ۲۰ رجون ۱۹۶۷ء)

ظاہر ہے کہ جس نظام حکومت میں حکمران طبقہ کی یہ کیفیت ہو۔ اس میں اگر معاشی ذرائع، حکومت کی تحویل میں دیدیئے جائیں تو اس سے کیا خرابی لازم آسکتی ہے؟ لیکن اس کے باوجود وہ لکھتے ہیں۔ کہ

اسلام ارتکاز مال و اقتدار پر ضرب کاری لگاتا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ وہ دونوں کو ایک ہاتھ میں جمع ہونے دے، ان میں تفریق کرتا ہے۔

یعنی ارباب اقتدار، ابوبکرؓ و عمرؓ کی سیرت و کردار کے حامل بھی کیوں نہ ہوں، اسلام انہیں بھی قابل اعتماد نہیں سمجھتا اس لئے اقتدار اور مال کو ایک ہی ہاتھ میں جمع ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ یاللعجب! جس نظام میں اتنی بھی صلاحیت نہیں کہ وہ ارباب اختیار کو صرف مال کے معاملہ میں حدود کے اندر رکھ سکے، اس کے متعلق یہ دعوے کرنا کہ وہ انسانیت کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے، خوش فہمی کے سوا اور کیا کہلا سکتا ہے؟

ہمیں اس اعتراض کے وزنی ہونے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ معاشرہ کے موجودہ نظام میں ارباب اقتدار کے ہاتھ میں جس قدر زیادہ اختیارات ہوں گے معاشرہ میں اتنی ہی زیادہ خرابیاں پیدا ہوں گی۔ لیکن اس سے یہ دعوے کرنا کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ذرائع پیداوار کو قوم کی مشترکہ تحویل میں رکھا جائے ـــــ اگر فریب دہی نہیں تو خود فریبی ضرور ہے۔ اس موضوع پر گفتگو اس انداز سے ہونی چاہیے کہ

(۱) کیا اسلام کی رُو سے یہ جائز ہے کہ ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیت کے بجائے امت کی مشترکہ تحویل میں رکھا جائے۔

(۲) اگر یہ جائز نہیں تو پھر یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوگا کہ حکمران "صالحین" ہیں یا "فاسقین"۔

(۳) اور اگر یہ جائز ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ معاشرہ کی موجودہ حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جن سے ہم بتدریج اس منتہیٰ تک پہنچ سکیں۔ اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ ہم معاشرہ کے پورے نظام کو آہستہ آہستہ قرآن کریم کی عطا کردہ اقدار کے قالب میں ڈھالتے جائیں۔ یاد رکھئے۔ اسلام، زندگی کا کلی نظام عطا کرتا ہے معاشی نظام اس کا ایک گوشہ ہے۔ اس نظام کے مختلف گوشے اپنے انسانیت ساز نتائج اسی صورت میں مرتب کریں گے جب اسے بالکلیہ نافذ کیا جائے۔

اس کے کسی ایک گوشے کو، باقی نظام سے الگ کر کے، مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کئے جا سکتے۔

اسلامی سوشلزم

اب ہم اس مسئلہ کے دوسرے گوشے کی طرف آتے ہیں جو گوشۂ اوّل سے بھی زیادہ اہم ہے اور اس کا تعلق ہے ان حضرات سے جو اس کے قائل اور مدعی ہیں کہ پاکستان میں سوشلزم کا نظام رائج ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں چند بنیادی حقائق کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

(۱) سوشلزم ایک ایسی اصطلاح ہے جس کا کوئی ایک مفہوم ابھی تک متعین نہیں ہو سکا۔ اس لئے جب یہ کہا جائے کہ پاکستان میں سوشلزم کا نظام رائج ہونا چاہیئے تو اس سے کوئی خاص نظام سامنے نہیں آتا۔

(۲) چونکہ سوشلزم کی نسبت عام طور پر روس اور (اب) چین کی طرف کی جاتی ہے اس لئے اس اصطلاح سے ذہن اسی طرف جاتا ہے۔ یعنی سمجھا یہ جاتا ہے کہ یہ لوگ یہاں روس (یا اب) چین کی سوشلزم رائج کرنا چاہتے ہیں۔

(۳) روس اور (اب) چین میں سوشلزم سے مفہوم صرف معاشی نظام نہیں۔ سوشلزم (اور اس سے آگے کمیونزم) سے مراد ہے ایک خاص فلسفۂ حیات اور اس پر متفرع معاشی نظام ہے وہاں (بالخصوص چین میں) ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ چین کی تو روس سے لڑائی ہی اس بات پر ہے کہ روس نے سوشلزم کے فلسفۂ حیات میں تحریف کر دی ہے۔ اسی لئے وہ اسے "بدعتی" قرار دیتا ہے۔

(۴) سوشلزم کا معاشی نظام تو قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے۔ لیکن سوشلزم کا فلسفۂ قرآنی فلسفۂ حیات سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ اس کی ضد ہے۔

(۵) ہمارے ہاں سوشلزم کے مدعی، ان دونوں بنیادی چیزوں (یعنی سوشلزم کے فلسفۂ حیات اور اس کے معاشی نظام) میں تفریق نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ نظامِ سرمایہ داری کے حامی ہیں، وہ سوشلزم کے خدا فراموش فلسفۂ حیات کو ابھار کر سامنے لے آتے ہیں اور پھر مسلمانوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا تمہارے نزدیک اس قسم کا نظام جس میں نہ خدا کو مانا جاتا ہے نہ رسول کو، نہ آخرت پر ایمان ہوتا ہے نہ وحی پر، کسی طرح بھی قابلِ قبول

ہو سکتا ہے؟ ادنظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام کسی بھی مسلمان کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ اس طرح وہ اپنے پراپیگنڈہ میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

(۲) اس تلبیس (یا التباس) کو محسوس کرتے ہوئے بعض حضرات نے یہاں 'اسلامی سوشلزم' کی اصطلاح رائج کرنی چاہی ہے۔ لیکن ان کی طرف سے بھی متعین طور پر نہیں بتایا جاتا کہ اس سے مراد کیا ہے؟ اس سے نظامِ سرمایہ داری کے حامیوں کو پھر اعتراض کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ چنانچہ جماعت اسلامی کے ترجمان، ہفتہ وار 'ایشیا' (لاہور) کی ۱۶ اپریل ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں، اس موضوع پر سوال و جواب کی شکل میں مودودی صاحب کے جو اعتراضات شائع ہوئے۔ وہ غور طلب ہیں۔

"سوال" آج کل "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح کثرت سے استعمال ہو رہی ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ براہ کرم وضاحت فرمائیے۔

جواب :- جو لوگ "اسلامی سوشلزم" کا نام لیتے ہیں، پہلے ان کا فرض ہے کہ وہ اس کی وضاحت فرمائیں، بعد میں ہم کچھ کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت صرف "اسلامی سوشلزم" کے الفاظ ہی سنے جاتے ہیں میری نگاہ سے نہیں گذرا کہ کسی نے اس کی وضاحت بھی کی ہو، اور اگر کہیں کچھ لوگوں نے اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے تو دو آدمیوں کی وضاحت آپس میں نہیں ملتی ــــ ہر ایک نئے معنی پیش کرتا ہے ــــ اب ہوائی باتوں کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ یہ تو "اسلامی سوشلزم" کا نعرہ بلند کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ وضاحت سے بتائیں کہ اس سے ان کا مطلب کیا ہے؟

" میں مختصراً جو کچھ بتا سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ سوشلزم ایک خاص مسلک کی حیثیت سے دنیا میں معروف ہے اس مسلک کے اگرچہ مختلف مذاہب (SCHOOLS OF THOUGHT) ہیں مگر ان سب میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ کہ ایک ملک کے تمام ذرائع کو نیشنلائز کر لیا جائے۔ اب اگر اس نیشنلائزیشن کو سوشلزم سے نکال دیا جائے تو اس کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا اور اگر اس مفہوم کو باقی رکھا جائے جیسا کہ وہ ہے تو اس کے ساتھ اسلامی لفظ لگانا سراسر فریب ہے۔

" اسلام میں اس طرح کی قومی ملکیت کا کوئی جواز نہیں کہ تجارت، کھیت، کارخانے، گھر حتیٰ کہ برتن، کپڑے تک سرکاری ملکیت میں ہوں اور افراد کے پاس کوئی شے نہ چھوڑی جائے۔ یہ چیز بدترین

آمریت کے سوا کچھ نہیں دیتی ۔۔۔ ہمارے ہاں جو لوگ اسلامی سوشلزم کا نام لیتے ہیں وہ اپنے آپ کو جمہوریت کا قائل بھی کہتے ہیں ۔۔۔ حالانکہ اگر سوشلزم کا نام کہیں رائج ہو تو جمہوریت وہاں پنپ ہی نہیں سکتی۔ سوشلزم ڈکٹیٹر شپ کے ذریعے آتا ہے یا پھر اگر جمہوریت موجود ہو تو اسے ختم کر دیتا ہے۔ ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے کہ جہاں ذرائع پیداوار قومی ملکیت میں لے لئے گئے ہوں تو وہاں کیا حال ہو گا۔ اس کا اندازہ خود لگا لیں۔ سوشلزم میں زمین اور کھیت قومی ملکیت ہوتے ہیں، آپ صرف کاشتکار ہوتے ہیں۔ سارے کارخانے حکومت کے قبضے میں ہوتے ہیں، آپ صرف مزدور ہوتے ہیں ۔۔۔ اظہار رائے آپ نہیں کر سکتے، اختلاف کا کوئی آپ کو حق حاصل نہیں ہوتا ۔۔۔ جن قوموں پر ڈکٹیٹر شپ مسلط ہے وہ تو خدا کے عذاب میں مبتلا ہیں ۔۔۔ لیکن اس قوم سے زیادہ احمق کون ہو گا، جو اسے اپنی مرضی سے اپنے اوپر مسلط کرنے کی خواہش کرے۔ انسان کی معیشت آزاد نہ ہو تو اس کی ہر آزادی ختم ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں اس کا ضمیر بھی غلام ہو کر رہ جاتا ہے ۔۔۔ جبکہ اسلام نے انسان کی بھلائی کا جو راستہ تجویز کیا ہے اس میں کسی زبردستی یا جبر کا تصور نہیں ۔۔۔ اسلام ضمیر کی موت یا شرف آدمیت سے محرومی کی قیمت پر کسی نظام حیات کا قائل نہیں ہے۔

"میں چاہتا ہوں کہ جن پارٹیوں کے لیڈر "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، وہ حقائق کی روشنی میں ان باتوں پر غور کریں۔ اس سے ان کی تمام غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں"۔

یہ تقاضا ذہنی ہے کہ اسلامی سوشلزم کا نعرہ بلند کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ وضاحت سے بتائیں کہ اس سے ان کا مطلب کیا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔

(۱) سوشلزم سے مراد ہے مارکس کا پیش کردہ فلسفۂ حیات، روس یا چین کا معاشی نظام۔ ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ اسلامی پیوند لگ ہی نہیں سکتا۔

(۲) اگر سوشلزم سے اس کا فلسفۂ زندگی نکال دیا جائے تو وہ سوشلزم نہیں رہتی بلکہ ایک سوشل سسٹم (SOCIAL SYSTEM) رہ جاتا ہے۔ اگر اسلامی سوشلزم سے مراد ہے (اسلام کا فلسفۂ حیات + اس قسم کا معاشی نظام جو روس یا چین میں رائج شدہ نظام کے مماثل ہے) تو اسے آپ اسلام کا سوشل سسٹم کہہ سکتے ہیں، اسلامی سوشلزم نہیں کہہ سکتے۔ بادی النظر میں ہر دو اصطلاحات میں یونہی لفظی سا فرق نظر آئے گا لیکن ذرا گہرائی میں جا کر دیکھیئے تو

یہی لفظی سا فرق ان دونوں کے مفہوم کو الگ الگ کر دے گا۔ سوشلزم میں (ISM) کا تعلق فلسفۂ حیات سے ہے۔ لیکن (سوشل سسٹم) میں فلسفۂ حیات کا تصور شامل نہیں ہوتا، صرف سوشل نظام مقصود ہوتا ہے۔ لہٰذا اسے

قرآن کا سوشل سسٹم

کہا جا سکتا ہے۔ اس پر وہ اعتراضات وارد نہیں ہو سکیں گے جو "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح پر (حسن نیت یا پراپیگنڈہ کی غرض سے) عائد کئے جاتے ہیں۔

(۳) سوشلزم کے خلاف یہ اعتراض بھی درزنی ہے کہ یہ ڈکٹیٹرشپ کے ذریعے ہی قائم ہو سکتی ہے — یہ اس لئے کہ روس یا چین میں سوشلزم کے علمبردار شروع سے یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ اس کی بنیاد (PROLETARIAT DICTATOR-SHIP) ہے۔ "قرآن کے نظام معیشت" پر یہ اعتراض بھی وارد نہیں ہو سکتا..... اس لئے کہ اس کا معاشی نظام کوئی الگ شے نہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ قرآن ایک نظام کلی دیتا ہے جو زندگی کے ہر گوشہ کو محیط ہوتا ہے۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی نظام، سب اس کلی نظام کے مختلف پہلو (FACETS) ہیں چونکہ قرآنی نظام میں ڈکٹیٹرشپ نہیں، اس کا نظام مشاورتی ہے، جس میں ساری امت شریک ہوتی ہے، اس لئے قرآنک سوشل سسٹم پر یہ اعتراض بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے لئے ڈکٹیٹرشپ لازمی ہے۔

(۴) چوہدری محمد علی صاحب نے اپنے مضمون میں کہا ہے کہ سوشلزم، تشدد کے ذریعے عمل میں آتی ہے۔ ان کا یہ اعتراض بھی وقیع ہے۔ سوشلزم کے مدعی اس حقیقت کو چھپا کر نہیں رکھتے کہ یہ انقلاب تشدد کے بغیر برپا نہیں ہو سکتا۔ لیکن قرآن کے سوشل نظام پر یہ اعتراض بھی وارد نہیں ہو سکتا۔ یہ انقلاب قلب و دماغ میں صالح تبدیلی سے برپا ہوتا ہے۔ ایمان، قلب و دماغ کی کامل رضامندی سے صداقت کو تسلیم کر لینے کا نام ہے۔ یہ (CONVICTION) ہے (COERCION) نہیں۔ اس میں طاقت کی ضرورت وہاں لاحق ہوتی ہے جہاں اسلام کے دشمن (قریش مکہ کی طرح) اس نظام کے قیام کی راہ میں حائل ہوں یا اسے طاقت کے ذریعے مٹانا چاہیں۔

(۵) مودودی صاحب نے اعتراض کیا ہے کہ "سوشلزم میں زمین اور کھیت قومی ملکیت ہوتے ہیں۔ آپ صرف کاشتکار ہوتے ہیں۔ سارے کارخانے حکومت کے قبضے میں ہوتے ہیں، آپ صرف مزدور

ہوتے ہیں"۔ یہ اعتراض اس سسٹم پر تو وارد ہو سکتا ہے جس میں "قوم" الگ ہو اور "افراد" الگ۔ یا "حکومت" اور ہو اور "رعایا" اور۔ قرآنی نظام میں یہ فرق اور امتیاز ہوتا ہی نہیں۔ وہاں 'قوم' کا وجود افراد سے الگ نہیں ہوتا۔ نہ ہی حکومت، اور رعایا دو جداگانہ وحدتیں ہوتی ہیں۔ وہاں ہر فرد قوم ہوتا ہے، اور حکومت خود افراد کی اپنی ہوتی ہے۔ کسی غیر کی نہیں ہوتی۔ اس لئے اس میں قومی ملکیت سے مراد ہوتی ہے جملہ افراد کی مشترکہ ملکیت (بلکہ تحویل) اور حکومت سے مراد ہوتی ہے افراد کا اپنا قائم کردہ نظامِ معاشرہ۔

آپ نے غور فرمایا کہ سطح بین حضرات جسے محض اصطلاح کا لفظی فرق کہتے ہیں، وہ درحقیقت کس قدر دور رس نتائج کا حامل ہے۔ یہ وجہ ہے جو ہم اس پر زور دیتے رہتے ہیں کہ ہمیں اصطلاحاتِ قرآنی ہی استعمال کرنی چاہئیں۔

ایک اہم شہادت

باقی رہا مودودی صاحب کا یہ کہنا کہ اگر سوشلزم کا مفہوم ہے نیشنلائزیشن - NATIONALI-SATION - یعنی ذرائع پیداوار کو اُمّت کی مشترکہ تحویل میں دے دینا، تو اس کے ساتھ اسلامی لفظ لگانا سراسر فریب ہے۔ مودودی صاحب سے کسی معاملہ میں قرآن کی بنیادوں پر گفتگو کرنا بے کار ہے سو اس سلسلہ میں ہم ایک ایسی تائید پیش کرتے ہیں جسے (غالباً) وہ سند تسلیم کر لیں گے۔ اخوان المسلمین کے سربراہ، سید قطب (مرحوم)، کے متعلق ان کے جو خیالات ہیں وہ واضح ہیں۔ وہ انہیں عصرِ حاضر کا عظیم مفکر اور جلیل القدر مفسرِ قرآن مانتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب (العدل الاجتماعیہ) "اسلام کا نظامِ عدل" میں لکھتے ہیں کہ

> "اسلام یہ کر سکتا ہے کہ مفادِ عامہ سے متعلق ساری چیزوں کو، ان نفع اندوزوں اور سٹہ بازوں کے ہاتھ سے لے کر جو قومی مفاد کا ذرا بھی پاس اور لحاظ نہیں رکھتے، قوم کے ہاتھ میں دیدے"
>
> (صفحہ ۳۰۲)

اس سلسلہ میں اتفاق سے خود مودودی صاحب کی ایک ایسی بات سامنے آتی ہے جو ان کے تمام اعتراضات کا جواب مہیا کر دیتی ہے۔ ان کے درسِ قرآن و حدیث میں کسی نے یہ سوال پوچھا کہ

آپ نے فرمایا ہے کہ آدمی بقدر کفاف پس انداز کرسکتا ہے۔ ہزار روپیہ ماہوار آمدن پانے والے آدمی کے لئے بقدر کفاف کیا رقم ہوسکتی ہے۔

اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ

اس کا فیصلہ تو آدمی خود کرسکتا ہے۔ اور صحیح فیصلہ وہی شخص کرے گا جس میں اسلامی ذوق موجود ہو۔ مغربی ذوق رکھنے والے آدمی کا انداز بالکل مختلف ہوگا۔

اصل معاملہ یہ ہے کہ ایک اسلامی معاشرے میں کبھی کسی شخص کو اپنے مستقبل کی فکر نہیں ہوتی۔ یہ معاشرہ خود سارا انتظام کرتا ہے۔ اس کے برعکس مغربی معاشرہ میں ہر فرد ایک دوسرے سے کٹا ہوا نظر آتا ہے اور اسے اپنے مستقبل کو خود سنبھالنا پڑتا ہے اسلئے وہاں بقدر کفاف کا مفہوم اسلامی معاشرہ سے بالکل مختلف ہے۔

(ایشیا- مؤرخہ ۲ ہے)

بس یہی فرق قرآن کے اشتراکی معاشرہ اور نظام سرمایہ داری میں ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشرہ میں ہر فرد دوسرے سے کٹا ہوا نظر آتا ہے۔ اور اسے اپنے مستقبل (بلکہ حال اور مستقبل دونوں) کو خود سنبھالنا پڑتا ہے اور قرآن کے اشتراکی معاشرہ میں کسی شخص کو اپنے (حال اور) مستقبل کی فکر آپ نہیں کرنی پڑتی۔ معاشرہ اس کا خود سارا انتظام کرتا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جب تمام افراد کے (حال اور) مستقبل کا فکر معاشرہ کو کرنا ہوگا تو معاشرہ اپنے اس عظیم فریضہ کو اسی صورت میں پورا کرسکے گا جب ذرائع پیداوار افراد کی ملکیت کے بجائے، معاشرہ کی تحویل میں رہیں۔ اسی کا نام قرآنی نظام ربوبیت یا قرآن کا سوشل نظام معیشت ہے۔ (سوشل کے معنی ہی یہ ہیں کہ افراد ایک دوسرے سے کٹے ہوئے نہ ہوں۔ ایک وحدت کے غیر منقسم اجزا ہوں) افراد کے متعلق معاشرہ کی یہی وہ اجتماعی ذمہ داری تھی جس کے احساس سے حضرت عمرؓ نے

فرمایا تھا کہ

اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو خدا کی قسم، عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

اور اسی ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لئے آپ نے فیصلہ کیا تھا کہ عراق کی مفتوحہ زمینیں افراد میں تقسیم کرنے کے بجائے مملکت کی تحویل میں رہیں گی۔ یہی وہ قرآن کا اشتراکی تصور تھا جس کی تابندہ جھلک ہمیں صحیحین کی اس روایت میں ملتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

حضرت ابو موسیٰؓ اشعریؓ نے بیان کیا کہ اشعر قبیلہ والوں کے ہاں دستور یہ تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے ہاں کھانا تھوڑا رہ جاتا، یا ان کے ہاں بال بچوں پر ویسے فاقے کی نوبت آجاتی تو یہ لوگ اپنے کھانے کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے اور ایک برتن میں برابر حصے لگا کر آپس میں تقسیم کر لیتے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔

اشعریوں کا یہی دستور تھا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (قرآنی راہ نمائی میں) اسلامی نظامِ معاشرہ کے آئین کی حیثیت سے رائج فرمایا۔ اسی کو قرآنی نظامِ معیشت کہا جاتا ہے جس میں پوری امت کا دستر خوان مشترکہ ہوتا ہے۔

ایک فریب — ایک حقیقت

جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے، ہم اس وقت تاریخ کے ایک بڑے نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ قرنہا قرن کے سرمایہ داری کے مستبدانہ نظام کے بعد، خدا خدا کر کے یہ کیفیت پیدا ہوئی ہے کہ

زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

سرمایہ داری نظام کی قوتوں نے ہمیشہ مذہب[1] کو اپنا آلۂ کار بنایا ہے۔ وہ آج بھی یہی کر رہی ہیں۔ اس کے لئے ان کی طرف سے (اشتراکیت کی مخالفت کے لئے)

BELIEVERS IN GOD UNITE TOGETHER.

کا فریب انگیز نعرہ بلند کیا جاتا ہے۔ اگر ہم اس وقت (BELIEVERS IN GOD) کے اس نعرۂ فریب

---

[1] خدا کی طرف سے عطا شدہ دین کی مسخ شدہ صورت کا نام مذہب ہے۔

میں آگئے تو معلوم تاریخ میں اس قسم کا موڑ کب آئے۔ اس سلسلہ میں ہم نظامِ سرمایہ داری کے حمایتیوں سے تو کچھ کہنا بے کار سمجھتے ہیں، البتہ جو حضرات اپنے سینے میں "اسلام اور سوشلزم" کا درد رکھتے ہیں، ان سے ضرور عرض کریں گے کہ وہ اپنے مؤقف کی وضاحت صاف صاف کریں تاکہ معترضین کے لئے غلط پراپیگنڈے کی گنجائش نہ رہے اور ظاہر ہے کہ یہ مؤقف اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ :۔

(۱) اسلام ایک کلی نظامِ زندگی ہے جس کی بنیاد اس اصلِ عظیم پر ہے کہ اطاعت اور محکومیت صرف خدا کی ہو سکتی ہے جس کا عملی ذریعہ اس کی کتاب (قرآنِ کریم) کی اطاعت ہے۔

(۲) یہ اطاعت انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی۔ اجتماعی طور پر، معاشرہ کے اندر ہو سکتی ہے جس معاشرہ میں اطاعت کتاب اللہ کی ہو اسے اسلامی معاشرہ کہتے ہیں۔

(۳) اسلامی معاشرہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری معاشرہ کے سر ہوتی ہے۔ اور معاشرہ اپنی اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لئے ذرائع پیداوار کو اپنی اجتماعی تحویل میں لے سکتا ہے۔ ذرائع پیداوار کے متعلق قرآن کا دیا ہوا تصور یہی ہے کہ ان پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ وہ تمام افراد کے لئے سامانِ زیست مہیا کرنے کا ذریعہ ہیں۔

(۴) اسلام کے اس معاشی نظام کو "سوشلزم" نہیں کہنا چاہیئے۔ کیونکہ سوشلزم (SOCIALISM AS SUCH) صرف ایک معاشی نظام نہیں بلکہ ایک خاص فلسفۂ زندگی پر متفرع معاشی نظام ہے اور وہ فلسفۂ زندگی، اسلامی نظریۂ حیات کی نقیض ہے۔ اگر اسے "قرآنک سوشل آرڈر" کہہ لیا جائے تو اس میں سوشلزم کے فلسفۂ زندگی کا تصور نہیں آتا ــ قرآنی نظامِ ربوبیت اس کا صحیح مفہوم ادا کر سکتا ہے ــ یعنی ایسا معاشی نظام جو سوشلزم کے معاشی نظام کے تو مماثل ہے لیکن جو، سوشلزم کے نہیں، بلکہ قرآن کے اپنے فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔

(۵) جہاں تک "خدا کو ماننے" کا تعلق ہے، قرآن، جماعتِ مومنین کے علاوہ کسی کو بھی خدا پر ایمان رکھنے والا تسلیم نہیں کرتا۔ دوسروں کے متعلق اس کا اعلان یہ ہے کہ

فان امنوا بمثل ما امنتم بہ فقد اھتدوا (۲/۱۳۷)

اگر یہ لوگ (جو خدا پر ایمان رکھنے کے مدعی ہیں) اس طرح خدا پر ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو، تو پھر سمجھا جائے گا کہ یہ صحیح راستے پر ہیں۔

لہذا، جہاں تک اسلامی آئیڈیالوجی کا تعلق ہے، خدا پر ایمان رکھنے کے مدعی (یہود و نصاریٰ) اور منکرین خدا (کمیونسٹ) ایک سطح پر ہیں۔ لیکن جہاں تک معاشی نظام کا تعلق ہے، نظام سرمایہ داری اسلام کی ضد ہے اور اشتراکی نظام اس سے اقرب ہے۔

اسلام کے معاشی نظام کے مؤیدین کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے مؤقف کی وضاحت مذکورہ صدر انداز سے کریں تاکہ نظام سرمایہ داری کے حامیوں کے لئے، عوام کو لفظی گورکھ دھندوں میں الجھا کر فریب دہی کی گنجائش نہ رہے۔ اور وہ نظام سرمایہ داری کی حمایت کرنا چاہیں تو کھل کر سامنے آئیں۔ اس وقت ان کا انداز یہ ہے کہ وہ سوشلزم کی مخالفت میں اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ اس میں خدا۔ وحی۔ رسالت۔ آخرت کا انکار ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد اسلام کے متعلق فقط اتنا کہہ دیتے ہیں کہ اس میں تمام دنیا کی مشکلات کا حل موجود ہے۔ لیکن یہ کبھی نہیں بتاتے کہ اسلام کا وہ نظام کیا ہے جس میں (کم از کم) انسان کے معاشی مسئلہ کا حل موجود ہے۔ وہ جب اس قسم کا مبہم دعویٰ کریں تو ان سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ تفصیلاً بتائیں کہ وہ نظام کیا ہے جس کے متعلق وہ اس قدر بلند آہنگ دعوے کرتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ اس کا متعین جواب ان کی طرف سے کبھی نہیں ملے گا۔

یاد رکھیئے۔ انسانیت کی فلاح صرف قرآن کے اشتراکی نظام سے ہو سکتی ہے۔ اور وہ نظام اس کے نظام کلی کا ایک جزو ہے جو اس کی اپنی آئیڈیالوجی پر متفرع ہے ــــ

اگر بایں نرسیدی تمام بولہبی است

(اگست ۱۹۶۷ء)

نظامِ ربوبیت کب قائم ہوگا؟

(پرویز)

مجھ سے اکثر احباب پوچھتے رہتے ہیں (بالمشافہ بھی اور خطوط کے ذریعہ بھی) کہ نظامِ ربوبیت جس کا تصور میں ایک عرصہ سے پیش کر رہا ہوں، وہ بالآخر کب قائم ہوگا؟ مجھے ان احباب کی بیتابیٔ تمنا کا پورا پورا احساس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ معاشرہ کے حالات جس قدر خراب ہو چکے ہیں ان سے اس طبقہ پر کیا گذر رہی ہے جو پوری پوری محنت و مشقت اور سعی و کاوش کے باوجود، اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریاتِ زندگی پوری نہیں کر سکتے۔ ان کے حالات سنتا ہوں تو دل خون ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان کی ان مصیبتوں کا علاج ——— اتنا ہی نہیں بلکہ بے شمار خرابیوں کا علاج ——— قرآنی نظامِ ربوبیت کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ نظام انفرادی طور پر قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ ملک کے وسائل پیداوار، تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لئے ملت کی اجتماعی تحویل میں ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ انتظام، حکومت کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے میں پہلے دن سے، نہایت صراحت اور وضاحت سے پیش کئے چلا آ رہا ہوں۔ اور اس کے لئے میرا اوّلیں مخاطب، برسراقتدار طبقہ ہوتا ہے، کہ اگر بات ان کی سمجھ میں آ جائے اور وہ اس قرآنی مشن کو پورا کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں تو اس نظام کے قائم ہونے میں نہ دیر لگ سکتی ہے، نہ دقت پیش آ سکتی ہے۔ ہمارا دور آئینی ہے اور مملکت کے نظام میں ہر تبدیلی آئینی طور پر ہی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے دوسری صورت یہ ہے کہ اس تصور کو ملک میں اس قدر عام کیا جائے کہ یہ جمہور کا تقاضا بن جائے اور وہ ایسے افراد کو اپنا نمایندہ منتخب کر کے مجالس قوانین ساز میں بھیجیں جو اس نظامِ خداوندی کی صداقت پر

علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہوں اور اسے عملاً متشکل کرنے کا عزم لے کر ان مجالس میں جائیں۔ میں جو اس فکر کو، اپنی بساط کے مطابق عام کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تو اس سے یہی مقصد ہے۔

۲۔ بعض احباب یہ تجویز لے کر آتے ہیں کہ جو لوگ اس تصور سے متفق ہیں وہ ایک محدود شکل میں اپنے طور پر اس نظام کو قائم کیوں نہیں کر لیتے۔ ان کی تجویز کا ملخص یہ ہوتا ہے کہ یہ احباب ایک چھوٹی سی بستی بسا لیں جس میں اس تصور کو عملی شکل دے کر اپنی زندگی اس نہج پر بسر کریں۔

یہ تجویز نئی نہیں۔ یہ برسوں سے میرے سامنے لائی جا رہی ہے اور متعدد بار اس پر غور و خوض ہو چکا ہے۔ اور اسے ناقابلِ عمل پایا گیا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ جب آپ اس قسم کے انفرادی نظام کی آواز بلند کریں گے، اس پر لبیک کہنے والوں میں (زیادہ نہیں تو کم از کم) نوے فی صد (HAVE - NOTS) یعنی وہ لوگ ہوں گے جن کی آمدنی ان کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کفایت نہیں کرتی۔ اور (شاید) دس فی صد لوگ ایسے ہوں جو اپنی ضروریات پوری کر سکیں یا جن کے پاس ضروریات سے کچھ زائد ہو۔ میں احباب کو مایوس نہیں کرنا چاہتا لیکن میرا خیال ہے کہ میرا یہ اندازہ بھی کچھ خوش فہمی ہی پر مبنی ہے۔ جن کے پاس ضروریات سے زائد دولت ہو، وہ بہت کم ادھر آئیں گے۔ اب آپ سوچئے کہ جو نظام ان احباب پر مشتمل ہوگا جو اپنی کمائی سے اپنی ضروریات پوری کرنے کے قابل نہ ہوں، اور ایسے لوگ اس میں شامل نہ ہوں جن کے پاس ضرورت سے زیادہ ہو وہ چل کیسے سکے گا؟

اس کے بعد ایک بڑی دشواری اور سامنے آتی ہے۔ اس قسم کا نظام قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ (زائد از ضروریات دولت رکھنے والے حضرات) کے افراد خاندان ـــــ ان کے بیوی بچے اور دیگر متعلقین ـــــ سب اس فکر سے متفق اور اس رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ ان کے دلی تعاون کے بغیر یہ نظام ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔

اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک الگ جماعت قائم کرنا ـــــ چہ جائیکہ ایک الگ بستی بسانا ـــــ تو میری دعوت کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ اسی سے فرقہ بندی کی ابتدا ہوتی ہے۔

یہ ہیں وہ وجوہات جن کی بنا پر اس تجویز کو نہ اس سے پہلے کبھی قابلِ عمل سمجھا گیا۔ اور نہ ہی اب درخورِ اعتنا سمجھا جاتا ہے۔ نامساعد حالات کے ہاتھوں پس جانے والے احباب کی بیتابی، تمنا بجا اور درست۔ لیکن اس کا علاج پورے معاشرہ کے نظام میں تبدیلی کے سوا کچھ نہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر

عرض کیا ہے۔ ان مصیبت زدہ احباب کی داستانِ غم و الم سن کر جو کچھ میرے قلبِ حساس پر بیتی ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اس سے میرے سینے میں بھی جذبات کے کچھ کم تلاطم انگیز طوفان نہیں اٹھتے۔ لیکن میں شدّتِ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتا۔ نہ ہی کسی کو ایسا قدم اٹھانے کا مشورہ دے سکتا ہوں) جس کا نتیجہ مایوسی اور افسردگی کے سوا کچھ نہ ہو۔

۲ ــــ بعض حضرات یہ اعتراض بھی پیش کرتے ہیں کہ اس معاشی نظام کو قانون کے ذریعے نافذ کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ مسلمانوں کو ایک خاص قسم کا نظام قبول کرنے کے لئے مجبور کیا جائے گا۔ یہ کیسے درست ہو سکتا ہے؟

سوال یہ ہے کہ یہ نظام، اسلام کا تجویز کردہ ہے یا نہیں۔ اگر یہ اسلامی نظام نہیں تو اسے قانوناً نافذ کرنا تو ایک طرف، اگر مسلمان اسے بطیبِ خاطر بھی اپنے ہاں رائج کرنا چاہیں تو ان کا یہ اقدام سراسر غلط ہوگا اور ایک اسلامی حکومت کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اس کی روک تھام کرے۔

لیکن اگر یہ نظام، اسلام کے مطابق ہے۔ تو پھر اس کا قانوناً نافذ کرنا مسلمانوں پر جبر کرنے کے مرادف نہیں ہو سکتا۔ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے وہ بطیبِ خاطر اس کا اقرار کرتا ہے کہ وہ ہر اسلامی فیصلہ کو قبول اور اختیار کرے گا۔ مثلاً شراب (خمر) کا استعمال اسلام میں ممنوع ہے۔ اگر حکومت، اس کا استعمال از روئے قانون ناجائز قرار دیدے" تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ حکومت نے ان مسلمانوں پر جبر کیا ہے جو شراب نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر قرآنی فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تو اس کے لئے یہ راستہ کھلا ہے کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرلے۔

لہٰذا، قرآن کے معاشی نظام کا، قانون کی رُو سے نفاذ، مسلمانوں پر جبر نہیں کہلا سکتا۔ (ایسے ہی جیسے کسی کمیونسٹ پر کمیونزم کے معاشی نظام کا قانوناً نفاذ، جبر نہیں کہلا سکتا)۔ میری کوشش یہ ہے کہ مسلمانوں پر اس حقیقت کو واضح کر دیا جائے کہ نظامِ ربوبیت، قرآن کریم کا تجویز کردہ نظام ہے اور اس کا اپنے ہاں رائج کرنا عین اسلام کا تقاضا۔

۳ ــــ اس سلسلہ میں، میں اتنا اور عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میری دعوت صرف نظامِ ربوبیت کا قیام نہیں۔ یہ تو اس دعوت کا ایک گوشہ ہے۔ میری دعوت کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ

اسلام، جو خدا کے عطا کردہ دین کے بجائے، انسانی ذہنوں کا تراشیدہ مذہب بن کر رہ گیا ہے، اسے پھر سے اس کی اصلی اور حقیقی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے، اور اس طرح قرآن کی شمعِ آسمانی کو جس پر انسانوں کے خود ساختہ تصورات۔ نظریات۔ معتقدات اور رسوم و رواج کے دبیز پردے پڑ چکے ہیں، پھر سے وجہ تابانیٔ محفلِ انسانیت بنایا جائے۔ اگر دین اپنی حقیقی شکل میں مسلمانوں کے سامنے آجائے تو پھر نظامِ ربوبیت کا قیام اس کا فطری نتیجہ ہوگا۔ اس وقت اس کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے خود ساختہ "مذہب" کا وجود ہے۔ یہ ہے میری بنیادی دعوت اور یہ ہے میری تمام کوششوں کا منتہیٰ و مقصود۔ اس سے نہ صرف ہمارے نظامِ معیشت میں تبدیلی آئے گی بلکہ زندگی کا ہر گوشہ خوشگوار آسمانی انقلاب سے ہم آغوش ہوگا، جس سے پھر وہ انسانیت ساز فضا وجہ برومندیٔ دل و دماغ ہوگی جو ایک بار سرزمینِ حجاز میں، محمد رسول اللہ والذین معہٗ (رض) کے مقدس ہاتھوں آئینہ پوش ہوئی تھی اور جسے دوبارہ دیکھنے کیلئے انسانیت کی آنکھیں ترس رہی ہیں۔ بلّٰلہ الحمد کہ اس باب میں مجھے جو کامیابی ہوئی ہے وہ میری توقعات سے کہیں بڑھ کر ہے۔ میں جب اُس فضا پر نگاہ ڈالتا ہوں جس میں یہ آواز آج سے پچیس تیس برس پہلے بلند کی گئی تھی، پھر اپنی بے سروسامانی پر نظر ڈالتا ہوں، اور اس کے بعد یہ دیکھتا ہوں کہ آج کس طرح ملک کے گوشے گوشے تک یہ آواز پہنچ چکی ہے اور اس نے کس طرح فضا میں ایک خوشگوار ارتعاش اور امید افزا تحرک پیدا کر دیا ہے، تو میرا سرِ نیاز بارگاہِ ایزدی میں، مستانہ وار جھک جاتا ہے۔

(مارچ ۱۹۶۵ء۔ باضافہ ستمبر ۱۹۶۶ء)